پاکستانی
تاریخ کا قتل
پاکستان میں پڑھائی جانے والی درسی کتب کا تنقیدی جائزہ
خورشید کمال عزیز

پاکستانی تاریخ کا قتل

پاکستان میں پڑھائی جانے والی

درسی کتب کا تنقیدی جائزہ

خورشید کمال عزیز

مترجم: حمزہ ارشد

پاکستانی تاریخ کا قتل

پاکستان میں پڑھائی جانے والی
درسی کتب کا تنقیدی جائزہ

تحریر: خورشید کمال عزیز

مترجم: عمرو ارشد

پہلا ایڈیشن 2020

مجلد

ISBN:978-969-402-625-1

وین گارڈ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ

پلاٹ نمبر 52-53، مین گرومانگٹ روڈ، گلبرگ II، لاہور

Phone: (+92-42) 35754275-6

Email: sales@vanguardbooks.com

www.vanguardbooks.com

پرنٹر: ذوق پرنٹرز، شیخ عبدالقادر جیلانی روڈ، لوئر مال، لاہور

انتساب

اپنے مرحوم انکل حاکم جان کی سنہری یادوں کے نام

جو میرے والد کے بھائی سے زیادہ

میرے خاندان کے محسن تھے

جن کا دماغ نیکی کی روشنی سے منور تھا

اور جو حیرت انگیز حد تک متوازن سوچ رکھتے تھے

فہرست

پیش لفظ

زیرِنظر کتاب میں پاکستان بھر کے سکولوں اور کالجوں میں پہلی جماعت سے لے کر چودویں جماعت تک کے طلبہ کو معاشرتی علوم، مطالعہ پاکستان اور تاریخ کی پڑھائی جانے والی چھیاسٹھ درسی کتب کے مواد کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی غلطیوں، ان کی نوعیت اور ان کے نتائج وعواقب کی جانچ کی گئی ہے۔

درسی کتب کی اس جانچ کا آغاز اتفاقی حالات میں ہوا، جنہیں خوشگوار یا اطمینان بخش بہرحال قرار نہیں دیا جاسکتا۔ 90-1989، میں، میں نے پاکستانی مورخین پر ایک کتاب لکھی تھی۔ کتاب کا سب سے طویل باب، جو بیاسی صفحات پر مشتمل تھا، ملک کے مورخین کی تحریر کردہ کتب، اور اُن کی سکولوں اور کالجوں میں تدریس اور اس کے مضمرات کا جائزہ لیتا تھا۔ (یہ کتاب وین گارڈ نے "The Pakistani Historian" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ میں قارئین کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں تاکہ وہ جان سکیں کہ ملک کے مورخین ایسی کتابیں کیوں لکھتے ہیں)۔ پچیس مارچ 1990ء کو لاہور کے ایک پبلشر کو اس کا ٹائپ شدہ مواد فراہم کر کے میں کیمبرج چلا گیا، جہاں آٹھ ماہ درس وتدریس میں گزر گئے۔ پبلشر کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ سال ختم سے ہونے سے پہلے وہ کتاب مارکیٹ میں ہوگی۔ لیکن اُس نے مجھ سے دھوکا کیا، اور اُس کتاب کو اُس عرصے میں تو کجا، بعد میں بھی کبھی شائع نہ کیا۔ تاہم یہ ناقابل تلافی وعدہ خلافی اُس باب کی مرحلہ وار توسیع کا باعث بنتی گئی جس میں درسی کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ باب درسی کتب کے بھرپور جائزے کی موجودہ کاوش کی صورت سامنے آگیا۔ ٹوٹتی بکھرتی موہوم امیدیں بسا اوقات مثبت اور خوشگوار امکانات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں، بشرطیکہ انسان حوصلہ مند اور پُرعزم رہے، نیز اُس پر قسمت کی دیوی بھی مہربان ہو۔

میری مصروفیت نے مجھے کبھی اخبارات اور رسائل کے لیے لکھنے کا موقع نہیں دیا تھا، لیکن پبلشر کی پیشہ ورانہ غفلت نے مجھے پریشان کر دیا۔ چنانچہ جب ''فرنٹیر پوسٹ'' نے اس باب کو قسط وار شائع کرنے کی پیش کش کی تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ مواد موضوع کی دلچسپی اور علمی تحقیق کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے اُس وقت یقین تھا کہ ایسی کتابوں، جو سکول اور کالج کا ہر طالب علم پڑھتا ہے، کا جائزہ اُن کے والدین کے لیے بہت دلچسپ ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ ایک ملک، جہاں سنجیدہ موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کی فروخت عمومی طور پر بہت کم ہوتی ہے، وہاں ایک انگریزی روزنامے میں شائع شدہ کالموں کے ذریعے تعلیم یافتہ قارئین کی توجہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ درسی کتب کا جائزہ لینے والا باب فرنٹیر پوسٹ میں 17، 18، 19، 24، 25 اپریل اور پھر 1، 3، 5، 8، 9 مئی 1992ء کو شائع ہوا۔ اخبار نے مجھے غیر معمولی سہولت فراہم کرتے ہوئے کالموں کی اشاعت سے پہلے کئی دن تک اپنے صفحہ اول پر اس کی تشہیر کی۔ اس نوازش پر میں ریزیڈنٹ ایڈیٹر مسٹر خالد احمد کا مشکور ہوں۔

گیارہ مئی کو اخبار میں ایک پروفیسر، ایم آئی حق کا ایک خط شائع ہوا جس میں پروفیسر صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اُن بے شمار غلطیوں، غلط بیانیوں اور مغالطوں کو درست کر دوں جو میں نے بہت محنت سے مرتب کی ہیں کیونکہ درسی کتب کے مصنفین انہیں درست کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، اور مارشل لا کا بوجھ ہمارے ٹیکسٹ بک بورڈ ز اٹھاتے رہیں گے؛ اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک۔ اُس روز مسٹر خالد احمد نے مجھے فون پر بتایا کہ اُنہیں اپنے بے شمار قارئین کی فون کالز آئی ہیں کہ وہ اُن تاریخی غلطیوں، اساطیر اور مسخ شدہ حقائق کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں جن کی میں نشاندہی کرتا رہتا ہوں۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں درسی کتب کی غلطیوں کی اصلاح میں ایک مفصل نوٹ لکھوں۔

اس درخواست پر میں ایک مرتبہ تو بھونچکا رہ گیا۔ میں پہلے ہی ہر کتاب کی مختصر وضاحت کرتے ہوئے اس میں موجود تمام غلطیوں کی فہرست مرتب کر چکا تھا، گو میں نے اکا دکا غلطیوں پر تبصرہ کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ قارئین کی ایک بڑی اکثریت اپنی تاریخ سے واقف ہوگی۔ غلطیوں اور نشاندہی کرنے، اور یاد دلانے پر وہ اپنے مزاج کے مطابق یا تو درسی کتب کے مصنفین کی لاعلمی پر ہنسیں گے، یا فکر مند ہوں گے کہ اُن کے بچوں کو کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ لیکن یہاں ایک اہم قومی روزنامے کے مدیر

صاحب مجھے یاد دلا رہے تھے کہ بڑے شہروں میں رہنے اور انگریزی اخبارات پڑھنے والے افراد کو بھی علم نہیں کہ ان درسی کتب میں موجود غلطیوں کی حقیقت کیا ہے، چنانچہ اُنھیں بتانا پڑے گا۔

ذہن پر تھوڑا سا زور دینے سے ایک چشم کشا حقیقت آشکار ہوئی۔ تاریخی حقائق سے بے خبر تعلیم یافتہ والدین بھی تو انہی کتابوں کو پڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ جن کو قدرے مطالعہ کا شوق تھا، اُنھوں نے بھی تاریخ پر وہی کتابیں پڑھی ہوں گے جو درسی کتب لکھنے والے پروفیسرز نے اُسی مواد میں کچھ دیگر اِدھر اُدھر کی باتیں شامل کر کے ایک کتاب بنا دی تھی۔ اس مرحلے پر مجھے حقیقی معنوں میں ملک پر پھرنے والی بربادی کی لہر کا احساس ہوا۔ یہ میرے لیے ایک چشم کشا لمحہ تھا۔

مسٹر خالد احمد کی ہدایت کو ''دی فرائیڈے ٹائمز کے مدیر، ملک کے ایک ممتاز اشاعتی ادارے، وین گارڈ بکس کے مالک، میرے دوست مسٹر نجم سیٹھی کے صائب مشورے نے بھی تقویت پہنچائی۔

بدقسمتی سے جب مجھے یہ پیغامات وصول ہوئے، میں لاہور کی شدید گرمی، انفلوئنزا اور سات مئی کو ہونے والے ایک سنگین حادثے کے اثرات سے سہ مکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ لاہور کی گرمی کا میں عادی نہیں تھا؛ انفلوئنزا نے نڈھال کر رکھا تھا، اور حادثے نے زندگی بھر کے لیے میری قوتِ سماعت کو نقصان پہنچا دیا تھا۔ لیکن آپ اپنے ایڈیٹر سے بحث نہیں کر سکتے۔ یہ بات ایسے ہی نہیں کہی جاتی کہ صرف شاہی طبقہ اور ایڈیٹرز ہی واحد متکلم کے لیے ''ہم'' استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ بہر حال درخواست معقول تھی۔ مجھ پر قارئین کا قرض تھا کہ میں درسی کتب میں غلطیوں کی نشاندہی کے بعد اُنہیں اصل حقائق سے آگاہ بھی کروں۔ چنانچہ کسی جسمانی عارضے یا عذر کو خاطر میں لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے تصحیح کا طویل نوٹ لکھا اور آخر میں نتیجہ نکالتے ہوئے اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کیا۔ یہ مواد ''فرنٹیر پوسٹ'' میں پانچ قسطوں، بارہ، پندرہ، انیس، بیس اور اکیس جون کو شائع ہوا۔

اس دوران میں نے اس تنقیدی جائزے کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب میں نے مسٹر نجم سیٹھی سے اس کی اشاعت کی بات کی تو اُنھوں نے پہلا باب از سرِ نو تحریر کرنے کے لیے کچھ قابلِ قدر تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے پہلے باب کو بہتر بنایا۔ میں

نے ''فرنٹیر پوسٹ'' میں شائع ہونے والے مواد پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے تفصیل سے لکھا۔ اب یہ کتاب کا دوسرا باب ہے۔ اصل مواد (باب اوّل) پر نظر ثانی کرتے، اسے وسعت دیتے اور بہتر بناتے ہوئے، اور تصحیح نامہ (باب دوم) تحریر کرتے ہوئے میرے پاس اس موضوع پر وسیع تر پس منظر میں سوچ بچار کرنے کا موقع اور وقت تھا۔ باب سوئم اور چہارم اسی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ یہ اضافی مواد فرنٹیر پوسٹ میں شائع نہیں ہوا تھا۔

بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے، رہنے اور پڑھانے میں زندگی کا زیادہ تر حصہ گزارتے ہوئے میں نے معاشرے کی تعلیمی اور فکری ضروریات کو اس انداز میں دیکھنا سیکھا ہے جو روایتی پاکستانی ذہن کے لیے اجنبی ہے۔ چنانچہ اسے میری سادگی کہیے یا خوش فہمی کہ میں توقع کر رہا تھا کہ فرنٹیئر پوسٹ جیسے روزنامے میں شائع ہونے والا جائزہ مندرجہ ذیل نتائج کا حامل ہوگا:

پہلا یہ کہ عام قارئین درسی کتب کے گھٹیا معیار پر تیخ پا ہوں گے؛ جبکہ والدین غصے سے آگ بگولا ہو جائیں گے کہ اُن کے بچوں کو قومی تاریخ کے بارے میں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ میں مدیر کے نام خطوط میں طویل بحث کی توقع کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری جسارت پر تنقید بھی ہوگی؛ والدین کے درمیان تاویلات کا سلسلہ چل نکلے گا کہ درسی کتب کی پھیلائی گئی جہالت کے اس سیلاب کو کیسے کنٹرول کیا جائے؛ مصنفین کی طرف سے بھی اپنے دفاع میں احتجاجی مراسلہ آئے گا؛ ٹیکسٹ بک بورڈ کی جانب سے تیز و تند جواب کی صورت اپنے موقف کی وضاحت کی جائے گی؛ کسی ''محبِ وطن'' پاکستانی کا میری اس قوم دشمن جسارت پر خون کھول اُٹھے گا۔ لیکن عملی طور پر جو کچھ ہوا، وہ ایک ہلکی سی سرگوشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مدیر کے نام صرف چار خطوط آئے، جن میں سے صرف دو مضمون سے مطابقت رکھتے تھے۔ یہ تمام خطوط ضمیمے میں شائع کیے گئے ہیں تا کہ ایک اہم موضوع پر کل قومی ردِعمل کا ریکارڈ رکھا جا سکے۔

دوسرا یہ کہ اس تحقیق کا پاکستان کے ہر گھرانے پر ہونے والے ممکنہ اثر کا خیال کرتے ہوئے کچھ انگریزی اخباران مضامین کا اختصاریہ، اور اردو اخباران کا ترجمہ شائع کریں گے تا کہ زیادہ سے زیادہ والدین جان سکیں کہ اُن کے بچے کیا پڑھ رہے ہیں۔ اگر کوئی اخبار میری اجازت کے بغیر انہیں نقل کر کے شائع کر دیتا تو بھی مجھے اعتراض نہ ہوتا اور نہ ہی میں کسی سے معاوضے کا مطالبہ کرتا۔ لیکن ایسا

کچھ نہ ہوا۔ کسی نے میری تحریر کا نوٹس نہ لیا۔

تیسرا، میرا خیال تھا کہ کم از کم ایک یا دو اخبارات میرے اجاگر کیے گئے مسلے کو اپنے اداریے کا موضوع بنائیں گے، لیکن اس طرف سے بھی مکمل خاموشی رہی۔

قبل اس کے کہ مجھے خود پسند سمجھا جائے، یا میری مایوسی کو نظرانداز کیے جانے پر معمول کیا جائے، مجھے ایک بات واضح کرنے کی اجازت دیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا کام تحقیقی اوج کمال نہیں رکھتا۔ نہ ہی میں کوئی شاہکار تصنیف سامنے لایا ہوں جس پر میں داد و تحسین کا حقدار ہوں۔ لیکن نہایت عاجزی سے میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ میں نے:

(1) میں نے نہایت باریک بینی سے درسی کتب کا جائزہ لیا ہے۔

(2) تمام غلطیوں کی فہرست مرتب کی، ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کی تشریح کی۔

(3) فروگزاشت کے گئے اہم واقعات کی فہرست مرتب کی۔

(4) درسی کتب میں کی گئی غلطیوں کی تصحیح کی۔

(5) طلبا کو پڑھائی جانے والی غلط تاریخی جہت اور سمت کی نشاندہی کی۔

(6) ان کے طلبا پر اثرات کا جائزہ لیا، اور

(7) عوام پر مجموعی طور پر مسخ شدہ تاریخی تصورات کے مضمرات کا کھوج لگایا۔

میرا خیال ہے کہ میں یہ توقع کرنے میں حق بجانب تھا کہ تحقیق کم از کم تعلیم یافتہ طبقے کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی اور وہ دیکھیں گے کہ اس ملک کی حکومتیں، پروفیسرز اور دانشور انہیں نسل در نسل کیا پڑھاتے رہے ہیں۔ لیکن میری امید کا چراغ خوش فہمی کی آندھی کی نذر ہو گیا؛ میرے خدشات درست نکلے۔ مجھے پتہ چلا کہ میں ملک میں پڑھائی جانے والی درسی کتب کو تو جان گیا ہوں، لیکن اس ملک کو نہیں۔

اپریل میں مضامین کی اشاعت کے بعد اور یہ پیش لفظ لکھنے کے دوران یکے بعد دیگرے پیش آنے والے کئی ایک واقعات نے اس احساس کی شدت کو بڑھا دیا۔ انہیں یہاں زمانی ترتیب سے بیان کرتا ہوں:

1۔ اتفاق ہی کہیے کہ مضامین کی اشاعت اُس وقت ہوئی جب قومی اسمبلی اور پنجاب اسمبلی میں بجٹ کے اجلاس جاری تھے۔ اسلام آباد میں تعلیمی پالیسی دینے میں ناکامی پر حکومت سوالات کی زد

میں تھی ۔ لاہور میں پورا دن صوبائی محکمہ تعلیم کی کارکردگی پر بحث ہوئی اور وزیر تعلیم کو نااہلی اور لاعلمی پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن ان دونوں مقامات پر حکومت یا اپوزیشن کی طرف سے درسی کتب پر ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ اس پر مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستانی قانون ساز اخبارات نہیں پڑھتے ۔ اگر وہ پڑھتے ہوتے تو اخبارات میں شائع ہونے والے مواد کو اہمیت دیتے ۔

2۔ چھے جون کو لاہور میوزیم میں تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ایک ریٹائرڈ سفارت کار نے تاریخی اہمیت کے چند ایک مضامین عطیہ کیے ۔ وزیر اعلیٰ ، غلام حیدر وائیں نے حاضرین کو بتایا کہ ''تاریخ کے مختلف ادوار کا علم کسی قوم کی مستقبل کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ اپنے ماضی سے لاتعلق رہنے والی اقوام مستقبل میں مسائل سے دوچار ہو سکتی ہیں ۔ تاریخ کو فراموش کر دینے والی اقوام اپنی جغرافیائی سرحدیں محفوظ نہیں رکھ سکتیں ۔'' (دی نیشن ، لاہور ، سات جون 1992ء)۔ تاہم اُنھوں نے بھی درسی کتب کا کوئی حوالہ نہ دیا۔ یہ کتب اُن کی اپنی حکومت شائع اور تقسیم کر رہی تھی ۔ اس طرح پریس میں شائع ہونے والا مواد قانون سازوں کی طرح ایگزیکٹو کی توجہ حاصل کرنے میں بھی ناکام رہا۔

3۔ نو جون کو شائع ہونے والے ایک اہم مضمون میں دی نیشن نے تیز و تند زبان میں وزیر اعلیٰ کی کافی کھنچائی کی ۔ ''اپنے دعوے کو سند ، اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ہمارے حکمران منظم طریقے سے تاریخ مسخ کر رہے ہیں ۔ ہم تاریخی حقائق اور واقعات کو مسخ کرنے کی شعوری کوشش دیکھ رہے ہیں ۔ چنانچہ جب تک غالب سیاسی پراپیگنڈے کے تحت من پسند حقائق اجاگر کرنے کا سلسلہ موقوف نہیں کیا جاتا ، اور معروضی اور غیر جذباتی انداز میں حقائق کو پیش نہیں کیا جاتا ، درست اور واضح جواب دینا ناممکن ہے ۔ ہمیں سیاسی پراپیگنڈے کو تاریخ سے الگ کرنا سیکھنا ہوگا ۔ ضروری ہے کہ تاریخ کی درسی کتب لکھنے کی ذمہ داری سیاسی تشہیر کرنے والوں کی بجائے سنجیدہ محققین کو سونپی جائے ۔ معاشرے میں تحقیق اور پاور پالیٹیکس کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے ، انہیں آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے ۔''

اداریے میں میرے مضامین کا کوئی حوالہ شامل نہیں تھا ۔ ان مضامین کی اشاعت کا سلسلہ کچھ دیر پہلے شروع ہوا تھا ۔ تو کیا ہمارے مدیر اور اداریہ نویس بھی اپنے سوا کوئی اور اخبار نہیں پڑھتے ؟ یا پھر وہ ہم عصر پریس کا حوالہ دینا اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں ؟ اگر اُس اداریہ نویس نے میرے مضامین پڑھے ہوتے تو وہ اپنے موقف کی حمایت میں اُن سے ٹھوس حقائق اور مربوط دلائل کشید کر سکتے تھے ۔

4۔ چودہ اگست کو یوم آزادی پر فرنٹیر پوسٹ کے شائع کردہ ایڈیشن میں پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک مضمون ''قراردادِ پاکستان کی جوہری اساس'' تھا۔ اس کے پہلے پیراگراف میں فاضل مضمون نگار نے دعویٰ کیا کہ قرارداد تئیس مارچ کو منظور ہوئی۔ اختتامی پیراگراف میں بھی اسی تاریخ کا اعادہ تھا۔ مضمون میں قرارداد کے متن کو نمایاں انداز میں نقل کیا گیا تھا۔ صفحے کے درمیان میں شائع کیے جانے والے اس متن میں ایک غلطی البتہ واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں ''آزاد ریاستوں'' پر واوین نہیں لگائی گئی تھیں، جیسا کہ اصل متن میں ہے۔ مضامین میں، میں نے تاریخ، طباعت اور متن کی غلطیوں کو درست کرتے ہوئے اُن مصنفین پر تنقید کی تھی جنہوں نے اپنے مسودوں میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے مجھ پر ایک اور حقیقت آشکار ہوئی۔ قارئین تو ایک طرف، اخبارات میں باقاعدگی سے مضامین لکھنے والے بھی اخبار نہیں پڑھتے کہ اُن کے موضوع پر اخبار میں کیا شائع ہوتا ہے۔

5۔ اپریل سے لے کر اب تک بہت سے لوگ میری رہائش گاہ پر مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ کم و بیش سب نے یا تو حقیقی دلچسپی یا محض آدابِ گفتگو کے تحت پوچھا کہ میں آج کل کیا لکھ رہا ہوں۔ چونکہ میرے ذہن پر درسی کتب چھائی ہوئی تھیں، اس لیے میں نے اُنہیں اپنی کچھ تحقیقات سے آگاہ کیا۔ اُنہیں بتایا کہ جہاں مجھے ان پر کام کر کے ذہنی سکون حاصل ہوا ہے، مجھے قارئین کے رویے سے مایوسی بھی ہوئی کیونکہ ان میں دلچسپی تو کجا، اشتعال تک پیدا نہیں ہوا۔ اُن کے ردِعمل نے میرے لیے اپنے معاشرے کی تفہیم کے بہت سے راستے کھول دیے۔ کچھ مہمانوں نے تو واضح طور پر بوریت محسوس کرتے ہوئے موضوع تبدیل کر لیا؛ کچھ نے ہمدردی کے کچھ گھسے پٹے، جانے پہچانے اور روایتی الفاظ ادا کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ لیکن اُن کا لبِ لباب اور مجموعی تاثر یہی تھا کہ ''خود کو اتنی تکلیف کیوں دے رہے ہو؟ ایسی معمولی چیزوں کو دل پر نہ لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا؛ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ کیا آپ اپنی تحریروں کو سنجیدگی سے لیتے ہیں؟ وغیرہ۔'' تاہم حقیقی اور یادگار تبصرہ ایک تعلیم یافتہ جوڑے نے کیا۔ دو سکول جانے والے بچے بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا، ''پاکستان میں اور کون سی چیز ٹھیک چل رہی ہے جو ہم ان کم بخت کتابوں کی فکر کریں جو یہ پڑھ رہے ہیں؟''

پاکستان کا انگریزی پریس ان کتابوں پر کئی سالوں سے تنقید کر رہا ہے۔ میں نے اس موضوع پر گزشتہ تین سال کے دوران ڈان کے کئی اداریے دیکھے ہیں۔ انتیس اپریل 1989ء کو ''دی نیشن''

نے ان کتابوں کو ''انتہائی بے جان'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''وقت آ گیا ہے کہ ہماری کتابیں طلبہ کے ذہنوں میں یک طرفہ نظریات ٹھونسنے اور بیرونی دنیا کا منفی تاثر پیش کرنے کی بجائے کچھ علم فراہم کریں۔'' چھبیس مارچ 1992ء کو ''دی فرنٹیر پوسٹ'' نے شکایت کی کہ ''پاکستان کو آمروں اور غاصبوں کے ہاتھوں جن سانحات کا سامنا کرنا پڑا ہے، درسی کتب اُن کی نہ صرف پردہ داری کرتی ہیں، بلکہ اُنہیں انتہائی معذرت خواہانہ لہجے میں بیان کرتی ہیں۔'' اخبار نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ''عمرانی علوم پر ہماری درسی کتابوں کا مواد پڑھ کر ہماری نوجوان نسل ہرگز تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتی۔'' انیس سے پچیس مارچ 1992ء کے ''فرائیڈے ٹائمز'' میں ان کتابوں میں پائی جانے والی حماقتوں اور بے سروپا باتوں پر علینہ انعام کی تحقیقاتی رپورٹ پورے صفحے پر شائع ہوئی۔

یہ اداریے اور رپورٹس درسی کتب کا حلیہ بگاڑنے والے حلقوں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ مقتدرہ کی طرف سے کوئی آواز سننے میں نہ آئی۔ لیکن میں اس خوش فہمی کا شکار کیوں تھا کہ اس کتاب پر میری محنت توجہ حاصل کر لے گی؟

وہ افراد جن کی طرف سے توجہ کی حمایت ملنے کی توقع تھی وہ ایسے والدین تھے جن کے بچے ان درسی کتابوں کے زہریلے مواد کے متاثرین میں سے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی لاتعلق ہیں؛ یا آواز بلند کرنے کے قابل نہیں، حالانکہ اس کتاب کے مواد سے زیادہ کوئی چیز اُن کے لیے اہمیت کی حامل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اُن کا موقف ہے کہ اُنہیں کہیں زیادہ مسائل اور مشکلات کا سامنا ہے۔ غالباً وہ درست کہتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ میں کیا دلیل یا ثبوت سامنے لایا ہوں، میں اُنہیں برافروختہ، پریشان، مشتعل یا کبیدہ خاطر نہیں کرنے جا رہا۔

تاریخ کو حکومت اور کرائے دانشوروں سے بلند ہونا چاہیے۔ اُنہیں حقائق کو تبدیل کیے بغیر، شفاف، بلاچون وچراں، اصلی حالت میں، جیسے پتھر پر لکیر ہوتی ہے، مکمل اتھارٹی کے ساتھ، مقدس احکامات کی طرح غیر متبدل پیرائے میں بیان کرنا چاہیے۔ سلگتے ہوئے تاریخی تنازعات کی حدت شبنمی لہجہ کم کر سکتا ہے۔ مصنف قدرے مزاح کی چاشنی شامل کرتے ہوئے متوازن اور معروضی وضاحت کر سکتا ہے، تبدیل نہیں۔ وضاحت جذباتی ہونے کی بجائے منطقی اور معقول ہو، دلائل مضبوط ہوں؛ سوچ کے تراشیدہ پیکر میں یونانی یادگاروں کا سا تناسب، رومن ستونوں کی سی مضبوطی اور تاج محل کی سی

خوبصورتی ہو۔ مختلف تصورات کو معروضی اور غیر متعصبانہ انداز میں اس طرح پیش کیا جائے ان میں ذہانت کا جوہر اور انصاف کا ترازو متوازن دکھائی دے۔

لیکن جو کچھ عملی طور پر موجود ہے اور جو کچھ ہونا چاہیے، کے درمیان وسیع تفاوت موجود ہے۔ درسی کتب بچوں کو گمراہ کرتی ہیں؛ اسی طرح تحقیقاتی کام کے نام پر جو کچھ سامنے لایا جاتا ہے، وہ قوم کو بھٹکاتا ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا وقت آئے گا جب تمام حقائق سامنے آجائیں گے اور تاریخ رومانی خواہشات کی بجائے حقائق کا بیان بن جائے گا؟ اگلی چند ایک نسلوں کی زندگی میں تو ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

اگر میں معقولیت سے رہنمائی لوں تو اس کتاب کا قاری مجھ سے پوچھنے کا حق رکھتا ہے: اگر یہ باتیں اُس نے سوچنی ہیں تو آپ نے یہ کتاب کیوں لکھی ہے؟ مجھے اعتراف ہے کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں جواب دیتا ہوں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے، اُس سے آپ کی درسی کتب تبدیل نہیں ہوں گی، اور نہ ہی وہ نظام تعلیم بدلے گا جو ایسی کتابیں تخلیق کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے۔ پڑھنے والوں میں سے بھی بہت کم اسے یاد رکھیں گے۔ جمود کا شکار ہماری دنیا اُسی طرح رہے گی جیسی گزشتہ پینتالیس برس سے ہے۔ یہ لٹو گھومتا رہے گا، کیونکہ اس پر ضربیں لگتی ہیں؛ لیکن یہ کوئی فطری حرکت نہیں۔ جو کچھ میں نے لکھا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ کاوش صدا بصحرا ثابت ہوگی۔

لیکن میرا پبلشر مجھ سے زیادہ پر امید ہے۔ میں اُن کے عزم و حوصلے کو سراہتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اُن کی رجائیت پسندی درست ثابت ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ایسی امید نہیں رکھتا۔ دعا ہے کہ میں غلط ثابت ہوں۔ میں نے کتاب کیوں لکھی ہے؟ اس پر میرا جواب یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لیے لکھی ہے۔ (بعض اوقات مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمام کتابیں ایسی نسلوں کے لیے لکھی ہیں جنہیں میں کبھی نہیں مل سکوں گا)۔ سو سال بعد، جب مستقبل کا مورخ پاکستان کے بارے میں غور و فکر کرے گا کہ کیا چیز اس کے زوال کا باعث بنی تو ہوسکتا ہے کہ اُسے یہ کتاب مل جائے۔ یہ اُس کی اس طرح رہنمائی کرے گی جس طرح تاریک رات میں شمع کی لرزتی ہوئی روشنی راستہ دکھاتی ہے۔

میں کتاب لکھنے کے دوران مفید تجاویز ارزاں کرنے پر اپنی بیگم کا ممنون ہوں۔ اُنھوں نے

تمام تر سہولت فراہم کرتے ہوئے میرے مشکل کام کو آسان بنا دیا۔ پروف ریڈنگ بھی میری بیگم نے ہی کی ہے۔

میں یہاں ان معززین کی معاونت اور مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں: مسٹر رضی عابدی، مسٹر محمد اعظم، مسٹر مظفر احمد بھٹہ، مسٹر خالد احمد، اور مسٹر احمد سعید۔

مسٹر نجم سیٹھی نے اس کتاب کی تدوین اور اشاعت میں معمول سے بڑھ کر دلچسپی لی۔ میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔
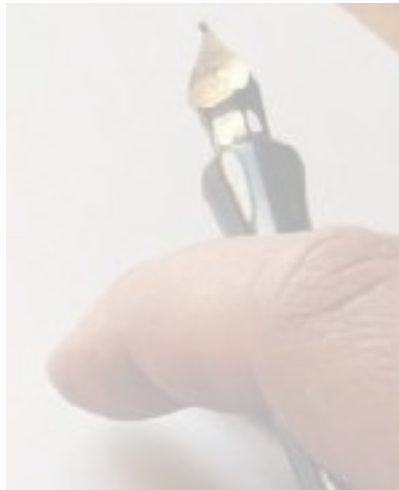
لاہور

دو فروری 1993ء

خورشید کمال عزیز

1

درسی کتب میں موجود اساطیری داستانیں

ہر ملک میں درسی کتب سکولوں اور کالجوں میں تعلیم و تدریس کے عمل میں بنیادی معاون کا کردار ادا کرتی ہیں۔ پاکستان میں درسی کتاب ہی ہر سطح پر تعلیم دینے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ یا لیکچرار پڑھانے یا لیکچر دینے کی زحمت کرنے کی بجائے درسی کتب کے مواد کو ہی دہراتے ہیں۔ طالب علم کو یہ مواد ازبر کرایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ نوجوان طالب علم کے لیے درسی کتاب ہی اس کی چھوٹی سی دنیا کی سب سے اہم کتاب ہوتی ہے۔ وہ اسے خریدنے پر مجبور ہوتا ہے؛ اسے ہر روز اپنے ساتھ کلاس میں لے جاتا ہے؛ جب استاد پڑھاتا ہے تو طالب علم کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھ لیتا ہے؛ اسے اس کتاب کے کچھ حصے طوطے کی طرح یاد کرائے جاتے ہیں؛ اور یاد کیے ہوئے مواد کو دہرانے کا معیار اُس کے تعلیمی درجے کا تعین کرتا ہے۔

کتاب کی حتمی بالا دستی اس کی سرکاری سرپرستی سے سند پاتی ہے۔ 1960ء کی دہائی کے اوائل کے بعد سے کلاس اوّل سے لے کر بارہویں تک کی تمام درسی کتب کی پلاننگ، تیاری اور اشاعت کی ذمہ داری ٹیکسٹ بک بورڈز کی ہے۔ ہر صوبے میں ایک ٹیکسٹ بک بورڈ ہے۔ صوبائی محکمہ تعلیم ان اداروں کو کنٹرول کرتا ہے، اور ان کا عملہ صوبائی تعلیمی نظام بھرتی کرتا ہے۔ عام طور پر مصنفین کی ایک ٹیم درسی کتاب تصنیف کرتی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور فرد، یا افراد کا گروپ اس کی تصحیح اور جانچ کرتا ہے۔ آخر میں ایک صاحب اس کی ایڈیٹنگ کرتے ہیں۔ پھر مسودہ وزارت تعلیم، حکومت پاکستان کی قومی جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کمیٹی اس کے معیار، اور اس کے ''نظریاتی'' مواد کا

جائزہ لیتی ہے۔ جب کتاب شائع ہو جاتی ہے تو صوبائی حکومت اسے صوبے کے تمام سکولوں کی متعلقہ کلاس کے لیے ''واحد درسی کتاب'' کہہ کر تجویز کرتی ہے۔ کتاب کی ہر کاپی پر (1) مصنفین، نگران اور ایڈیٹرز کے نام، (2) قومی جائزہ کمیٹی کا اجازت نامہ (3) اور سرکاری نوٹس کہ یہ تجویز کردہ واحد ٹیکسٹ بک ہے، لکھا ہوتا ہے۔ کچھ کتابوں میں بورڈ کے چیئرمین کی وارننگ بھی ہوتی ہے کہ طلبہ ہرگز کوئی ''اضافی مواد'' نہ خریدیں اور نہ ہی استعمال کریں۔

ان درسی کتب کا جائزہ لینا ضروری ہے، کیونکہ (1) یہ یونیورسٹی سے پہلے کے تعلیمی نظام، اور ایک حوالے سے یونیورسٹی کے نظام کی بنیاد رکھتی ہیں، (2) انہیں انتہائی توجہ اور احتیاط سے تیار کیا جاتا ہے، (3) ملک میں کالج اور یونیورسٹی کے سرکردہ اساتذہ انہیں تحریر کرتے ہیں، اور (4) یہ کتب ملک میں بارویں جماعت اور اس سے پہلے کی جماعتوں کے لاکھوں طلبہ کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ ہیں۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت نے تاریخ کو سکول مضامین سے نکال کر اس کی جگہ پہلی سے آٹھویں جماعت کے لیے ایک مضمون، ''معاشرتی علوم''، اور نویں سے بارویں تک کے لیے ''مطالعہ پاکستان'' تجویز کیا۔ یہ دونوں مضامین جغرافیہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، اسلامیات اور عالمی تعلقات کا مرقع ہیں۔

اگلے ابواب میں قاری کو درسی کتب میں پائی جانے والی غلطیوں، مبالغہ آرائیوں، مغالطوں، اور مسخ شدہ حقائق اور حقائق سے گریز کے بارے میں بتاؤں گا۔ ایک مخصوص باب میں درسی کتب کے طور پر استعمال کی جانے والی پرائیویٹ کمرشل کتب کا جائزہ لیا جائے گا۔ چونکہ ایسی کوئی لائبریری نہیں جس میں 1947ء سے اب تک شائع ہونے والی درسی کتب مل سکیں، اس لیے میرا جائزہ، چند استثنات کے علاوہ، گزشتہ بارہ سال کے دوران شائع ہونے والی درسی کتب اور موجوہ نصاب تک محدود ہے۔ میں قومی جائزہ کمیٹی کی طرف سے شائع ہونے والے بیانات کو دہرانے سے گریز کروں گا۔ سمجھا جائے گا کہ قاری کو وہ ازبر ہیں۔

پرائمری درجہ: اردو میڈیم

جماعت اوّل

جدید معاشرتی علوم، سینئر جنرل نالج اساتذہ کے بورڈ کی تحریر کردہ۔

ویسٹ پنجاب ٹیکسٹ بک ڈپو، لاہور

''سوال: پاکستان کس نے تخلیق کیا؟

جواب: قائدِ اعظم نے پاکستان تخلیق کیا۔

سوال: قائدِ اعظم کا اصل نام کیا ہے؟

جواب: قائدِ اعظم کا اصل نام محمد علی جناح ہے (صفحہ 3)''

پہلا سوال اور اس کا جواب طرزِ تعلیم اور تاریخی مواد پر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کیا پانچ سالہ طالبِ علم کو سکول میں پہلے ہی دن ایسے عامیانہ سوال کے ذریعے قومی تاریخ سے متعارف کرانے میں کوئی دانائی ہے؟ اُس کا علم محدود، تاریخی حقائق سے واقفیت نہ ہونے کے برابر، اور تصوارت کا جائزہ لینے کی صلاحیت معدوم ہوتی ہے۔ تو کیا ضروری ہے ایک نئی دنیا میں قدم رکھتے ہی اُس کی ان کمزوریوں کو دوچند کر دیا جائے۔ ان سولوں کا جواب یاد کرنے کے بعد اس کے علم یا معلومات میں کیا اضافہ ہو چکا ہوگا؟

موجودہ تعلیمی نظام میں طلبہ بیسیوں مرتبہ کسی سبق کو مل کر با آواز بلند دہراتے ہیں، اور اس شور میں اُنہیں کچھ یاد نہیں رہے گا کہ کس نے کیا تخلیق کیا تھا؟ اگر کسی طالب علم کی ذہانت یا تجسس غیر معمولی ہے تو ''کیا بنایا'' اور ''کس نے بنایا'' پڑھنے کے بعد اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ ''کیوں بنایا''۔ لیکن اس ''کیوں'' کا جواب اس کتاب میں نہیں۔ زیادہ معقول بات ہوتی اگر طالب علم کی عمر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے مندرجہ ذیل سوال و جواب سے آشنا کیا جاتا:

سوال: ہمارے ملک کا کیا نام ہے؟

جواب: ہمارے ملک کا نام پاکستان ہے۔

سوال:　اس نام کا کیا مطلب ہے؟

جواب:　اس کا مطلب ہے پاک لوگوں کی سرزمین۔

سوال:　یہ لفظ کس طرح وجود میں آیا؟

جواب:　'پ' پنجاب سے، 'ا' سرحدی صوبے سے (افغان صوبے)، 'ک' کشمیر سے، 'س' سندھ سے اور 'تان' بلوچستان سے لیا گیا ہے۔

سوال:　یہ لفظ کس نے ایجاد کیا؟

جواب:　یہ چوہدری رحمت علی نے ایجاد کیا۔

سوال:　پاکستان کس نے تخلیق کیا؟

جواب:　قائدِاعظم محمد علی جناح نے پاکستان تخلیق کیا۔

لیکن اس صورت میں رحمت علی کا نام کتاب میں محمد علی جناح سے پہلے آجائے گا، اور ملک کے نظریاتی علمبردار ترجیحی ترتیب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

تاریخی مواد کا مسئلہ استاد اور درسی کتب کے لکھاری، دونوں کی سمجھ سے ماورا ہے۔ مسئلہ یہ ہے: کیا اکیلے جناح نے پاکستان تخلیق کیا تھا؟ یہ سوال تاریخی اور فلسفیانہ نوعیت کی بحث چھیڑ دیتا ہے۔ قانونی اور آئینی طور پر برطانوی پارلیمنٹ نے جولائی 1947ء کو آزادئ ہند ایکٹ منظور کرتے ہوئے پاکستان تخلیق کیا تھا۔ سیاسی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت، اور مسلم لیگ، کانگرس اور برطانیہ کے درمیان ہونے والے سہ فریقی مذاکرات پاکستان کی تخلیق کا باعث بنے تھے۔ اخلاقی طور پاکستان کی تخلیق کی وجہ مسلمانانِ ہند کا وہ جذبہ تھا کہ اُن کے پاس ایک اپنا وطن ہو جہاں وہ ہندو کی مستقل اکثریت کے جبر کا نشانہ نہ بنیں۔ اور شاید یہ بھی کہنا پڑے گا کہ پاکستان ہندوں نے تخلیق کیا تھا، کیونکہ اگر وہ قدرے لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہٹ دھرمی پر قابو پا لیتے تو مسلم لیگ انڈیا کی تقسیم پر اصرار نہ کرتی۔ سردار پٹیل کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک دردِسر بن چکے ہیں اور اس مسلے سے نجات پا کر انڈیا سکون سے رہے گا۔ اس سوچ نے کانگرس کو متاثر کیا اور فیصلے کا ترازو تقسیم کی طرف جھکا دیا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جناح نے مئی 1946 کا کیبنٹ مشن پلان منظور کر لیا تھا۔ اور اسے

منظور کرنے کا مطلب پاکستان کا مطالبہ ترک کرنا تھا۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو علمی نوعیت کا ہے، لیکن یہ سوال پوچھنا بنتا ہے: اگر جناح 1945ء یا 1946ء میں فوت ہو جاتے تو کیا پھر بھی پاکستان وجود میں آ جاتا؟ یہاں دونوں امکانات پر دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ جناح مسلم لیگ کے ایک ایسے سپریم لیڈر تھے جن کا کوئی جانشین، متبادل، نائب اور معاون نہ تھا۔ اُن کی جگہ لینے والا کوئی شخص دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف کانگرس کی صفوں میں عوامی اور سیاسی معاملات کا قیمتی تجربہ رکھنے والے اعلیٰ معیار کے بہترین لیڈروں کی ایک طویل قطار موجود تھی۔ آپ آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے موازنہ کر لیں، فرق صاف سامنے آ جائے گا۔ اگر جناح خالق حقیقی سے جا ملتے تو لیگ کا ایک سیاسی جماعت کے طور پر تو جسم تو موجود رہتا لیکن یہ جماعت سر، دماغ، دل اور دیگر اہم اعضا سے محروم ہو جاتی۔ کیبنٹ مشن میں شرکت کرنے والے لیگی گروپ کو دیکھیں۔ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ بات کرنے کے لیے جناح کے ہمراہ جانے والے افراد پر غور کریں۔ نگران حکومت کے لیے لیگ کے نامزد کردہ افراد پر نظر ڈالیں۔ کیا وہاں کوئی ایک بھی ایسا تھا جو جناح کا پانچ منٹ کے لیے بھی متبادل بن کر بامعانی اور مربوط دلائل کے ساتھ گفتگو کر لیتا، یا کوئی دلیل دیتا یا مخالف موقف کو دلیل سے رد کرتا؟ لیاقت علی خان؟ سردار عبدالرب نشتر؟ راجہ غضنفر علی خان؟ یہ سب سیاسی طور پر پستہ قامت افراد تھے۔ قیادت کے اس خلا کی کیا وضاحت ہے؟ کیا جناح ان افراد میں سے کسی پر بھروسہ کرتے تھے؟ یا اُن کے نزدیک کوئی قابل اعتماد نہیں تھا؟ کس طرح یہ غیر معمولی اور پریشان کن صورتِ حال تحریک پاکستان کو متاثر کرتی؟ کیا یہ مسلم سیاست کا مخصوص افسوس ناک پہلو نہیں ہے؟ خاکسار تحریک کے پاس عنایت اللہ مشرقی کے علاوہ کون تھا؟ خدائی خدمتگار تحریک کا جینا مرنا، سب کچھ خان عبدالغفار خان کے ساتھ تھا۔ کیا تحریکِ پاکستان کے دور کی مسلم لیگ اور جناح ہم پلہ تھے؟ یہ سوال قابل بحث ہے، اور رہے گا۔

سکے کا دوسرا رخ بھی بہت واضح ہے۔ یہ دلیل اپنی جگہ پر وزن رکھتی ہے کہ 1945ء یا 1946ء میں پاکستان کا مطالبہ جوش و جذبے اور عزم کی اس نہج تک پہنچ چکا تھا کہ جناح کی وفات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ تحریک کی شدت اب کم نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج اتنی گہری اور وسیع ہو چکی تھی کہ اسے پُر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جناح ہوتے، یا نہ ہوتے، اب تقسیم سے کم پر

مسلمان کسی طور راضی نہ ہوتے۔

اس تفصیل میں جانے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ جماعت اوّل کے طالب علم کے ذہن میں کس طرح کا مشکل اور مبہم تاریخی مواد اتارا جا رہا ہے۔ ایک درسی کتاب طلبہ کی ذہنی صلاحیت سے ہم آہنگ ہونی چاہیے تاکہ وہ اسے پڑھنے سے ابہام اور الجھن کے سمندر میں غوطے نہ کھانے لگے۔ اتنی ناپختہ عمر کے طلبہ کو بغیر سوچے سمجھے ایسے سوال و جواب یاد کرنے کی عادت ڈالنا تاریخ کو ریاضی کا پہاڑا بنا دیتا ہے۔

معاشرتی علوم، شکیل برادرز، کراچی

''سوال: لیاقت علی خان کو قائدِ ملت کا خطاب کس نے دیا؟

جواب: لیاقت علی خان کو قائدِ ملت کا خطاب پاکستانی قوم نے دیا۔

سوال: شہیدِ ملت لیاقت علی خان کا مزار کہاں ہے؟

جواب: شہیدِ ملت لیاقت علی خان کا مزار کراچی میں ہے۔ (صفحہ 5)''

موئنجو داڑو پر سبق طلبہ کو نہیں بتاتا کہ یہ کہاں واقع ہے۔ (صفحہ 15)

دنیا میں پاکستان کے دوست بارہ مسلمان ممالک کے بعد تیرویں نمبر پر اسٹریلیا ہے۔ (صفحہ 20)

تاج محل پر سبق اشارۃً بھی نہیں بتاتا کہ یہ عمارت کس لیے ہے۔
(صفحہ 23)

حب الوطنی اور محمد علی جناح کی تکریم میں جماعت اوّل کی درسی کتاب میں اُن کا حوالہ درست، لیکن لیاقت علی خان کے کیس میں ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ مزید یہ کہ تعلیمی زندگی کے ابتدائی برسوں میں مرحوم وزرائے اعظم کی تعریف ذہن میں اتارنے کا کیا مقصد ہے؟ میں سر سید احمد خان اور سید امیر علی سے لے کر فضل حق اور راجہ آف محمود آباد تک پچاس ایسے رہنماؤں کے نام بتا سکتا ہوں کی جن کی مسلم قومیت کے لیے جدوجہد لیاقت علی خان سے کہیں بڑھ کر تھی۔

درحقیقت لیاقت علی خان کی نصاب میں موجودگی نامناسب انتخاب ہے۔ نامناسب ہی نہیں، افسوس ناک بھی، خاص طور پر جب ہم جناح اور لیاقت کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کی وضاحت درکار ہے۔ 1945ء میں لیاقت علی خان نے کانگرس پارٹی کے بھلا بھائی ڈیسائی سے ایک معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے مستقبل میں ملک کی آئین سازی میں مسلم لیگ کے ایک مخصوص طرزِ عمل کا وعدہ کیا۔ اُنھوں نے ڈیسائی کو یہ بتاتے ہوئے معاہدہ کیا تھا کہ جناح بیمار اور قریب المرگ ہیں، چنانچہ اگر کانگرس مسلمانوں کے ساتھ مسائل کا دیرپا اور عملی حل چاہتی ہے تو جناح کی بجائے اُن کے ساتھ معاہدہ کرے۔ یہ ایک خفیہ معاہدہ تھا۔ اس کے لیے جناح صاحب سے نہ مشورہ کیا گیا، اور نہ ہی اعتماد میں لیا گیا۔ جب محمد علی جناح نے اخبار میں لیاقت ڈیسائی معاہدہ پڑھا تو وہ بھونچکارہ گئے۔ اُنھوں نے اس حرکت کو لیاقت کی غداری سمجھا، اور اپنے سٹاف کو حکم دیا کہ اگر لیاقت اُن سے ملنے آئیں تو اُنہیں اندر نہ آنے دیا جائے۔ (یہ بات مجھے سید شریف الدین پیرزادہ نے بتائی تھی، جو اُس وقت بمبئی میں جناح صاحب کے اعزازی سیکرٹری کے طور پر کام کر رہے تھے)۔

1946ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے مسٹر جناح کی طرف سے لارڈ ویول کو بھجوائی گئی مسلم لیگ کے نامزد ارکان کی فہرست میں لیاقت کا نام شامل نہیں تھا۔ اس کی بجائے فہرست میں نواب محمد اسماعیل کا نام تھا۔ لیکن جب نواب اسماعیل نے ایک صحافی کے سامنے اپنی نامزدگی کا انکشاف کیا، اور وہ صحافی یہ کہانی لے کر جناح کے پاس پہنچ گیا، تو جناح نے نواب اسماعیل کی جگہ لیاقت علی خان کو نامزد کر دیا۔ (یہ معلومات مجھے مسٹر پیرزادہ نے دیں، اور بعد میں ان کی تصدیق کے ایچ خورشید نے میرے ساتھ ہونے والی ایک گفتگو میں کی)۔

جب جناح صاحب لیاقت علی خان کو ایک غدار سمجھتے تھے تو اُنھوں نے اُنہیں مسلم لیگ کی صفوں سے کیوں نہیں نکالا؟ اس سوال کا جواب مجھے شریف الدین پیرزادہ، خورشید، چوہدری محمد علی اور پروفیسر آئی ایچ قریشی نے دیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران 1945ء سے لے کر 1947ء تک کا دور بہت نازک تھا۔ اُس وقت لیگ کی صفوں میں اتحاد سب سے پہلی ترجیح تھی۔ 1945ء سے پہلے جناح نے سرِعام لیاقت علی خان کو اپنا ''دستِ راست'' قرار دیا تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی تھے اور کانگرس اور انگریزوں کے ساتھ ہونے والے تمام مذاکرات میں جناح کے ساتھ

تھے۔ انڈین دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ اس وقت مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت میں رخنے کی خبر بطور سیاسی جماعت اس کی ساکھ کے لیے تباہ کن ہوتی۔ چنانچہ لیاقت کو لیگ کے اہم لیڈر کے طور پر موجود رہنے اور کام کرنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن اُن کے اور جناح کے درمیان محبت باقی نہ رہی۔

مجھے سر محمد ظفر اللہ خان نے جولائی 1947ء کو بتایا کہ وہ جناح کا ایک پیغام لے کر نواب محمد خان آف بھوپال کے پاس گئے تھے کہ کیا وہ پاکستان آ کر اس کا وزیر اعظم بننا پسند کریں گے؟ نواب صاحب نے ذاتی وجوہات کی بنا پر پیش کش مسترد کر دی۔ حال ہی میں ایسی ہی خبر اردو پریس میں آئی ہے کہ جناح نے یہی پیش کش نواب آف بہاولپور کو بھی کی تھی، لیکن انھوں نے بھی حامی نہ بھری۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لیاقت علی خان پاکستان کے وزیر اعظم کسی خوبی کی بنا پر نہیں، متبادل نہ ہونے کی وجہ سے بنے تھے۔

بطور وزیر اعظم بھی لیاقت علی خان مسٹر جناح کا اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ مذکورہ بالا پس منظر کے ساتھ وہ اعتماد کیسے رکھ سکتے تھے؟ چوہدری محمد علی نے مجھ سے گفتگو کے دوران اشارۃً بتایا کہ دونوں رہنما (جناح اور لیاقت) عوامی سطح پر یا کسی اجلاس میں رسمی تبادلۂ خیال کے سوا آپس میں بول چال بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایم اے ایچ اصفہانی کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم خود فائلیں لے کر گورنر جنرل کے پاس جانے اور اُن پر گفت وشنید کرنے کی بجائے اپنے سیکرٹری کے ذریعے بھجوا دیتے تھے۔

مس فاطمہ جناح کی یادداشت (وفاقی وزارت تعلیم کے شائع شدہ ''جناح پیپرز'' میں ٹائپ شدہ آرکائیو ''مائی برادر'') بھی اُن کے کشیدہ تعلقات کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ جب لیاقت علی خان اور دیگر افراد جناح صاحب سے ملنے زیارت آئے تو محترم قائد نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اُن کے واپس جانے کے بعد جناح نے اُنہیں (مس فاطمہ کو) بتایا کہ وہ لوگ یہ دیکھنے آئے تھے کہ اُن کے فوت ہونے میں ابھی کتنی دیر ہے۔

سید شریف الدین پیرزادہ سمیت بہت سے افراد کو شک ہے کہ مسٹر جناح کی وفات انتہائی مشکوک حالات میں ہوئی، اور اُس وقت کے وزیر اعظم کا اُن حالات کے پیدا ہونے میں کسی قسم کا کردار خارج از امکان نہیں۔

اس طرح مستند روایات سے کافی ثبوت دستیاب ہیں کہ پہلا وزیراعظم ہونے کے باوجود لیاقت علی خان کو قومی ہیرو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ منصب پر اُن کا ریکارڈ بھی اس معروضے کو تقویت دیتا ہے۔ وہ قانون سازی کا عمل تیز کرنے میں ناکام رہے۔ جب وہ اقتدار میں چار سال گزار کر فوت ہوئے تو ملک بنیادی آئین بھی نہیں رکھتا تھا۔ اُنھوں نے دعوت نامہ ملنے کے باوجود سوویت یونین کا دورہ نہ کرنے کا فیصلہ جان بوجھ کر کیا۔ اس کی بجائے امریکہ چلے گئے، اور یوں پاکستان کو امریکی کیمپ میں دھکیل دیا۔ اس سے پاک امریکہ تعلقات کا ڈھوان دار سفر شروع ہوا جس میں پہلے دوستی، پھر ذیلی شراکت دار، پھر لقمہ خوار، تابعدار، قرض خوار اور پھر کا مدار کے توہین آمیز مراحل طے ہوتے چلے گئے۔ لیاقت علی خان نے مخصوص افسران کا قد کاٹھ بڑھا کر سیاسی عہدوں پر فائز کیا، اور سیاسی ساتھیوں کی بجائے اُن سے مشاورت کو ترجیح دی۔ مسلم لیگ کو گراس روٹ سطح تک منظم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ نااہل اور غیر فعال سیاست دانوں کو چن چن کر مرکز اور صوبوں میں بٹھا دیا۔ اس دوران مشرقی پاکستان کے شکایات اور خدشات پر کان دھرنے، اور اُن کا مداوا کرنے کی کوشش کی نہ گئی۔ اس کی بجائے اُنھوں نے خودسر، بے حس اور خودغرض پنجابی اور اردو بولنے والے افسروں کو مشرقی پاکستان میں تعینات کیا، اور یوں بنگلہ دیش کی پہلی اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دی۔ دستور ساز اسمبلی میں خالی ہونے والے عہدوں پر ارکان کو نامزد کرنے کی رسم کا آغاز کیا (دستور ساز اسمبلی قومی اسمبلی کے طور پر بھی کام کر رہی تھی)۔ مزید ستم یہ ڈھایا کہ ارکان پارلیمنٹ کو گورنر اور سفارت کار لگانا شروع کر دیا، جبکہ وہ اس دوران اسمبلی کی رکنیت بھی رکھتے تھے۔

یقیناً نوجوان طلبہ کو یہ سب کچھ تو نہیں بتایا جا سکتا، کیونکہ وہ ان معاملات کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ لیکن معلومات بعد میں اُن تک پہنچنی چاہئیں۔ گیارویں یا بارویں کلاس میں کسی حد تک، اور بھرپور مواد کے ساتھ بی اے میں۔ لیکن جب دس سال تک طلبہ کی ذہنی آبیاری غلط حقائق پر کی جائے گی تو پھر وہ سینئر کلاسز میں حقیقت کو قبول نہیں کریں گے۔ بہرحال جماعت اوّل کے طلبہ کے سامنے ایک متنازع شخصیت کو قومی ہیرو بنا کر پیش کرنا، اور اُنہیں قائدِاعظم کا نائب قرار دینا قومی ہیروز کی ہتک اور تاریخی حقائق سے انکار ہے۔

جماعت دوم

جدید معاشرتی علوم

جدید معاشرتی علوم، سینئر جنرل نالج اساتذہ کے بورڈ کی تحریر کردہ۔

ویسٹ پنجاب ٹیکسٹ بک ڈپو، لاہور

سوال: پاکستان کب بنا؟

جواب: پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا۔ (صفحہ 3)

سوال: جناح صاحب کے ذہن میں پاکستان بنانے کا خیال کیسے آیا؟

جواب: ہندوستان کے لوگ انگریزوں سے آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پنڈت نہرو کا کہنا تھا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ قائداعظم نے کہا کہ مسلمان بھی یہاں رہتے ہیں، اور اُنھیں ایک الگ حکومت چاہیے۔ (صفحہ 4)''

ان تمام نکات کے لیے باب دوم کا مطالعہ کیجیے۔

ایک پورا صفحہ (5) مس فاطمہ جناح پر جبکہ ایک، صفحہ (6) اقبال پر ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اقبال نے جناح کے ساتھ مل کر قیامِ پاکستان کے لیے بہت جدوجہد کی۔ صفحہ (4) اقبال کی تعلیمی زندگی کے بارے میں بصیرت افروز اطلاع ہے کہ اُنھوں نے قانون کی تعلیم انگلستان سے حاصل کی تھی۔

باقی کتاب مسلمان بچوں، پھلوں، سبزیوں، ہماری خوراک، جانور، ذرائع آمدورفت، ملبوسات، پہاڑوں اور دریاؤں، اور اچھی عادات کے بارے میں ہے۔

معاشرتی علوم، تحریر کردہ ایم ایچ قادری

شکیل برادرز، کراچی

''قائداعظم نے اعلیٰ تعلیم انگلستان سے حاصل کی۔ پاک فوج اُن کے مزار کی دن رات حفاظت کرتی ہے۔'' (صفحہ 15)

باب دوم میں اس کی تصحیح کی گئی ہے۔

''لیاقت علی کی خدمات کے صلے میں قوم نے اُنھیں قائدِ ملت، اور شہیدِ ملت کا'' خطاب'' دیا۔'' (خطاب واحد ہے) (صفحہ 17)

اس نکتے کی گزشتہ صفحات میں بھرپور وضاحت کی جاچکی ہے۔

''اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے، اس کے بعد اُنھوں نے جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا''۔ (صفحہ 18)

اقبال کے بارے میں دونوں بیانات پر باب دوم میں وضاحت موجود ہے۔

جماعت سوم

معاشرتی علوم: ضلع لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بورڈ، لاہور۔ پانچواں ایڈیشن، مارچ 1986، مصنفین: پروفیسر ڈاکٹر مس مریم کے الہی، ڈاکٹر مس فیروزہ یاسمین، صاحبزادہ عبدالرسول، مسز نزہت منصور، مقبول انور داؤدی، علی شبیر کاظمی اور بشیر الدین ملک۔ ایڈیٹر: بشیر الدین ملک۔ نگران: حفظہ جاوید، سبط الحسن اور شاہنواز۔ تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ ضلع لاہور کے سکولوں کے لیے واحد مجوزہ کتاب۔ تعداد اشاعت: 80,000 کاپیاں۔

''راجہ جے پال نے محمود غزنوی کے ملک میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اس پر محمود غزنوی نے راجہ جے پال کو شکست دی، لاہور پر قبضہ کیا اور اسلامی حکومت قائم کر دی''۔ (صفحہ 8)

کیا یہ وضاحت محمود غزنوی کے ہندوستان پر متعدد حملوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو لوٹنے کا بھی تسلی بخش جواز سمجھا جائے؟ محمود غزنوی کے دور میں پنجاب میں اسلامی ریاست نہیں تھی۔

مسیح علیہ اسلام پر دو صفحات یہ نہیں بتاتے کہ اُنھوں نے مسیحیت کی بنیاد رکھی تھی۔ (صفحات 70-71)

آخری سبق ''ہمارے ضلع کی اہم شخصیات'' ہے۔ اس میں شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کی تعریف کی گئی ہے۔ اس طرح بچوں کو ابتدا سے ہی مزار پرستی کا درس دیا گیا ہے۔ (صفحات 75-76)

کتاب کے اکیس ابواب میں سے ایک ضلع لاہور کی تاریخ پر ہے، پندرہ جغرافیہ، معاشیات اور انتظامیہ پر، جبکہ آدمؑ، ابراہیمؑ، مسیح علیہم السلام، اور پیغمبر اسلام ﷺ اور سید علی ہجویری پر پانچ ابواب ہیں۔ اس طرح داتا گنج بخش کو پیغمبروں کے ابواب میں جگہ دی گئی ہے۔ ممکن ایک بڑی تعداد میں مسلمان طلبہ ماننا شروع کر دیں کہ وہ ایک پیغمبر ہی تھے، اور یہ اسلامی معلومات اُن کے عقیدے کا حصے بن جائیں۔

معاشرتی علوم این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ مصنفین: پروفیسر علاؤالدین خلجی، کالج آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف پشاور (شعبہ تاریخ) اور ولی محمد، لیکچرار اسلامیہ کالج پشاور (شعبہ جغرافیہ)۔ نظرثانی اور جانچ: ڈاکٹر ممتاز مینگا لورائی اور محمد حلیم، بورڈ کے ماہرین مضامین۔ تعداد اشاعت: 10,000 کاپیاں۔

''جب قائدِاعظم نے اسلامی ملک کی آزادی حاصل کرنے کی مہم شروع کی تو صوبہ سرحد کے لوگ اُن کے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئے۔'' (صفحہ 5)۔ اس میں سرخ قمیض تحریک کا کوئی ذکر نہیں جو اگست 1947ء تک اس صوبے میں اقتدار میں تھی۔

سبق نمبر 16، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہے، (صفحات 51-50) یہ نہیں بتاتا کہ اُنھوں نے یہودی مذہب کی بنیاد رکھی تھی۔ نہ ہی سبق نمبر 17، جو حضرت مسیح علیہ السلام پر ہے، (صفحات 53-52) بتاتا ہے کہ اُنھوں نے مسیحیت کی بنیاد رکھی۔

آخری سبق سردار عبدالرب نشتر پر ہے، اور سردار صاحب بھی خوش قسمت نکلے کہ وہ آدم، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور حضرتِ محمد ﷺ جیسے انبیا کے باب میں جگہ پانے میں کامیاب رہے (صفحہ 56)۔

تو یوں کہیے کہ اگر لاہور کے طلبہ نے علی ہجویری کو انبیا علیہ السلام کے باب میں پایا تو پشاور کے لیے طلبہ کو مزید کٹھن مشکل کا سامنا ہے۔ یہاں سردار عبدالرب نشتر اسی مقدس فہرست میں پائے گئے ہیں۔ چھپن میں سے صرف دو صفحات ہی ایسے ہیں جنہیں تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

معاشرتی علوم: کراچی، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو، ستمبر 1989۔ مصنفین: فدا حسین کھوکھر اور ایم ایف حامد۔ نظر ثانی: علاؤالدین خالد، مشیر: عبدالماجد عباسی۔ تعداد اشاعت: 10,000

''ہمارا وطن سرسبز و شاداب ہے۔'' (صفحہ 5)

کیا ملک کی تاریخ پر کتاب کے لیے کہنے کو یہی کچھ ہے؟

کتاب کی عظیم شخصیت حاجی عبداللہ ہارون ہیں جنہیں آدمؑ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور مسیح علیہم السلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ (صفحات 7-75)

کلاس چہارم

معاشرتی علوم، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ مصنفین: مطاہر ہاشمی، جہانزیب کالج، سیدو شریف، سوات؛ ولی محمد اسلامیہ کالج پشاور؛ محمد یعقوب، اسلامیہ کالج پشاور؛ پروفیسر محمد رضا خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان؛ غلام حسن بلوچ، ڈی آئی ایس (یہ کس کا مخفف ہے؟)، ڈیرہ اسماعیل خان، اور زبیر مینگا لورائی، ریسرچ آفیسر، ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور، نظر ثانی، ڈاکٹر ممتاز مینگا لورائی اور محمد حلیم۔ تعداد اشاعت: 65,000 کاپیاں۔

''مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا (جب اُن کی صوبے پر حکومت تھی)۔ اس کے باوجود غیر مسلموں کے دل میں مسلمانوں کے لیے نفرت پروان چڑھ رہی تھی۔ جب انگریز فورسز نے علاقے پر حملہ کیا، غیر مسلموں نے مسلمانوں کے خلاف اُن کا ساتھ دیا۔ چنانچہ انگریزوں نے تمام ملک فتح کر لیا۔'' صفحہ 16۔

1881ء کی مردم شماری کے مطابق این ڈبلیو ایف پی میں ہر 10,000 افراد میں سے 9184 مسلمان تھے۔ جب چند سال پہلے انگریزوں نے علاقہ فتح کیا تو مسلمانوں کا آبادی میں تناسب اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ چنانچہ برطانوی دور میں غیر مسلموں کی تعداد آبادی میں گویا آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ پٹھان بھی معنوی اعتبار سے ترکوں کی طرح مسلمان ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں غیر مسلم ہندو اور سکھ مہاجرین تھے جو کاروبار کرتے تھے۔ وہ جنگجو ہرگز نہیں تھے۔ کیا ان دھان پان

دکان داروں نے انگریز کے ساتھ مل کر اتنی دلیری سے جنگ کی کہ غیر ملکی افواج فتح مند ہوئیں؟ اللہ اکبر! کوئی واقعاتی شہادت؟ کسی نے تو ہندو اور سکھ کاروباری افراد کو دادِ شجاعت دیتے دیکھا ہوگا؟ کہنا پڑے گا کہ مقامی غیر مسلموں کے خلاف یہ الزام لگاتے ہوئے پٹھانوں کی شکست پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر غیر مسلموں کی سازش اور غداری نہ ہوتی تو جنگ آزما پٹھانوں کو شکست ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک ناقابل قبول بہانہ اور مسخ شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ انگریزوں نے نہ صرف پٹھانوں کو شکست دی بلکہ قبائلی علاقوں کے عمائدین کی وفاداری بھی حاصل کی۔ وہ انگریز سرکار سے رقم لے کر افغان سرحد کے قریبی علاقوں کی نگرانی کرتے اور امن وامان قائم رکھتے۔

''آزادی کے بعد ہندو حکومتِ ہند کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔ انگریز ہندوؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس فیصلے کو قبول نہ کیا۔ علامہ اقبال اور قائدِ اعظم نے کہا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں مسلم حکومت قائم کی جائے۔ تیئس مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے لاہور میں ایک بڑے جلسے میں قرار دادِ پاکستان منظور کی گئی۔ 1946ء میں جب این ڈبلیو ایف پی کے لوگوں سے رائے پوچھی تو سب نے پاکستان میں شامل ہونے کے لیے ووٹ دیا۔'' (صفحہ 17)

یہ کہنا کہ انگریزوں نے ہندوؤں کی طرف داری کی، نیم سچائی ہے۔ صرف اقبال اور جناح ہی نے مسلم ریاست کی بات نہیں کی تھی، اور نہ ہی زمانی اعتبار سے وہ اولین افراد تھے جنھوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اقبال نے علیحدہ ریاست کا مطالبہ 1930ء میں کیا، جبکہ جناح نے 1940ء میں۔ لیکن اس سے بہت پہلے درجنوں دیگر افراد تقسیمِ ہند کو مسئلے کا حل قرار دے چکے تھے۔ قرار دادِ لاہور 23 مارچ کو نہیں، 24 مارچ کو منظور ہوئی تھی۔ اور یہ مسلم لیگ کا کوئی بہت بڑا جلسہ نہیں، اس کا سالانہ اجلاس تھا۔ 1946ء میں این ڈبلیو ایف پی کے تمام لوگوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا۔ مزید تفصیل باب دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

اس درسی کتاب کے بانوے میں سے صرف دو صفحات (16,17) تاریخ پر ہیں۔ آخری 9 اسباق میں پیغمبرِ اسلام ﷺ، خلفائے راشدین، سید احمد بریلوی، حضرت پیر بابا، ملک خدا بخش اور مسٹر جناح کا ذکر ہے۔ مسٹر جناح کے حوالے سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے انگلینڈ سے قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ 1906ء میں کانگرس کے سیاسی کارکن بن گئے، اور پھر 1934ء میں

واپس انگلینڈ چلے گئے (کتاب نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی ان تین عشروں میں قائدِ اعظم نے کیا کیا؟)۔ایک مرتبہ پھر دہرایا گیا کہ قراردادِ پاکستان تیئس مارچ کو مسلم لیگ کے لاہور کے جلسے میں منظور ہوئی۔(صفحات 91-90)

مسٹر جناح نے انگلینڈ سے قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔درحقیقت اُنھوں نے کسی بھی ملک سے کسی بھی مضمون میں کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔قراردادِ لاہور تیئس کو نہیں، چوبیس مارچ کو منظور ہوئی تھی،لیکن میں ان نکات کی باب دوم میں وضاحت کروں گا۔

معاشرتی علوم: ضلع لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بورڈ، لاہور۔ دوسرا ایڈیشن، اپریل 1989،
مصنفین: ڈاکٹر مس فیروزہ یاسمین، قاضی سجاد احمد، بشیرالدین ملک۔ ایڈیٹر: بشیرالدین ملک اور مسز فیروزہ یاسمین۔ نگران: حفظہ جاوید، سبط الحسن اور شاہنواز۔

سبق نمبر 12، صفحات 74-67، تاریخ بیان کرتا ہے۔ یہ محمد بن قاسم کے حملے سے شروع ہوتا ہے۔اس میں ہندو مذہب تنقید کی گئی ہے۔مسلمانوں کے حملے کو''آمد'' قرار دیا گیا ہے، جبکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار زبردستی چھینا تھا۔ جناح نے تیئس مارچ 1940ء کو لاہور میں ایک جلسہ کیا اور مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی کہ اُنہیں ایک الگ وطن کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے، اور قائد کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔آخر میں 1965ء کی جنگ کا ذکر ہے۔کتاب بتاتی ہے کہ ''آخرکار پاک فوج اور پاکستانیوں سے ڈر کر بھارت نے امن کی بھیک مانگی۔''

تیئس مارچ کی تاریخ غلط ہے۔1965ء کی جنگ کا حوالہ بے بنیاد ہے۔باب نمبر دوم میں وضاحت ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب کے آخری آٹھ ابواب پیغمبر اسلام ﷺ، خلفائے راشدینؓ، محمد علی جناح، اقبال اور میجر عزیز بھٹی پر ہیں۔علامہ اقبال کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے تھے۔ جرمنی کا کوئی ذکر نہیں۔

معاشرتی علوم، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو، دوسرا ایڈیشن، اپریل 1989۔ مصنفین: عبدالمجید عباسی، ایم اے پی ٹی، ایم ایڈ، مرزا اسحاق بیگ، ایم اے، ایم ایڈ، ایل ایل بی، اور سید تلمیذ حسنین رضوی، ایم اے، بی ایڈ (گولڈ میڈلسٹ)۔ چیف ایڈیٹر: عبدالمجید عباسی۔ تعداد اشاعت: 25,000 کاپیاں۔

''برطانوی تسلط کے دوران جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے مل کر ایک سیاسی جماعت، آل انڈیا مسلم لیگ بنائی۔ اس پارٹی کے قیام کا مقصد انگریز سے آزادی حاصل کرنا، اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک، پاکستان تخلیق کرنا تھا۔'' (صفحہ 1)

مسلم لیگ کے قیام کے بارے میں یہ مسخ شدہ تصور پیش کرنا ہماری روایت بن چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے 1906ء میں انگریزوں سے آزادی، اور حصول پاکستان کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ درحقیقت اس نے 1906ء میں برطانوی حکومت سے وفاداری کا وعدہ کیا تھا تاکہ یہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ، اور غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ روابط استوار کر سکے۔

''قراردادِ پاکستان تیئس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی۔'' (صفحہ 2)

جیسے ہی ہندوستان کی تقسیم ہوئی، ''بہت سے مسلمان ہندو اکثریتی علاقوں سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنا شروع ہو گئے۔'' (صفحہ 2)

ہندو اکثریتی علاقوں سے ''بہت سے مسلمانوں'' نے پاکستان کی طرف ہجرت نہیں کی تھی۔ بہت کم دہلی، یوپی اور بہار سے آئے تھے۔ بمبئی اور سی پی سے آنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ جنوبی ہندوستان سے تو چند سو خاندان آئے تھے۔ اگر انڈیا سے ''بہت سے مسلمان'' پاکستان کی طرف ہجرت کر جاتے تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی پاکستان سے بھی زیادہ نہ ہوتی۔

ریڈیو پاکستان کے باب میں طلبہ کو یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ ایک سرکاری ادارہ ہے۔ (صفحہ 48-49)۔ باب نمبر 12 (صفحات 62-67) صوبہ سندھ کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس میں نسلی سوال زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔

جناح صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے، اور چار سال بعد قانون کا امتحان پاس کیا۔ (صفحہ 77)۔

وہ بیرسٹر بنے تھے۔باب دوم میں وضاحت دیکھیے۔

''قراردادِ پاکستان تیئس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی۔''(صفحہ 77)

جہاں تک قراردادِ پاکستان کی تاریخ کا تعلق ہے تو قاری زیرِنظر کتاب کے باب نمبر دو میں حقیقت جان لے گا۔کتاب میں سندھ کی جن شخصیات کا ذکر ہے، وہ سر غلام حسین ہدایت اللہ، عبداللہ ہارون اور حیدر بخش جتوئی ہیں۔(صفحات 80-78)

ثانوی درجہ: اردو میڈیم

جماعت پنجم

معاشرتی علوم، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ مصنفین: عبدالرؤف فاروقی، گورنمنٹ جہانزیب کالج، سیدو شریف؛ محمد علی شاہ، پرنسپل، ٹریننگ سکول، ڈیرہ اسمٰعیل خان؛ محمد احمد طارق، گورنمنٹ کالج مردان؛ دلاسہ خان مروت، پرنسپل جامی ہائی سکول، بنوں؛ اور صوفی غلام محمد، ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ ہائی سکول، اکبر پورہ۔ ایڈیٹر: ڈاکٹر ممتاز مینگالورائی، سینئر ماہرِ مضمون، ٹیکسٹ بک بورڈ۔ نظرِثانی: محمد حلیم، ماہرِ مضمون، ٹیکسٹ بک بورڈ۔ تعدادِ اشاعت: 55,000 کاپیاں۔

کتاب کے شروع میں تاریخ پر گیارہ صفحات ہیں۔اس کے چار عنوان ہیں: ہندو مسلم تہذیبوں میں فرق؛ ایک آزاد ریاست کی تخلیق کی ضرورت؛ نظریۂ پاکستان؛ اور انڈیا کے پاکستان کے خلاف مذموم عزائم۔سر سید احمد خان پر تین چوتھائی صفحے کا ایک مضمون ہے، جس پر کوئی تاریخ رقم نہیں، لیکن سر سید کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اُنھوں نے ''مسلمانوں پر زور دیا تھا کہ وہ ایک الگ قوم کے طور پر خود کو منظم کریں۔''(صفحہ 7)۔اقبال وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے جنہوں نے 1930ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔اُن کی تجویز یہ تھی کہ ''مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست تخلیق کی جائے۔''(صفحہ 7)۔1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کو صرف چار سطروں میں نمٹا دیا گیا ہے؛ اور ان میں بھی انتہائی مسخ شدہ حقائق بیان کیے گئے ہیں۔کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ''انڈیا نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مشرقی پاکستان میں شورش برپا کرائی اور پھر چاروں طرف سے اس پر حملہ

کر دیا۔ اس طرح پاکستان اس کے ساتھ ایک اور جنگ لڑنے پر مجبور ہو گیا۔ جنگ دو ہفتوں تک جاری رہی، اور یوں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔'' (صفحہ 11)۔

علامہ اقبال کے 1930ء کے خطبے اور 1971ء کی جنگ پر باب نمبر 2 میں تفصیل دیکھیں۔

سیاسی انتظامیہ کے باب میں دو جملے قابل غور ہیں۔ ''جب 1956ء کا آئین بنایا گیا، تو یہ ابھی فعال بھی نہیں ہوا تھا کہ ساقط کر دیا گیا۔'''' 1971ء میں آئین سازی کا کام ملک کی آئین ساز کمیٹی کے سپرد کیا گیا، اور اس کمیٹی نے اپریل 1973 کو متفقہ طور پر منظور شدہ آئین بنالیا۔'' (صفحہ 70)۔

1956ء کا آئین تیئس مارچ 1956 سے لے کر سات اکتوبر 1958ء تک فعال رہا تھا۔
1973ء کا آئین 1971ء میں نہیں بلکہ 1972ء میں بنانا شروع کیا گیا۔

آخری تیرہ ابواب میں حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہ الزاہرہؓ، حضرت امام حسینؓ، محمد بن قاسم، محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، شاہ ولی اللہ، سلطان ٹیپو، سر سید احمد خان، جمال الدین افغانی، عبیداللہ سندھی، اقبال اور جناح پر مضامین ہیں، جن میں ان شخصیات کو مثالی انسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ (صفحات 119-98)۔ تاہم فاضل مصنفین نے یہ بتانا شاید مناسب نہیں سمجھا کہ اورنگ زیب اقتدار پر فائز کیسے ہوئے تھے۔ (صفحہ 106)۔ جمال الدین ''افغانی'' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا تعلق افغانستان سے تھا، اور وہ اسلام کی عالمگیر تحریک کے داعی تھے، اور ممالک اور اقوام کی حدود سے ماوراا اتحاد بین المسلمین چاہتے تھے (صفحہ 113-112)۔ عبیداللہ سندھی پر ایک صفحے کا مضمون کسی بھی تاریخ کے بغیر ہے (صفحہ 114)، اور ممکن ہے کہ طالب علم اُنہیں بھی اٹھارویں صدی کی کوئی شخصیت سمجھ لے۔ اقبال اور ان کی تعلیم کے بارے میں غلط معلومات درج ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا کہ ''جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُنہیں ملا کر مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم کر دی جائے۔'' نیز اُنھوں نے ''اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی۔'' اس کے ساتھ اُنھوں نے ''بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی'' (صفحہ 115)۔ ''جب جناح انگلینڈ میں تھے تو اقبال نے اُنہیں خطوط لکھے اور واپس ہندوستان جا کر قوم کی قیادت کرنے کا

کہا۔'' (صفحہ 116)۔ جناح پر مضمون میں قراردادِ لاہور تیئس مارچ 1940ء کو پیش کی گئی ہے۔ اس قرارداد میں ''ایک آزاد سلطنت'' کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ (صفحات 117-116)۔

جمال الدین ''افغانی''، اقبال کی غیر ملکی تعلیم، 1930 کا خطبہ، اور قراردادِ لاہور پر مواد اس کتاب کے باب نمبر 2 میں ملاحظہ فرمائیں۔ جب جناح انگلینڈ میں تھے تو اقبال نے اُنہیں خطوط نہیں لکھے تھے کہ وہ ہندوستان واپس آ جائیں۔

معاشرتی علوم: ضلع لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بورڈ، لاہور۔ تیسرا ایڈیشن، مارچ 1989، مصنفین: ڈاکٹر مس فیروزہ یاسمین، مسز زرینہ اشرف، بشیر الدین ملک۔ ایڈیٹر: بشیر الدین ملک۔ نگران: سبط الحسن۔ تعداد اشاعت: 127,000 کاپیاں۔

سبق نمبر 17 (صفحات 93-85) کا عنوان ہے ''تاریخ''۔ محمد بن قاسم سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک، تمام مسلمان فاتحین کی مہمات کے لیے نہایت صفائی سے لفظ ''حملہ'' استعمال کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ (صفحہ 88)۔ برطانیہ کی یلغار کی خوف منظر کشی کی گئی ہے: ''شروع میں برطانوی تاجروں نے برصغیر سے سوتی کپڑا خریدنا اور برطانیہ میں فروخت کرنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ یہاں تجارت کی غرض سے آئے۔ رفتہ رفتہ اُنھوں نے مسلمان حکومت کو کمزوری کو بھانپا، اور اس کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے ہندوؤں کو ساتھ ملایا۔ ہندوؤں نے بہت خوشی سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔'' (صفحات 89-88)۔ انگریزوں کی حکومت اور قائم کردہ نظام سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ ''برصغیر پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ایک طرف یہاں پیدا ہونے والی تمام اشیا کو جی بھر کر لوٹا، اور دوسری طرف ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے۔'' (صفحہ 89)۔

اسی باب میں انڈیا کے ساتھ ہونے والی جنگوں کے بیان میں تاریخی حوالے کی بجائے حب الوطنی کا پیمانہ غالب ہے۔ 1965ء میں ''پاک فوج نے انڈیا کے بہت سے علاقے فتح کر لیے، اور جب انڈیا کو شکست فاش ہونے لگی تو اس نے اقوام متحدہ سے جنگ بندی کرانے کی درخواست کی ---۔ 1965ء کی جنگ کے بعد انڈیا نے مشرقی پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں کے ذریعے

وہاں کے لوگوں کو مغربی پاکستان کے لوگوں کے خلاف بھڑکایا، اور آخر کار دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ہم سب کو فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیے اور دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' صفحہ(93)۔

1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں پر اس کتاب کے باب نمبر 2 میں تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ مذکورہ معاشرتی علوم کے آخری بارہ اسباق (صفحہ 112-94) میں وہی شخصیات ہیں جو این ڈبلیو ایف پی کی معاشرتی علوم میں۔ صرف اورنگ زیب عالمگیر کی جگہ احمد شاہ ابدالی آگئے ہیں، جبکہ ٹیپو سلطان کو حذف کر دیا گیا ہے۔

معاشرتی علوم، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو۔ پہلا ایڈیشن، فروری 1989۔ مصنف: ایس حامد علی جعفری۔ ایڈیٹرز: ڈاکٹر محمد صالح شاہ بخاری اور عبدالمجید عباسی۔ تعداد اشاعت: 80,000 کا بیان۔

''ان دونوں اقوام، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب، طرزِ زندگی اور رسم و رواج میں کوئی قدر مشترک نہیں۔'' (صفحہ 6)۔''1857ء میں جنوبی ایشیا کے لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے مل کر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ جنگ، جنگِ آزادی کہلاتی ہے۔'' (صفحہ 6)۔ ''اقبال وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ 1930ء میں اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ جنوبی ایشیا کے جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں ایک آزاد ریاست قائم کی جائے۔'' (صفحہ 8)۔ 1971ء کے واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''بھارت نے اپنے ایجنٹوں اور شرپسندوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر فسادات کرائے۔ بعد میں چاروں طرف سے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا، چنانچہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ جنگ لڑنی پڑی۔ تین ہفتوں تک جاری رہنے والی اس جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔'' (صفحہ 11)

سبق نمبر 9 میں مسلح افواج پر دو صفحات ہیں (60-58)۔''آخر کار 1956ء میں ملک کے لیے آئین بنایا گیا، لیکن یہ فعال نہ ہو سکا۔ جنرل ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا اور اس آئین کو معطل کر دیا۔'' (صفحہ 65)۔ بعد میں پیش آنے والے اہم واقعات، جیسا کہ جنرل یحییٰ خان اور اُن

کی حکومت کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح ملک کی انتظامیہ کے سبق میں 1977ء کے مارشل لا اور اس میں گزرے ہوئے گیارہ سالوں کا کوئی ذکر نہیں۔ (صفحہ 69-65)

''جمال الدین افغانی جلال آباد، افغانستان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔'' (صفحہ 104)۔ ''اقبال وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔'' ''انھوں نے ڈاکٹر آف فلاسفی اور بیرسٹری کی ڈگریاں جرمنی اور انگلینڈ سے حاصل کیں۔ 1930ء میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ جنوبی ایشیا کے جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں ایک آزاد مسلم ریاست قائم کی جائے۔ جب جناح انگلینڈ میں تھے تو اقبال نے انھیں خطوط لکھے، اور اُن سے درخواست کی کہ وہ جنوبی ایشیا واپس آ کر مسلمانوں کی قیادت کریں۔'' (صفحہ 109-108)۔ ''مسلم لیگ کے 1940ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے اجلاس میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔'' (صفحہ 111=110)۔

ان تمام نکات کی باب نمبر 2 میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

معاشرتی علوم، مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ پانچواں ایڈیشن۔ اپریل 1969۔ مصنفین: محمد عبدالعزیز، ایم اے (علیگ)، ایم اے لندن، پی ایچ ڈی (انڈیانا)، مغربی پاکستان ایجوکیشن سروس (سینئر ڈائریکٹر) مغربی پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لاہور۔ سر ورق بتاتا ہے کہ یہ کتاب قومی کتب خانہ، لاہور نے بورڈ کے لیے شائع کی۔ بیرونی کور کہتا ہے کہ یہ پاکستان بک سٹور، لاہور نے بورڈ کے لیے شائع کی۔ تعداد اشاعت: 73,000 کاپیاں۔

حصہ اول (صفحہ 82-9) کا عنوان ''تاریخ'' ہے، اور اس کے لیے تیرہ اسباق یا ابواب مختص کیے گئے ہیں: حضرت خدیجہؓ، حضرت امام حسینؓ، محمد بن قاسم، حضرت داتا گنج بخش، شاہ جلال سیوتی، خوشحال خان خٹک، شاہ عبداللطیف بھٹائی، نواب سلیم اللہ خان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، چھمب اور جوڑیاں محاذ، سیالکوٹ محاذ، یوم پاکستان، یوم آزادی۔ داتا گنج بخش، سیوتی اور بھٹائی پر مضامین میں کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ ان اصحاب کا تعلق کن صدیوں سے تھا۔ سلیم اللہ

خان کے بارے میں یہ بتانا اہم سمجھا گیا ہے کہ اُنہیں 1903ء میں خان بہادر کا خطاب ملا تھا (صفحہ 44)۔ انگریز حکومت نے 1901ء میں بنگال کو مشرقی اور مغربی صوبوں میں تقسیم کر دیا (صفحہ 45)۔ بنگال کی تقسیم 1901ء میں نہیں، 1905ء میں عمل میں آئی تھی۔ ایوب خان کی شخصیت تمام کتاب پر غالب ہے۔ اُنہیں ایسے شخص کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے جنہیں نیکی اور پرہیزگاری کی وجہ سے ''ہر کوئی پیار کرتا ہے'' (صفحہ 53-52)۔ اُن کے اقتدار سنبھالنے کی چار مرصع سطروں میں وضاحت کر دی گئی ہے: ''قیامِ پاکستان کے بعد، ابتدائی سالوں میں انتظام اچھا چل رہا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ کچھ خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ ملک میں بلیک مارکیٹ پاؤں پھیلانے لگی۔ بدعنوانی عام ہوگئی۔ چنانچہ ایوب خان نے 1958ء میں مارشل لا لگا دیا۔'' (صفحہ 53)۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال کا کوئی ذکر نہیں۔

ایوب کا برپا کیا ہو ''انقلاب'' فاضل مصنف کا دل جیت چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''1958ء کے انقلاب کے بعد نئی قسم کے سکول اور جامعات قائم کی گئیں۔ فیکٹریوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک کے حالات تبدیل ہوگئے۔'' (صفحہ 54)۔ لیجیے، فیلڈ مارشل کے کارناموں پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔ ''انقلاب کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہر سال ستائیس اکتوبر کو یومِ انقلاب منایا جاتا ہے۔ اُس روز پورے ملک میں چھٹی ہوتی ہے، رات کو عمارتوں پر چراغاں کیا جاتا ہے'' (صفحہ 54)۔

باب نمبر 10 اور 11 میں 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دو محاذوں کا مفصل ذکر ہے۔ پاک فوج کے کارناموں اور اس کے ہتھیاروں کی عظمت کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے (صفحہ 75-56)۔ کتاب کے حصہ دوم، جغرافیے کے باب نمبر 24 اور 25 بنیادی جمہوریت کی فعالیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ (صفحہ 160-147)۔ اس طرح ایوب خان اور ان کی حکومت مل کر پانچ ابواب پر راج کر رہے ہیں۔

قرار دادِ لاہور کے حوالے سے دو صفحات پر حقائق کی تین غلطیاں کی گئی ہیں (صفحہ 77-76)۔ ''یہ تیئس مارچ کو منظور کی گئی۔ اسے مسلمانوں نے منظور کیا۔ اس نے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا۔'' باب نمبر 2 میں ان غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

قیامِ پاکستان کی تاریخ چودہ اگست 1947ء بتائی گئی ہے (صفحہ 80-79)۔ درست

تاریخ باب 2 میں پڑھیے۔ تاہم کتاب کے ''ماتھے کا جھومر'' صفحہ نمبر 139 ہے۔ انڈیا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ''ماضی'' میں ہمارے ملک کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ کیا 1947ء سے پہلے پاکستان انڈیا کا حصہ تھا، یا انڈیا پاکستان کا حصہ تھا؟ یہ تو کتاب کے فاضل مصنف ہی جواب دے سکتے ہیں۔ کتاب کا بیرونی کور بتاتا ہے کہ اگر چہ یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے، لیکن انگلش میڈیم سکولوں کے طلبہ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

جماعت ششم

معاشرتی علوم، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ مصنفین حصہ تاریخ: پروفیسر علاؤالدین خلجی، کالج آف ایجوکیشن، پشاور؛ لطیف میر، چیف انسٹرکٹر، ایجوکیشن ایکس ٹینشن سنٹر، ایبٹ آباد؛ اور عبدالرؤف فاروقی، جہانزیب کالج، سیدو شریف۔ مصنفین حصہ جغرافیہ: کرامت علی شاہ، یونیورسٹی پبلک سکول، یونیورسٹی آف پشاور۔ نظر ثانی: پروفیسر اسرارالدین، ہیڈ آف جیوگرافی ڈپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف پشاور، اور محمد حلیم، ماہر مضمون، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔ تعداد اشاعت: 70,000 کاپیاں۔

باب نمبر 6 اور 8 جنوبی ایشیا کی قدیم تہذیب، (صفحہ 54-47) مسلمانوں کی برصغیر میں آمد (صفحہ 63-55)، جنوبی ایشیا میں انگریزوں کا اقتدار، اور تحریک پاکستان (صفحہ 72-64) کو بیان کرتے ہیں۔

کچھ بیانات: ''1857ء میں انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو قید کر لیا اور مغل دور کا خاتمہ کر دیا۔'' (صفحہ 59)۔ ''اردو نے بتدریج اتنی ترقی کی کہ یہ پورے جنوبی ایشیا میں بولی جانے لگی۔'' (صفحہ 61) جنوبی ایشیا کے شمالی حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملبوسات ''تقریباً ملتے جلتے'' تھے۔ (صفحہ 61)۔ ''شہنشاہ اکبر کے علاوہ کچھ اور مغل شہزادوں نے بھی ہندو راجاؤں کی بیٹیوں سے شادی کی تھی۔'' (صفحہ 62)۔ ''1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی تھی۔'' (صفحہ 69)۔ 1857ء کے بعد ''سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور کچھ دیگر مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کی ضرورت اجاگر کرنا شروع کر دی۔'' (صفحہ 72-71)۔

1857ء کے واقعات، اور اردو زبان کی اہمیت کتاب کے باب نمبر 2 میں دیکھیے۔ سرسید احمد خان نے تو مسلمانوں کے لیے کسی الگ ریاست کے امکان کا ذکر تک نہیں کیا، چہ جائیکہ وہ اس کی ضرورت اجاگر کرتے۔

معاشرتی علوم، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ اٹھواں ایڈیشن، مارچ 1989ء۔
مصنفین: ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، نگہت ناہید، محمد عمر اور حفظہ جاوید۔ ایڈیٹرز: صاحبزادہ عبدالرسول اور حفظہ جاوید، نگران: حفظہ جاوید۔ تعداد اشاعت: 145,000 کاپیاں۔

کچھ بیانات: ''برصغیر کے باشندے انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ 1857ء میں اُنھوں مسلح بغاوت کرتے ہوئے انگریزوں کو برصغیر سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی'' (صفحہ 76)۔ اس حصے کا عنوان ہے: ''1857ء کی جنگِ آزادی''۔ ''1885ء میں ہندوؤں نے اپنی سیاسی جماعت، انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی'' (صفحہ 79)۔ ''1940ء میں مسلم لیگ نے لاہور میں قراردادِ پاکستان منظور کی، اور ایک الگ آزاد وطن کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 80)۔

1857ء میں ''برصغیر کے باشندوں'' نے آزادی کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بغاوت میں تھوڑے سے لوگ ملوث تھے، اور نہ ہی وہ کوئی جنگِ آزادی تھی۔ انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد صرف ہندوؤں نے نہیں رکھی تھی۔ قراردادِ لاہور میں کسی ''آزاد اور الگ وطن'' کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ آزاد ریاستوں کی بات البتہ کی گئی تھی۔ اس کی مزید تفصیل باب دوم میں۔

معاشرتی علوم۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو۔ پہلا ایڈیشن، جنوری 1989ء۔
مصنف: ایڈگر ڈکٹر۔ تعداد اشاعت: 90,000 کاپیاں۔

کچھ بیانات: ''ایک جگہ پر رہتے ہوئے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے'' (صفحہ 86)۔ ''مسلمانوں کے لباس نے ہندوؤں کو متاثر کیا، اور بہت جلد جنوبی ایشیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملبوسات ایک جیسے ہو گئے'' (صفحہ 87)۔ ''مسلمانوں کے کھانوں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی... ہندوؤں نے اپنے گھروں کو سجانے کے لیے اسلامی انداز اختیار

کرلیا'' (صفحہ 90)۔ ''1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی کہلاتی ہے'' (صفحہ 100-99)۔ ''سرسید احمد خان، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور دیگر مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ، آزاد اور خود مختار مملکت کی ضرورت محسوس کرنا شروع کردی'' (103-102)۔ قرار داد پاکستان کہتی ہے کہ ''جنوبی ایشیا میں مسلم اکثریت رکھنے والے تمام علاقوں کو ملا کر ایک آزاد اور خود مختار ریاست بنادی جائے جس کا نام پاکستان ہو'' (صفحہ 103)۔

اگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب آچکے تھے کہ اُن کی خوراک، لباس، گھر اور رہن سہن کے طریقے مماثلت اختیار کرگئے تھے تو پھر مسلمانوں نے اپنی جداگانہ شناخت اور قومیت کی اتنی دہائی کیوں دی، اور اپنے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیوں کیا؟ ایک تہذیب اور ایک ثقافت، اور ایک قومیت کے دھارے میں رہتے ہوئے ہندو مسلم مسائل کیوں پیدا ہوئے؟ 1857ء کی جنگ، جنگِ آزادی نہیں، بلکہ بغاوت تھی جس نے ایک عہد کا خاتمہ کرتے ہوئے ایک نیا دور شروع کردیا۔ سرسید احمد خان نے کبھی بھی مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کی ضرورت پر زور نہیں دیا تھا۔ یہ بات اُنھوں نے کبھی اشارۃً بھی نہیں کہی تھی۔ قرار دادِ لاہور نہ تو ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ ہی اس کا نام پاکستان تجویز کرتی ہے۔ اس نے ریاستوں کی بات کی تھی۔ باقی تفصیل باب نمبر 2 میں۔

معاشرتی علوم (تاریخ و شہریت)، مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ پہلا ایڈیشن، مارچ 1968۔ مصنفین: عبدالغفور چوہدری، بی اے (آنرز) (لندن)، ایم اے، ایم ایس سی (علیگ)، سینئر ایڈیٹر، مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ۔ نظر ثانی: ڈاکٹر عبدالحمید، ایم اے، پی ایچ ڈی، سربراہ شعبہ تاریخ، جامعہ پنجاب، لاہور۔ شائع شدہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، لاہور۔ تعداد اشاعت: 170,000 کاپیاں۔ (بیک کور کہتا ہے کہ یہ چوتھا ایڈیشن ہے، جو مارچ 1969ء میں شائع ہوا۔ تعداد اشاعت: 120,000 کاپیاں)۔ پتہ نہیں انسان کس پر یقین کرے؟

کتاب کے تین حصے ہیں۔ تاریخ پاک و ہند (صفحہ 114-1)، تاریخ اسلام (صفحہ 162-115)، شہریت (صفحہ 184-163)۔

شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی کا ذکر صفحہ 77-74 پر ملتا ہے، لیکن بنگال میں ہونے والی ہم عصر پیش رفت پر ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ 1857ء کی بغاوت کو جنگ آزادی، اور اس میں حصہ لینے والوں کو مجاہدین قرار دیا گیا ہے (صفحہ 81-77)۔ تحریک علی گڑھ اور تحریک دیوبند (صفحہ 87-83) کو مناسب توجہ دی گئی ہے، لیکن مسلم بنگال کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

''1885ء میں ہندوؤں نے کانگرس کی بنیاد رکھی'' (صفحہ 85)۔ ''ایک انگریز، مسٹر ہیوم نے 1885ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی (صفحہ 88)''۔ اب دونوں بیانات درست نہیں ہو سکتے۔ ہیوم کوئی انگریز ہندو نہیں تھا۔ درحقیقت دونوں دعوے ہی درست نہیں۔ کانگرس کی بنیاد نہ تو صرف ہندوؤں نے رکھی اور نہ ہی مسٹر ہیوم نے۔ اسے شروع کرنے والوں میں مسلمان بھی شامل اور پارسی بھی۔ ہاں مسٹر ہیوم نے اس پیش رفت کا خیر مقدم ضرور کیا تھا۔

1930ء میں علامہ اقبال نے تجویز پیش کی کہ ''اُن علاقوں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، کو انڈین صوبوں سے الگ کر کے ایک آزاد ریاست بنا دی جائے جہاں مسلمان نہ صرف اپنی مرضی سے حکومت کر سکیں، بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کو بھی فروغ دے سکیں'' (صفحہ 102)۔ اقبال نے 1930ء میں ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ باب دوم میں اس کی تفصیل دیکھیں۔

''قرارداد پاکستان مارچ 1940ء کو منظور ہوئی، اس میں ایک آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ کیا گیا'' (صفحہ 105-104)۔ درحقیقت قرارداد کا نام ہی غلط ہے۔ یہ قرارداد لاہور ہونی چاہیے۔ نیز اس نے کسی ایک آزاد ریاست کا نہیں، 'ریاستوں' کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کی درست تاریخ، جو کہ چوبیس مارچ ہے، یہاں درج نہیں۔ میں نے ان فاش غلطیوں پر باب نمبر 2 میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

''1945ء میں ہونے والی شملہ کانفرنس میں کانگرس کے رہنماؤں نے دعویٰ کیا کہ صرف اُن کی پارٹی ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے، چنانچہ مسلم لیگ کو یہ دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے'' (صفحہ 107-106)۔ کانگرس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس سے غلط بیان منسوب کیا گیا ہے۔ اس نے صرف مسلم لیگ کے اس دعوے کی تردید کی تھی کہ وہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ کانگرس نے کہا کہ اس کی اپنی صفوں میں بھی مسلمان رہنما ہیں جو لیگ کے موقف کے حامی نہیں۔ چنانچہ کانگرس نے لیگ کی اس شرط کو قبول کرنے

سے انکار کر دیا کہ صرف اس کے پاس وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے مسلمان نمائندے نامزد کرنے کا حق ہے۔

''14 اگست 1947ء کو برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہوا'' (صفحہ 109)۔ درست بیان کے باب نمبر 2 دیکھیں۔

1947ء میں ہونے والے فسادات کا کتاب مکمل طور پر یک طرفہ جائزہ لیتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے ''نہتے مسلمانوں'' کا قتل عام کیا۔ تاثر یہ دیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دفاع میں کچھ نہیں کیا تھا (صفحہ 110)۔

''1965ء کی جنگ میں انڈیا کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا، اور اس کا جانی نقصان (زخمیوں کا ذکر نہیں) پاکستان کی نسبت دس گنا زیادہ تھا'' (صفحہ 159-158)۔ یہ نیم سچ ہے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ 1965ء کی جنگ کا باب ''تاریخ اسلام'' میں شامل ہے نہ کہ ''تاریخ ہند و پاک''۔ اس سے تین باب پہلے بنو امیہ کا ذکر ہے۔ طلبہ اس سے کیا مطلب اخذ کریں گے؟ کتاب کا آخری باب (صفحہ 184-176) بنیادی جمہوریت کی تعریف کرتا ہے۔

کتاب کی دو مزید کمزوریاں نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ یہ آل انڈیا مسلم کانفرنس جیسے اداروں اور گول میز کانفرنس جیسی پیش رفت کا کوئی ذکر نہیں کرتی۔ یہ بنگال کے مسلمانوں کی سیاسی اور فکری تبدیلی کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔

معاشرتی علوم (تاریخ و شہریت)، مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ پہلا تجرباتی ایڈیشن، دوسرا ایڈیشن، مارچ 1984۔ مصنفین: بشیر الدین ملک، محمد اسلم، اظہر حمید اور عبدالقدیر۔ ایڈیٹر: بشیر الدین ملک۔ نگران: مسز حفظہ جاوید اور سبط حسن۔ شائع شدہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، لاہور۔ تعداد اشاعت: 30,000

''تجرباتی ایڈیشن'' کافی دیر تک چلتا رہا کیونکہ یہ اس نے حکومت پنجاب سے بیس نومبر 1974ء کو منظوری کا نوٹیفکیشن حاصل کر لیا تھا۔ پروفیسر نذیر احمد اعوان، چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی وارننگ اس کے اندرونی کور پر موجود ہے کہ ''آپ بورڈ کی مطبوعات کے علاوہ کوئی اور کتاب

غور کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ اگر آپ کو اس کے لیے مجبور کیا جائے تو آپ زیر دستخطی کو مطلع کریں۔'' کچھ واضح نہیں کہ اس وارننگ میں '' آپ '' سے مراد طلبہ ہیں یا استاد۔

پیش لفظ میں مصنفین کتاب کا مقصد بیان کرتے ہیں: '' سوشل سٹڈیز کو (حکومت کی) تعلیمی پالیسی میں خصوصی اہمیت دی گئی ہے تاکہ پاکستان کا بنیادی نظریہ ایک نئی جہت اختیار کر سکے، اس کے عملی نفاذ کو یقینی بنایا جائے، اس سماجی مساوات کا تصور معاشرے میں افراد کی زندگیوں کو عملی طور پر متاثر کرے۔'' غالباً یہی مقاصد کتاب کے مواد کا تعین کرتے ہیں۔ کتاب کا مرکزی موضوع اسلامی دنیا ہے۔ کچھ سرسری حوالہ پاکستان کا بھی ہے، لیکن وہ بڑی حد تک مبہم، ناکافی اور گمراہ کن ہے۔

1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے پر کتاب کہتی ہے: '' قیام پاکستان کے وقت سے ہی کچھ دشمن ممالک مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان ممالک کی سازشیں 1971ء میں کامیاب ہو گئیں۔ مشرقی پاکستان ملک کے دوسرے حصے سے الگ ہو گیا، اور اس نے بنگلہ دیش کا نام اختیار کر لیا'' (صفحہ 78)۔ یہ تین سطری سادگی ملک کی زندگی کے اُس پیچیدہ ترین بحران کو بیان کرتی ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس پر میرا موقف دوسرے باب میں دیکھیے۔

باب دوم (صفحہ 90-81) کچھ سوانح عمریاں رکھتا ہے، جیسا کہ جمال الدین افغانی، محمد علی جوہر، اقبال اور جناح۔ ان میں سے کسی کی زندگی میں تاریخ یا سال کا کوئی عمل دخل معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ مصنف نے کچھ بتانے کی زحمت ہی نہیں کی۔ جمال الدین افغانی (صفحہ 82-81) کا انڈیا کا دورہ نہیں بتایا گیا۔ اقبال کا دس سطری نوٹ ہمیں بتاتا ہے کہ اُنھوں نے '' 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ سرزمین کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 86)۔ یہ سچائی کے ساتھ مذاق ہے۔ دوسرے باب میں اس کی وضاحت دیکھیے۔

جماعت ہفتم

معاشرتی علوم، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ مصنفین: پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر کاکا خیل، گورنمنٹ کالج نوشہرہ، اور پروفیسر محمد ناصر، گورنمنٹ کالج مردان۔ نظر ثانی: پروفیسر اسرار الدین، سربراہ شعبہ جغرافیہ، پشاور یونیورسٹی، اور محمد حلیم، ماہر مضمون، این

ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔ تعداد اشاعت: 10,000 کاپیاں۔

باب 4-1 (صفحہ 42-1) مسلم دنیا کا ذکر کرتے ہیں، لیکن تاریخ نہیں بتاتے۔ جمال الدین افغانی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ افغانستان میں پیدا ہوئے، جو کہ اُن کا اصل ملک تھا (صفحہ 31)۔ میری وضاحت باب دوم میں دیکھیں۔

انڈین مسلم تاریخ پر صرف چار صفحات (38-35) ہیں، اور ان میں بھی محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور محمد علی جناح پر تین مضامین ہیں۔ محمد علی جوہر کی کانگرس میں خدمات پر کتاب خاموش ہے۔ اقبال کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اُنھوں نے ''انگلینڈ سے بیرسٹری اور فلاسفی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی''، اور یہ کہ اُنھوں نے 1930ء میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ کیا۔ جناح کے بارے میں ہم پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ سولہ سال کی عمر میں ''قانون کی ڈگری حاصل کرنے انگلینڈ تشریف لے گئے''، اور اُن کی صدارت میں مسلم لیگ نے 1940ء میں ایک قرار داد پیش کی جس میں انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک ''الگ ریاست'' کا مطالبہ کیا گیا۔

معاشرتی علوم، شیخ سراج الدین اینڈ سنز، لاہور برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ دسواں ایڈیشن۔ مارچ 1989۔ مصنفین: ڈاکٹر حسن عسکری رضوی اور نگہت ناہید۔ ایڈیٹرز: سید مسعود رضا اور سبط حسن۔ نگران: مسز حفظہ جاوید۔ تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ تعداد اشاعت: 146,000 کاپیاں۔

پہلے چار باب (صفحہ 34-1) این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ کی معاشرتی علوم کی پیروی کرتے ہیں۔ تاہم اپنی انفرادیت دکھانے کے لیے کتاب دو اضافی غلطیاں کرتی ہے: مولانا محمد علی جوہر نے ''اپنی اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ سے حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں اُنہیں آنرز کی ڈگری دی گئی'' (صفحہ 26)۔ مضمون بتانے کی زحمت نہیں کی گی جس میں آنرز کی ڈگری دی گئی تھی۔ انگلینڈ میں اقبال نے سید امیر علی کے اشتراک سے لندن مسلم لیگ منظم کی (صفحہ 28)۔ لندن مسلم لیگ پر باب دو میں وضاحت دیکھیے۔

معاشرتی علوم، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو۔ پہلا ایڈیشن، فروری 1989۔
مصنف۔سید حامد علی جعفری۔تعداد اشاعت: 90,000 کا پیاں۔

کچھ بیانات: ''سید جمال الدین افغانی 1838ء میں افغانستان کے ایک گاؤں، اسد آباد میں پیدا ہوئے''۔(صفحہ 50)۔''اقبال نے پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی ڈگریاں حاصل کیں۔انھوں نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک الگ حکومت حاصل کرنے کا تصور دیا''(صفحہ 54)۔''مارچ 1940ء میں مسلم لیگ نے تاریخی قرارداد منظور کرتے ہوئے ایک الگ آزاد اسلامی حکومت کا مطالبہ کیا''(صفحہ 56)۔

ان میں سے ایک بیان بھی درست نہیں۔وضاحت باب نمبر دو میں دیکھیے۔

معاشرتی علوم (تاریخ و شہریت)، مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ تیسرا ایڈیشن، اپریل 1969۔ مصنفین: عبدالغفور چوہدری، بی اے (آنرز) (لندن)، ایم اے، ایم ایس سی (علیگ)، سینئر ایڈیٹر، مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ۔ نظر ثانی: ڈاکٹر ایم ڈی مالک، ایم اے، پی ایچ ڈی (واشنگٹن)۔ پروفیسر انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اور ریسرچ، جامعہ پنجاب، لاہور۔ قومی کتب خانہ، لاہور نے بورڈ کے لیے شائع کی۔ تعداد اشاعت: 55,000 کا پیاں۔

یہ کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے: برصغیر کی جدوجہد آزادی (صفحہ 100-1)؛ تاریخ اسلام (صفحہ 129-101)؛ پاک بھارت جنگ (صفحہ 156-130)، عمرانیات (صفحہ 173-157)، اور حکومت کی آمدنی اور اخراجات (صفحہ 207-174)۔

کتاب مسخ شدہ حقائق، اور غلطیوں سے لبریز ہے۔

1857ء کی جنگ پر: ''یہ مسلمانوں کا انگریز حکومت کے خلاف جہاد تھا جس میں دوسروں نے بھی حصہ لیا''(صفحہ 20) سادہ الفاظ میں اس کا مطلب ہے کہ مسلمانوں نے ایک مقدس فریضہ جان کر شورش کا منصوبہ بنایا، اسے شروع کیا اور اسے عملی شکل دی، لیکن دوسروں نے (جو کہ غیر مسلم تھے) بھی اس جہاد میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ میں نے باب نمبر 2 میں 1857ء کے واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

''سرسید احمد خان نے 1857ء کی جنگِ آزادی پر کتاب لکھی'' (صفحہ 31)۔ ہرگز نہیں۔ اُن کی کتاب کا عنوان تھا ''رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند'' سرسید نے اسے جہاد یا جنگِ آزادی نہیں، بغاوت قرار دیا۔ ''آل انڈیا کانگرس کی بنیاد ایک انگریز مسٹر ہیوم نے رکھی'' (صفحہ 31)۔ پارٹی کا نام آل انڈیا کانگرس نہیں، انڈین نیشنل کانگرس تھا، اور اس کی بنیاد مسٹر ہیوم نے نہیں رکھی تھی۔ ''کانگرس کو شروع سے ہی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی'' (صفحہ 31)۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر حکومتِ ہند اور لارڈ ڈیفرن نے اس کے قیام کا خیر مقدم کیا تھا تو مسلم لیگ پر بھی لارڈ منٹو اور اُن کی حکومت مہربان تھی۔

1906ء کے شملہ وفد نے ''کونسلز کے انتخابات کے لیے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 38)۔ لیکن وفد نے دیگر تمام باڈیز پر بھی اثر انداز ہونے کی بات کی تھی، اور کتاب میں اس کا ذکر شامل ہونا چاہیے تھا۔

1916ء کا لکھنو معاہدہ (صفحات 41، 47-46) دو مرتبہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے لیے اس کے تباہ کن نتائج کا ذکر نہیں کیا گیا۔ میں نے اس موضوع پر مفصل انداز میں باب دوم میں لکھا ہے۔

''علامہ اقبال نے 1930ء میں بہت واضح انداز میں مطالبہ کیا کہ مسلمان پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کو ملا کر اپنی ایک آزاد ریاست اور نئی مملکت قائم کر لیں'' (صفحہ 44)۔ اقبال نے دراصل کیا کہا تھا، باب دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

''جب گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم معاہدہ طے نہ پایا تو برطانوی حکومت نے اپنی طرف سے 1935ء میں نئی اصلاحات متعارف کرا دیں'' (صفحہ 53)۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی بابت حد درجہ لاعلمی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہ برطانوی وزیرِ اعظم کی طرف سے پیش کردہ 1932ء کا کمیونل ایوارڈ تھا کیونکہ ہندو اور مسلمان رہنما مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں ہر قومیت کے لیے مختص نشستوں کی تعداد پر متفق نہیں ہو پا رہے تھے۔ یہ اصلاحات 1928ء میں سائمن کمیشن کے انڈیا کے دورے سے لے کر 1933ء میں انڈین آئینی اصلاحات پر بننے والی مشترکہ سلیکٹ کمیٹی انکوائری، اعلیٰ سطحی مذاکرات، گفت و شنید اور تبادلۂ خیالات کے طویل سلسلے کا نتیجہ تھیں۔ ان تمام برسوں میں انڈین رہنما برطانوی حکومت سے قریبی رابطے میں تھے۔

''قرار دادِ لاہور نے ملک میں دو آزاد ریاستوں کی تخلیق کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 55)۔ درست معلومات باب دوم میں دیکھیں۔ ''کرپس مشن 1940ء میں انڈیا میں آیا'' (صفحہ 55)۔ درست سال 1942ء ہے۔

''چودہ اگست 1947ء کو دو آزاد ریاستیں، پاکستان اور ہندوستان معرض وجود میں آئیں'' (صفحہ 61)۔ چودہ اگست کی بجائے پندرہ اگست پڑھیں۔ آزادیٔ ہند ایکٹ میں لفظ ''ہندوستان'' نہیں، اور نہ ہی 1947ء کے بعد سے انڈیا نے اپنے لیے یہ نام استعمال کیا ہے۔

1947ء سے لے کر 1958ء تک پاکستان کے دگرگوں سیاسی حالات کے لیے چار صفحات (63-67) مختص کیے گئے ہیں تا کہ طلبہ کا ذہن ایوب خان مارشل لا کے فیوض و برکات سمیٹنے کے لیے تیار ہو جائے۔

''1960ء میں ایوب خان ملک کے صدر منتخب ہوئے، اور اس کے ساتھ ہی ملک میں جمہوریت بحال ہوگئی''۔ ''پھر ایوب نے ملک کی اس طرح خدمت کی کہ وہ 1965ء میں دوبارہ منتخب ہوگئے'' (صفحہ 68)۔ بنیادی جمہوریت کے محدود دائرے، مختصر الیکٹورل کالج، ملک میں ایوب کے خلاف بڑھتے ہوئے جذبات، 1965ء میں مس فاطمہ جناح کا اُن کے خلاف صدارتی الیکشن لڑنا جبکہ کل جماعتی الائنس اُن کے ساتھ تھا، اور ایوب کا متفق ووٹ حاصل نہ کرنا جیسے اہم معروضات سے صرف نظر کرتے ہوئے منصف نے بطور سرکاری افسر اپنی وفاداری کا واضح ثبوت تو دے دیا، لیکن طلبہ کو اہم معلومات سے محروم کر دیا۔

ایک طویل باب (صفحات 100-69) ایوب انتظامیہ پر ہے۔ کتاب کا ایک الگ حصہ (صفحات 157-130) بطور صدر ایوب کو سراہتا ہے، 1965ء میں پاک فوج کی بے مثال کامیابی کے گن گاتا ہے، اور دعویٰ کرتا ہے کہ پاک فوج کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے (صفحات 136-135)۔

کتاب کے کل 207 صفحات میں سے 63 پاک و ہند تاریخ اور 29 تاریخ اسلام کے لیے مختص ہیں۔ باقی 115 صفحات ایوب خان دور کی خوبیوں سے لبریز ہیں۔

کلاس ہشتم

معاشرتی علوم، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ مصنفین: پروفیسر تیمور خٹک، شعبہ جغرافیہ، جامعہ پشاور، پروفیسر علاؤالدین خلجی، ایم اے، ایجوکیشن کالج، جامعہ پشاور، اور پروفیسر محمد نذیر کاکاخیل، گورنمنٹ کالج نوشہرہ۔ نظر ثانی: پروفیسر اسرارالدین، سربراہ شعبہ جغرافیہ، پشاور یونیورسٹی، اور محمد حلیم، ماہرِ مضمون، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔
تعداد اشاعت: 55,000۔

باب نمبر 8 اور 9 تاریخ ہند (1857-1947) بیان کرتے ہیں (صفحات 72-86)۔

1857ء کے واقعے کو ''انگریزوں نے غدر کا نام دیا، اور اپنے مخالفین کو باغی کہا۔ لیکن یہ جنگ برطانوی راج کے خلاف پہلی مشترکہ انڈین کوشش تھی۔ اس جنگ میں مسلمان ہراول دستہ تھے۔ یقیناً اس جنگ کے نتیجے میں آزادی نہ مل سکی، لیکن ناکامی نے بھی مسلمانوں کے دل میں آزادی کی روح پھونک دی، اور اس کے نتیجے میں 1947ء میں مملکتِ پاکستان معرضِ وجود میں آئی'' (صفحہ 73)۔

1857ء کی بغاوت کو قیامِ پاکستان کے ساتھ ملانا تاریخ، معروضی حالات اور معقولیت، سب کے ساتھ کھلواڑ کے مترادف ہے۔ 1857ء کے لیے باب دوم کا مطالعہ کیجیے۔

1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں ''کانگرس اور مسلم لیگ نے صوبائی حکومتیں قائم کیں'' (صفحہ 77)۔ درحقیقت لیگ کی صرف ایک صوبے میں حکومت قائم ہوئی تھی۔ ''ماؤنٹ بیٹن بطور گورنر جنرل انڈیا میں آئے'' (صفحہ 77)۔ ''چودہ اگست 1947ء کو برِصغیر کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا'' (صفحہ 77)۔

مارچ 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن وائسرائے کے طور پر انڈیا آئے۔ تقسیم ہند کا فیصلہ تین جون کو کیا گیا، جبکہ اس کا نفاذ پندرہ اگست کو ہوا۔

''1911ء میں تقسیم بنگال منسوخ کر دی گئی، اور صوبہ دوبارہ متحد ہو گیا۔ اب مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان کا سیاسی مستقبل ہندوؤں کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ اگر انھوں نے اپنی الگ شناخت برقرار رکھنی ہے تو اپنی ایک الگ ریاست حاصل کرنی ہوگی'' (صفحہ 78)۔ تو گویا مسلم لیگ کا قیام 1911ء کے بعد عمل میں آیا تھا۔ ''1930ء میں اقبال نے ایک الگ اسلامی مملکت کی

تجویز پیش کی'' (صفحہ 80)۔ ''خطبہ الہ آباد کے بعد اقبال صرف آٹھ برس زندہ رہے۔اس عرصے کے دوران اُنھوں نے ایک الگ مملکت کے قیام کے لیے اپنی شاعری، تقاریر اور خط و کتابت کے ذریعے بھرپور تحریک چلائی'' (صفحہ 81)۔ ''تیئیس مارچ 1940 کو قراردادِ پاکستان میں ایک آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا... شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے'' (صفحہ 83)۔

اقبال اور قراردادِ لاہور پر باب دوم میں دیکھیے۔

1971ء کے سانحے پر کتاب انکشاف کرتی ہے: ''قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد پاکستان میں کئی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے اسے زک پہنچانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ دشمنی اور سازش کے نتیجے میں 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہوگیا'' (صفحہ 86)۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کی تفصیل باب دوم میں موجود ہے۔

معاشرتی علوم، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ پہلا ایڈیشن۔ مارچ 1989۔ مصنفین: قاضی عبدالقدیر، ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی، ڈاکٹر اظہر حمید، پروفیسر بشیر الدین ملک، پروفیسر انصار حسین، منور ابنِ صادق، محمد شفیع مرزا، ڈاکٹر شہباز خان، اور ملک امیر الدین۔ ایڈیٹرز: نور محمد ملک، سبطِ حسن اور مسز حفظہ جاوید۔ نگران: مسز حفظہ جاوید۔ تعداد اشاعت: 140,000 کاپیاں

ابواب 10-8 (صفحات 110-85) تاریخ (1947-1857) کو بیان کرتے ہیں۔ ''1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی تھی'' (صفحہ 85)۔ ''انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کا مقصد ہندوؤں کو سیاسی طور پر منظم کرنا تھا'' (صفحہ 89)۔ یکم اکتوبر 1906ء کے شملہ وفد کی قیادت نواب محسن الملک نے کی'' (صفحہ 90)۔ ''کانگرس اور مسلم لیگ، دونوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا'' (صفحہ 96)۔ ''مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا تصور بہت پرانا تھا۔ کئی مسلمان رہنماؤں نے اس پر وقتاً فوقتاً بات کی، لیکن یہ علامہ اقبال تھے جنہوں نے 1930ء کے خطبے میں اس کا واضح تصور پیش کیا۔ 1933ء میں چوہدری رحمت علی نے اسے 'پاکستان' نام دیا'' (صفحہ 102)۔

ان غلط بیانات کی اصل حقیقت باب دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

معاشرتی علوم، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو، دوسرا ایڈیشن، مئی 1989۔ مصنفین: ایڈگر وکٹر، پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن شیخ اور پروفیسر محمد رفیق دھانانی۔ تعداد اشاعت: 10,000 کاپیاں۔

کچھ بیانات: 1857ء کے واقعات ''جنگِ آزادی'' تھے (صفحہ 81)۔ ''علامہ اقبال پاکستان کے فلاسفر تھے کیونکہ اُنھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 86)۔ اقبال نے ''اپنی شاعری، تقاریر اور خط و کتابت کے ذریعے مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام کے لیے بھرپور تحریک چلائی'' (صفحہ 87)۔ ''تیئیس مارچ کی قراردادِ پاکستان میں ایک الگ اور خودمختار ریاست کا مطالبہ کیا گیا'' (صفحہ 89)۔ ''قائدِاعظم کی رحلت کے بعد پاکستان میں داخلی طور پر کئی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے اسے زک پہنچانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ سازش کے نتیجے میں 1971ء میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوگیا... لیکن اب پاکستان اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ اسلامی ممالک اسے اسلام کا قلعہ خیال کرتے ہیں۔ انشاءاللہ، پاکستان کا شمار دنیا کے صفِ اوّل کے ممالک میں ہوگا'' (صفحہ 92)۔

تصیح کے لیے باب دوم دیکھیے۔

آخری جملے میں پاکستان کو ''اسلام کا قلعہ'' کہا گیا ہے۔ اگر کوئی تیسرے درجے کی سیاسی جماعت کسی عوامی جلسے میں، جہاں ہوش و خرد کا زیادہ عمل دخل نہیں ہوتا، یہ بات کہتی تو بھی ناگوار گرزتی۔ اور یہاں ہم ایک درسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ کتاب تین پروفیسرز نے تحریر کی ہے۔ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ پروفیسرز نے جوشِ جذبات میں پاکستان کو اسلام کا قلعہ قرار دے ڈالا ہو لیکن کیا اُنہیں احساس ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے ہزاروں اساتذہ اور طلبہ اس بات کو سچ مان لیں گے؟ کیا قارئین کتاب کی بات پر یقین کریں، یا اُس پر جو وہ اپنی آنکھوں سے اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں؟ یا پھر پروفیسرز صاحبان یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بدعنوانی، دھوکہ دہی، دہشت گردی، استحصال، منشیات فروشی، اسلحے کی سمگلنگ، آبرو ریزی اور لوٹ مار اسلامی خوبیاں ہیں جو اسے اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے کافی ہیں؟

کلاس نہم، دہم

مطالعہ پاکستان، ادارہ فروغ تعلیم پشاور، برائے این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔ مصنفین: پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر کاکاخیل، شعبہ سیاسیات، جامعہ پشاور؛ پروفیسر فیضان احمد، پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج کوہاٹ؛ اور پروفیس ناصر محمد خان، گورنمنٹ ڈگری کالج، مردان ۔نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر کاکاخیل، شعبہ سیاسیات، جامعہ پشاور، اور محمد حلیم، ماہر مضمون این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔تعداد اشاعت: 40,000 کاپیاں۔

دو باب تاریخ کے ہیں: جنوبی ایشیا میں اسلامی معاشرہ (صفحات 20-7)، اور قیامِ پاکستان (صفحات 42-21) 1857 کے واقعات ''جنگِ آزادی'' تھے (صفحہ 21)؛ انڈین نیشنل کانگرس کو '' آل انڈیا نیشنل کانگرس'' کہا گیا ہے (صفحہ 24)؛ 1916ء کا لکھنو پیکٹ مسلمانوں کی ''ایک عظیم کامیابی'' تھی (صفحہ 26)؛ 1930ء میں اقبال نے کھلے الفاظ میں '' دوقومی نظریے اور مسلمانوں کے لیے الگ مملکت'' کی بات کی (صفحہ 34)؛ جیسے ہی 1947ء میں آزادی کا اعلان ہوا، ہندوؤں اور سکھوں نے انڈیا میں مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام شروع کر دیا (صفحہ 40)''۔ یہاں پاکستان میں ہونے والے فسادات کا کوئی ذکر نہیں۔

کتاب کے دیگر حصوں میں درج بیانات بھی اسی طرح گمراہ کن ہیں۔ 1971ء کے سقوطِ ڈھاکہ کو دو سطروں میں بھگتا دیا گیا ہے: ''چونکہ دونوں اہم پارٹیوں میں سنجیدہ آئینی تنازعات موجود تھے اس لیے اسمبلی کا پہلا اجلاس نہ بلایا جا سکا۔ جب اختلافات کی سنگینی بڑھ گئی اور مشرقی پاکستان کے حالات بے قابو ہو گئے تو مارشل لا حکومت نے فوجی کارروائی کی، جس کے نتیجے میں وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انڈیا نے پاکستان کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ چنانچہ دونوں ممالک میں جنگ چھڑ گئی۔ پاک فوج کو سولہ دسمبر 1971ء کو ہتھیار ڈالنا پڑے، اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا'' (صفحہ 51)۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو باب دوم میں بیان کیا گیا ہے۔

1977ء میں جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کا جواز پیش کیا گیا ہے: ''پاکستان نیشنل الائنس

نے تازہ انتخابات کے لیے ایک تحریک شروع کی، جو تحریکِ نظامِ مصطفیٰ میں تبدیل ہوگئی۔ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے، لیکن جب اُن سے کوئی مثبت نتائج برآمد نہ ہوئے، اور ملک میں امن و امان کی صورتِ حال بگڑتی گئی تو مسلح افواج نے جنرل محمد ضیاالحق کی قیادت میں پانچ جولائی 1977ء کو ملک کا کنٹرول سنبھال لیا'' (صفحات 55-54)۔ اقتدار کو طول دینے کے ضیا کے فیصلے کا اس طرح دفاع کیا گیا ہے: ''اعلان کیا گیا کہ 90 روز کے اندر انتخابات ہوں گے، لیکن ناگزیر وجوہ کی بنا پر اُنہیں ملتوی کر دیا گیا'' (صفحہ 55)۔

باب دوم میں ضیا کا شب خون اور اُن کا دورِ اقتدار پڑھیں۔

کلچر کے باب میں تاریخی اور موجودہ حقائق کو مسخ کرنے کی دو مثالیں: ''آزادی سے پہلے جنوبی ایشیا کے شمالی علاقوں میں عوام کی زبان اردو تھی، اور ابھی بھی ہے''؛ ''موجودہ دور میں اردو بہت ترقی کر رہی ہے، اور اس میں تمام مضامین اور علوم پر کتابیں لکھی گئی ہیں''؛ ''قومی زبان کی جڑیں قومی روایات، اقدار اور افکار میں پیوست ہیں، اور زبان ان کی نمائندگی کرتی ہے۔ تمام آزاد ممالک کے لوگ اپنی زبان بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم نے غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزی کو اپنی قومی زبان بنانے کی کوشش کی تو ہم دنیا بھر میں مذاق کا نشانہ بن جائیں گے۔ اسی طرح کسی علاقائی زبان کو بھی یہ مقام نہیں دیا جا سکتا'' (صفحات 142-141)؛ ''قومی لباس قومی شناخت کی علامت ہے۔ ہر باوقار قوم کے لوگ اپنے قومی لباس پر ناز کرتے ہیں۔ چند سال قبل ہمارے ملک میں ایک صدارتی فرمان کے ذریعے تمام سرکاری دفاتر میں، اور اہم مواقع پر قومی لباس پہننا لازمی قرار یا تھا۔ اس پر اب عمل کیا جا رہا ہے۔ ہمارا قومی لباس شلوار قمیض، کرتہ اور شیروانی، اور جناح ٹوپی ہے'' (صفحہ 147)۔

اردو اور قومی لباس پر باب دوم میں پڑھیے۔

مطالعہ پاکستان، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ نواں ایڈیشن، مارچ 1989ء۔ مصنفین: ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، جاوید اقبال اور غلام عابد خان۔ ایڈیٹرز: پروفیسر محمد اسلم اور محمد سلیم اختر۔ نگران: حفظہ جاوید اور سبط حسن۔ تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔

تعداد اشاعت: 171,000 کاپیاں۔

ہندوستان پر مسلم حکومت کے لیے پانچ صفحات ہیں (13-9)۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ''برصغیر میں مسلمان حکمرانوں نے اپنے انتظامی نظام کو اسلام کے اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا تھا، چنانچہ اُن کا دورِ اقتدار غیر مسلم حکمرانوں کی نسبت زیادہ مقبول تھا'' (صفحات 10-9)؛ یہ کہ ''مقامی افراد نے مسلمانوں کا، لباس، خوراک اور رہن سہن اختیار کرلیا'' (صفحہ 10)؛ نیز ''انگریز برصغیر میں تجارت کی غرض سے آئے، لیکن اُنھوں مکارانہ حربے اور طاقت کا استعمال کیا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی سے مسلم دورِ اقتدار ختم ہوگیا'' (صفحہ 13)۔

کیا انڈیا کے ہندو اپنے مقامی ہم مذہب حکمرانوں کی نسبت مسلم حملہ آوروں کی حکومت پسند کرتے تھے؟ کیا اُن کا ہیرو محمود غزنوی تھا؟ جہاں تک مسلم دور کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے تو کیا اکبر کی حکومت شریعت کے مطابق تھی؟ کلچر کے معاملات میں ہندوؤں نے نہ مسلمانوں کا لباس اپنایا نہ خوراک۔ نہ اُنھوں نے شلوار پہنی اور نہ ہی گائے کا گوشت کھایا۔

1906-1947 تک کے دور کے لیے بیس صفحات مختص کیے گئے ہیں (صفحات 30-15)، اور ان صفحات میں ہمیں علم اور معلومات کے مندرجہ ذیل گوہر پارے ملتے ہیں:

''1930ء میں اقبال نے الہ آباد میں برِصغیر کے سیاسی مسائل کا حل تجویز کیا: مسلمانوں کی اپنی ایک الگ ریاست ہونی چاہیے'' (صفحہ 21)۔

اقبال نے ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

تیئیس مارچ 1940ء کو قراردادِ لاہور یا پاکستان میں مطالبہ کیا گیا کہ ''مسلمانوں کے پاس اپنا وطن ہونا چاہیے'' (صفحہ 22)۔ تاریخ اور مطالبہ دونوں غلط ہیں۔ باب نمبر 2 میں وضاحت کی گئی ہے۔

''1947ء میں لارڈ اٹلی برطانیہ کے وزیراعظم تھے'' (صفحہ 26)۔

1947ء میں برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر اٹلی تھے۔ پروفیسر زکسی کو لارڈ کا خطاب دینے کا قانونی حق نہیں رکھتے۔ وہ یہ بھی پیش گوئی کا حق نہیں رکھتے کہ اٹلی کئی سال بعد ارل بن جائیں گے۔ مستقبل کا علم صرف خدا کے پاس ہے۔

''قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت برپا کردی''(صفحہ 27)۔

کیا مغربی پنجاب اور سندھ میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر قیامت برپا نہیں کی تھی؟ پہلا گروہی فساد راولپنڈی میں ہوا تھا، اور اس میں نشانہ بننے والے افراد سکھ تھے۔

''پنجاب نے قومی تحریک میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ شروع میں مسلمان رہنما اپنے ذاتی مفاد کے لیے مسلم لیگ سے دور رہے، کیونکہ اُن کے انگریزوں سے روابط تھے، اور اُنھوں نے یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ لیکن پنجاب کے عوام نے پاکستان کے مطالبے کی بھرپور حمایت کی۔ اس کے نتیجے میں یونینسٹ رہنما اپنے نظریات تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے''(صفحہ 29)

پنجاب یونینسٹ پارٹی پر باب دوم میں بحث کی گئی ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ پر: ''یحییٰ خان کی فوجی حکومت نے ملک میں پہلے عام انتخابات دسمبر 1970ء میں کرائے تاکہ منتخب شدہ نمائندے ملک کا پہلا آئین تشکیل دے سکیں۔ انتخابات کے بعد ملک سیاسی بحران کا شکار ہو گیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر ملکی دشمنوں نے پاکستان کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ انڈیا نے بنگالیوں کی ایک فوج، مکتی باہنی تخلیق کی۔ اس کے ذریعے مشرقی پاکستان میں شورش برپا کی گئی۔ بعد میں مکتی باہنی کی مدد کے بہانے انڈیا کی فوج مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں مشرقی صوبہ پاکستان سے الگ ہو گیا''(صفحہ 40)۔

میں نے مشرقی پاکستان کی شورش باب دوم میں بیان کی ہے۔

''دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں ایک سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے زیادہ تر ممالک میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کسی ملک میں بولی جانے والی تمام زبانیں اس کی ثقافت کا حصہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایک قومی رابطے کی زبان ہوتی ہے؛ جسے قومی زبان کہتے ہیں''(صفحہ 110)۔

''اردو کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ دیگر زبانوں کے الفاظ آسانی سے اپنے اندر سمو لیتی ہے''(صفحہ 111)۔

اردو کے بارے میں بلند و بانگ دعووں کی حقیقت باب دوم میں۔

مطالعہ پاکستان، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو۔ چوتھا ایڈیشن۔ ستمبر 1989ء۔ مصنفین: پروفیسر سید قوی احمد، پروفیسر ڈاکٹر قاضی شکیل احمد، پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن شیخ، پروفیسر انوار احمد زائی، اور پروفیسر رفیق احمد دھامانی۔ تعداد اشاعت: 15,000 کاپیاں۔

1857ء کی بغاوت کو ''جنگ آزادی'' کہا گیا ہے (صفحہ 11)۔ اقبال نے 1930ء میں ایک مسلم ریاست کے قیام کی وکالت کی (صفحہ 17)۔ قرار داد لاہور میں مطالبہ کیا گیا کہ ''مسلمانان برصغیر کا ایک الگ وطن ہو'' (صفحہ 27)۔ 1971ء میں ''انتخابات کے بعد ملک سیاسی بحران کا شکار ہو گیا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکی دشمنوں نے پاکستان کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ انڈیا نے بنگالیوں کی ایک فوج مکتی باہنی تخلیق کی۔ اس کے ذریعے مشرقی پاکستان میں شورش برپا کی۔ بعد میں مکتی باہنی کی مدد کے بہانے انڈیا کی فوج مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں مشرقی صوبہ پاکستان سے الگ ہو گیا'' (صفحہ 33)۔ 1977ء کے شب خون پر: ''بڑھتی ہوئی سیاسی افراتفری کی وجہ سے پانچ جولائی 1977ء کو جنرل محمد ضیاالحق، آرمی چیف، نے ملک میں مارشل لا لگا دیا، اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی'' (صفحہ 37)۔

ان تمام موضوعات پر باب دوم میں بات کی گئی ہے۔

پنجابی زبان: ''بیسویں صدی کے آغاز میں پنجابی زبان میں ناول، ڈرامہ اور افسانہ لکھا جانے لگا۔ اسی دوران پنجابی صحافت کا بھی آغاز ہوا۔ اس کے بعد پنجابی زبان میں نئے موضوعات، جیسا کہ فن، فلاسفی، تاریخ، لسانیات، معاشیات، جغرافیہ، طب اور قانون وغیرہ پر لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ آج اس زبان میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شاہکار ایک بڑی تعداد میں ملتے ہیں'' (صفحات 117-118)۔

یہ پڑھنے کے بعد میں نے اپنے دوستوں اور واقف کاروں سے دریافت کیا؛ پبلشروں اور کتابیں فروخت کرنے والوں سے رابطہ کیا؛ جامعہ پنجاب کے شعبہ پنجابی کے سٹاف سے بات کی اور

لاہور کی اہم سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانوں میں گیا۔ تمام تر تحقیق کے باوجود مجھے اس زبان میں عامیانہ ادبی تحریوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ میں پنجابی میں معاشیات، فلاسفی، طب اور قانون پر آج بھی کتابیں دیکھنے کا متمنی ہوں۔ یہ شہ پارے سندھی پروفیسرز کی خیالی دنیا میں مل جائیں تو اور بات ہے، حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔

''اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں دنیا کی ہر زبان کے الفاظ مل جاتے ہیں۔ یہ اس زبان کی ایک خوبی ہے کہ جب یہ کسی دوسری زبان کا لفظ مستعار لیتی ہے تو اُنہیں اپنے اندر سمو لیتی ہے (صفحہ 119)۔

اس پر باب دوم میں بات کی گئی ہے۔

''پاکستان کا قومی لباس سادہ اور باوقار ہے۔ آدمی شلوار قمیص یا کرتہ، شیروانی اور پگڑی یا ٹوپی پہنتے ہیں۔ عورتیں عام طور پر شلوار، قمیص اور دوپٹہ پہنتی ہیں۔

اب پر باب دو میں بحث کی گئی ہے۔

مطالعہ پاکستان: سوالاً جواباً، سید منیر علی جعفری، گردیزی پبلشرز، کراچی، پہلا ایڈیشن۔ مارچ 1986

یہ ایک امدادی کتاب ہے، جو نہم جماعت کے طلبہ کے لیے آسان بنائی گئی ہے۔ کتاب کے پبلشر سید عبدالغفار گردیزی کا ایک بیان مصنف کو ایک ادیب، صحافی اور ملک کا مایہ ناز شاعر اسلام قرار دیتا ہے (صفحہ 4)۔

کچھ بیانات: سر سید احمد خان نے ''مسلمانوں کے لیے علی گڑھ میں ایک سکول 1878ء میں قائم کیا'' (صفحہ 33)۔ سید امیر علی نے ''محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ میں قائم کی'' (صفحہ 35)۔ شملہ وفد نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو نئی کونسلز میں اُن کی آبادی کی مناسبت سے نمائندگی دی جائے'' (صفحہ 39)۔ نہرو رپورٹ 1938ء میں آئی (صفحہ 44)۔

ایم اے او سکول علی گڑھ چوبیس مئی 1875ء میں قائم ہوا، نہ کہ 1878ء میں۔ سید امیر علی کی پارٹی ''سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن'' کہلاتی تھی۔ نہرو رپورٹ میں 1928ء میں، نہ کہ

1938 میں شائع ہوئی۔

جب سر سید احمد خان مسلمانوں سے سیاست سے الگ رہنے کا کہہ رہے تھے تو جناح انڈین نیشنل کانگرس کے رکن تھے (صفحہ 49)۔'' اقبال نے الہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کیا، اور 1940ء میں قراردادِ پاکستان میں ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا گیا (صفحہ 49)۔قرارداد تیئس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی (صفحہ 50)۔قرارداد میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ملک کی تخلیق کا مطالبہ کیا گیا (صفحہ 51)۔''

حقیقت یہ ہے کہ جب سر سید احمد خان مسلمانوں کو سیاست سے الگ رہنے کا مشورہ دے رہے تھے تو مسٹر جناح ایک بارہ سالہ طالب علم تھے۔اقبال نے الہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش نہیں کیا تھا۔قراردادِ لاہور میں کہیں بھی ایک مسلم ریاست یا ایک آزاد وطن کا ذکر نہیں۔یہ '' آزاد ریاستوں'' کا ذکر کرتی ہے۔مزید تفصیل باب دوم میں۔

''ملک کا آئین بنانے میں کیوں تاخیر ہوئی؟ اس کی وجوہات ملک کے سیاست دان بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ابھی پاکستان آزاد ہوا ہی تھا کہ سیاسی سازشوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا، اور خود غرض عناصر مفاد پرستی میں مگن ہو گئے'' (صفحہ 60)۔

کیا جناح اور تحریکِ پاکستان میں اُن کے ساتھی اسی سازش کا حصہ تھے؟

''محمد بن قاسم کے ساتھ جنوبی ایشیا میں اسلامی دور کا آغاز ہوا، جو ایک ہزار سال تک جاری رہا۔اس کا اختتام 1857 کی جنگِ آزادی پر ہوا'' (صفحہ 144)۔

محمد بن قاسم نے 712ء میں جنوبی ایشیا کو نہیں، اس کے ایک چھوٹے سے کونے کو فتح کیا تھا۔اس کے تین سو سال بعد محمود غزنوی نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔712ء کے بعد سے ایک ہزار سال تک پورے برِصغیر پر مسلم حکومت کا تسلسل تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیہ کا بھی خون ہے۔ 1857ء جنگ آزادی نہیں، ایک بغاوت تھی۔مزید تفصیل باب دوم میں۔

اسلامی دور 1857ء سے کئی عشرے پہلے ختم ہو چکا تھا جب مغل بادشاہ انگریزوں سے پنشن وصول کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔

''پاکستان اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا۔چنانچہ اس کی ثقافت کی بنیاد قدرتی طور پر اسلامی

اقدار ہیں۔ تاہم یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ ملک میں ابھی بھی لوگوں کا ایک طبقہ مغربی طرزِ زندگی اپنانے پر مُصر اور اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنے سے گریزاں ہے۔ ایسے لوگوں کو نادان ہی کہا جا سکتا ہے" (صفحہ 145)۔

اس "ایک طبقے" کی وضاحت نہیں کی گئی۔ کیا یہ مغرب زدہ، تعلیم یافتہ اشرافیہ ہے جو ملک کا نظم ونسق چلاتی ہے؟ کیا یہ فوج ہے یا بزنس اور کاروباری افراد؟ کیا یہ سکول، کالج یا سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں؟

"پنجاب کے لوگ پنجابی بولتے ہیں، اور اُن کا مخصوص لباس شلوار پگڑی ہے" (صفحہ 145)۔

یہ "معلومات" بھی ویسی ہی ہیں جیسے یہ کہنا ہے کہ فرانس کے لوگ فرانسیسی، یا یونان کے لوگ یونانی بولتے ہیں۔ اگر اُن کا مخصوص لباس شلوار اور پگڑی ہے تو شلوار اور پگڑی کے درمیان جسم کا جو حصہ مبینہ طور پر بچ جاتا ہے کہ وہاں کیا پہنتے ہیں؟ میں ایک پنجابی ہوں، لیکن میں نے اپنے صوبے میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے سر پر پگڑی باندھی ہوئی ہو اور جسم کے نچلے حصے پر شلوار پہنی ہوئی ہو، اور اسی اہتمام کو کافی سمجھتے ہوئے جسم کا باقی حصہ ڈھانپنے کی مطلق ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے "مخصوص لباس" کہا گیا ہے۔ اگر یہ مخصوص ہے تو کیا عام طور پر وہ بےلباس رہتا ہے؟

"اردو کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ نہ صرف جنوبی ایشیا کے ہر کونے میں بولی جاتی ہے بلکہ اسے جاننے اور سمجھنے والے پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اردو بتدریج ترقی کرتے ہوئے اس پوزیشن میں آ گئی ہے جہاں اس کا شمار دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں ہونے لگا ہے۔ صرف یہی نہیں، عربی کے بعد اردو دنیا کی وہ زبان ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ درحقیقت اردو کے سامنے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں اپنی مقبولیت اور اہمیت کھو رہی ہیں" (صفحہ 147)۔

دو دعوے توجہ کے لائق ہیں۔ پہلا دعویٰ کہ عربی وہ زبان ہے جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ افسوس، مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ کس حوالے سے؟ شاید بے پناہ مصروفیات آڑے آئی ہوں۔ موصوف شاعرِ اسلام ہیں اور پورے پاکستان کو اُن پر ناز ہے، لیکن یہاں قدرے جلد بازی کر گئے، کیونکہ بقول

اُن کے اردو کا اس صف میں دوسرا نمبر ہے۔ وجہ بتا دیتے تو اچھا تھا۔ خیر اس نسیان کی تلافی اُنھوں نے یہ دل خوش کن خبر سناتے ہوئے کر دی کہ اردو مقبولیت میں انگریزی اور فرانسیسی کو پیچھے چھوڑ رہی ہے۔ شاید کسرنفسی سے کام لے گئے، ورنہ کھل کر بتا دیتے کہ انگریز اور فرانسیسی اپنی زبانوں کا بوریا بستر لپٹتا دیکھ کر اردو سیکھنے کے لیے کمر بستہ ہیں۔

مطالعہ پاکستان : سوالاً جواباً۔ مصنف : محمد انعام الدین، بی کام، بی ایڈ۔ مکتبہ اعظمیہ، کراچی۔

نویں اور دسویں جماعت کے لیے تجویز کردہ اس کتاب میں مندرجہ ذیل معلومات ہیں۔

''اقبال نے 1930ء میں ''لکھنو'' میں مسلم لیگ ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا'' (صفحہ 28)۔ قرار دادِ لاہور میں ''تیئس مارچ 1940ء کو ایک آزاد ملک کا مطالبہ کیا گیا'' (صفحہ 28)۔ جنرل ایوب خان نے اکتوبر 1958ء کو اقتدار سنبھالا کیونکہ ملک کے سیاست دان اور حکمران عام انتخابات کو التوا میں ڈال رہے تھے (صفحہ 38)۔ ''ایوب خان نے اپنے خلاف چلنے والی ایک عوامی احتجاجی تحریک کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا اور اقتدار یحییٰ کو سونپ دیا... دسمبر 1971ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے، تاکہ منتخب شدہ نمائندے آئین سازی کر سکیں۔ انتخابات کے بعد پاکستان غیر ملکی سازشوں کی وجہ سے سنگین بحران کا شکار ہوگیا۔ اس افراتفری کے عالم میں دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا'' (صفحہ 39)۔

اقبال نے لکھنو میں نہیں، الہ آباد میں خطاب کیا تھا۔ اور اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے کسی الگ وطن کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اگر وہ لکھنو میں خطاب کرتے تو شاید وہاں الگ وطن کی بات کر دیتے، کیونکہ جگہ کا انسان پر اثر ہوجاتا ہے۔ ایوب خان نے ملک کے پہلے عام انتخابات کے موقع پر حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ کس قانون یا آئین کے تحت ایوب نے ریپبلک کے صدارتی اختیار کو ایک حاضر سروس آرمی چیف کو سونپ دیا؟ مشرقی پاکستان افراتفری کے عالم میں الگ نہیں ہوا تھا۔ اس کے الگ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ بنگال کے پاکستانی پاکستان سے تنگ آ گئے تھے۔ اُس وقت پاکستانی فوج بہت جبر کر رہی تھی، اور پھر پاک فوج کو انڈیا سے شکست ہوگئی۔ اُس صورتِ حال کو بیان کرنے کے

لیے دیگر بہت سے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں، افراتفری نہیں۔ ذلت آمیز شکست، خانہ جنگی، قومی سانحہ یا ایسے دیگر الفاظ استعمال کیجیے۔

''اردو ہمارے ثقافتی ورثے کا حصہ ہے۔ اردو وہ واحد زبان ہے جو پشاور سے لے کر راسکماری تک بولی جاتی ہے۔ اردو اتنی قدیم نہیں جتنی عربی، انگریزی اور سنسکرت، لیکن اس کی ایک منفرد خوبی ہے کہ یہ دیگر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمو سکتی ہے'' (صفحہ 106)۔

اردو کے بارے میں فسانہ طرازی پر گزشتہ صفحات میں بات کی ہے، مزید باب دوم میں پڑھیے۔ یہاں میں صرف ایک سوال پوچھتا ہوں: کیا اردو بلوچوں، سندھیوں، پٹھانوں، اور حتیٰ کے پنجابیوں کے ثقافتی ورثے کا حصہ ہے؟ کراچی کے مسٹر انعام الدین کو یہ تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے کہ کراچی کا اردو بولنے والا طبقہ پورے پاکستان ایک جزو ہے، کُل نہیں؟ ''بیسویں صدی کے آغاز میں پنجابی زبان میں ناول، ڈرامہ اور افسانہ لکھا جانے لگا۔ 1920ء کے بعد پنجابی زبان میں فن، فلاسفی، تاریخ، لسانیات، معاشیات، جغرافیہ، طب اور قانون وغیرہ پر کتابیں لکھی گئیں۔ آج اس زبان میں ایسی نگارشات اور ادبی شاہکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے'' (صفحہ 108)۔

اس موضوع پر گزشتہ صفحات میں بات کر چکا ہوں۔

ہائیر سیکنڈری لیول: اردو میڈیم

مطالعہ پاکستان، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جامشورو۔ پہلا ایڈیشن، اگست 1989۔ ایک کثیر تعداد میں مصنفین۔ ایڈیٹرز: محمد سلیم اختر۔ سینئر ماہر مضمون: مسز حفظہ جاوید۔ ماہر مضمون: سبط حسن۔ منظور شدہ حکومت سندھ برائے سیکنڈری تعلیم کراچی، حیدر آباد اور سکھر۔ تعداد اشاعت: 10,000 کاپیاں۔

اس کا مواد این ڈبلیو ایف پی کے منظور شدہ مطالعہ پاکستان جیسا ہے۔

مطالعہ پاکستان، این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور۔ ہر باب مختلف مصنف کا تحریر

کردہ ہے۔ ایڈیٹرز: محمد سلیم اختر۔ سینئر ماہر مضمون: مسز حفظہ جاوید۔ ماہر مضمون: سہیلہ حسن۔ تعداد اشاعت: 15,000 کاپیاں۔

باب اول، قیام پاکستان تحریر کردہ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، (صفحات 32-1)۔ ''مسلمان اپنی فطرت کے اعتبار سے آزادی پسند ہیں۔ وہ کسی کی غلامی پسند نہیں کرتے۔ انگریز راج کے دوران وہ آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے'' (صفحہ 7)۔ این ڈبلیو ایف پی کی جدید تاریخ میں سرخ قمیض تحریک یا کانگرس کا کوئی ذکر نہیں (صفحہ 11)۔ پنجاب کے ذکر میں یونینسٹ پارٹی غائب ہے (صفحات 14-13)۔ ''اقبال وہ پہلے شخص تھے جنھوں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 14)۔ ''1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ ہوگیا'' (صفحات 16-15) ''انڈین نیشنل کانگرس صرف ہندوؤں کے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہی تھی'' (صفحہ 16)۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے اغراض و مقاصد میں انگریز سرکار سے وفاداری کے عہد کو کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے (صفحہ 17)۔ لکھنو پیکٹ نے مسلمانوں کی اہمیت میں اضافہ کیا (صفحہ 18)۔

اگر مسلمان کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے تو طلبہ کو اس طے شدہ تاریخی حقیقت کے بارے میں کیا بتایا جائے کہ ایک طویل عرصہ تک ترکی کے سوا تمام اسلامی دنیا پر یورپی استعمار چھایا ہوا تھا۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمان کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے تو اُنھوں نے اپنی تمام تاریخ میں دوسروں پر غلامی مسلط کیوں کی تھی؟ کیا مسلمانوں کا ضابطہ اخلاق حالات کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے؟ اقبال سے منسوب کردہ مطالبے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ 1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی نہیں تھی۔ کانگرس نے ہندوستانی عوام کی اکثریت، نہ کہ صرف ہندوؤں کے لیے، جدوجہد کی تھی۔ لکھنو پیکٹ نے مسلمانوں کی اہمیت میں اضافہ نہیں کیا تھا، صرف پنجابی اور بنگالی مسلمانوں کو اپنے صوبوں میں حکومت کرنے کا حق دے دیا تھا۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

باب دوم، تاریخ پاکستان تحریر کردہ پروفیسر یار محمد، (صفحات 55-32)۔ یہ باب ہمیں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرتا ہے: ''قرارداد لاہور تیئس مارچ 1940ء کو منظور کی گئی تھی'' (صفحہ 33)۔ جنگ کے بعد برطانیہ میں لیبر پارٹی ''لارڈ اٹلی'' کی قیادت میں اقتدار میں

آگئی (صفحہ 35)۔'' برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے ایک منظم طریقے سے پورے بھارت، خاص طور پر مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انسانیت کے دشمنوں، ہندوؤں اور سکھوں نے ہزاروں خواتین کی بے حرمتی کی، ہزاروں بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو نہایت سفاکی سے شہید کیا گیا''۔ (صفحات 41-40)۔

قرار دادِ لاہور کی تاریخ 24 مارچ ہے۔ مسٹر اٹلے جب 1945ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے تو وہ لارڈ نہیں تھے۔ 1947ء کے فسادات میں صرف ہندو اور سکھ ہی ملوث نہیں تھے۔ جہاں جہاں موقع ملا، مسلمان بھی آبرو ریزی، قتل و غارت اور لوٹ مار میں پیچھے نہیں رہے۔

باب سوم، اسلامی ریاست کا قیام، تحریر کردہ ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، (صفحات 71-56)۔ یہ باب ملکی تاریخ کے اہم واقعات کی متاثر کن ملمع کاری کرتا ہے۔''1956ء آئین صرف دو سال تک فعال رہا۔ سات اکتوبر 1958ء کو فوج نے جنرل (بعد میں فیلڈ مارشل) محمد ایوب کی قیادت میں اقتدار سنبھال لیا'' (صفحہ 59)۔ ایوب نے ''پچیس مارچ 1969ء کو استعفیٰ دے دیا، اور اپنا اختیار کمانڈر انچیف، جنرل محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دیا'' (صفحہ 61)۔'' قبل اس کے کہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے والی اہم سیاسی جماعتیں نیا آئین بناتیں، کچھ اندرونی اور بیرونی عناصر نے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کی سی صورتِ حال پیدا کر دی، جو بعد میں پاک بھارت جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں سولہ دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا'' (صفحہ 62)۔'' جب حکومت اور پاکستان نیشنل الائنس کے درمیان کوئی معاہدہ طے نہ پاسکا، اور ملک کی سیاسی صورتِ حال خراب ہونے لگی تو پانچ جولائی 1977ء کو فوج نے جنرل محمد ضیا الحق کی قیادت میں ملک کا اقتدار سنبھال لیا'' (صفحہ 65)۔''1977ء میں نظامِ مصطفیٰ تحریک کے دوران یہ بات واضح ہوگئی کہ پاکستان کے عوام فوری طور پر مکمل اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں'' (صفحہ 66)۔

فاضل مصنف نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ ایوب نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے کیا کیا غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہتھکنڈے اپنائے تھے۔ نیز یہ بھی نہیں بتایا کہ ایوب نے کس قانون کے تحت 1969ء میں اپنی آئینی اتھارٹی ایک حاضر سروس آرمی چیف کو سونپ دی تھی؟ بنگلہ دیش کے قیام کا یہ یک طرفہ بیانیہ ہے۔ اسے معلومات ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ مصنف نے جنرل ضیا کے اقتدار اور تحریک

نظامِ مصطفیٰ کی طرف اپنے فطری میلان کو چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کی۔

باب پنجم، پاکستانی ثقافت، تحریر کردہ صاحبزادہ عبدالرسول (صفحات 122-98)۔ ہماری ثقافت کے بانی محمد علی جوہر، شوکت علی، محسن الملک، وقار الملک، سر سید احمد خان، شبلی، ذکا اللہ اور حالی بتائے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں علی گڑھ تحریک، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ندوۃ العلوم کا ذکر ہے۔ یوپی اور دہلی کے باہر سے بمشکل ایک شخص اس فہرست میں جگہ پانے میں کامیاب ہوا ہے، اور وہ علامہ اقبال ہیں (صفحات 110-109)۔ اقبال کا 1930ء کا خطبہ اور اُن کے 1937ء میں محمد علی جناح کے نام لکھے گئے خطوط کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے (صفحہ 111)۔ پاکستان کا قومی لباس ''شلوار، قمیص یا کرتہ، شیروانی اور ٹوپی یا پگڑی آدمیوں کے لیے، جبکہ خواتین کے لیے شلوار، قمیص اور دوپٹہ'' (صفحہ 113)۔ ''اسلام میں شادی عبادت کا درجہ رکھتی ہے'' (صفحہ 118)۔

کتاب کے مطابق اقبال کے علاوہ پاکستانی ثقافت کے تمام بانیوں کا تعلق دہلی اور یوپی سے تھا۔ گویا پاکستان اور بنگال کے جغرافیائی خطوں نے ہماری ثقافت تعمیر کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ تو کیا فکری، تہذیبی، علمی ادبی اور سماجی اور ثقافتی اعتبار سے یہ خطہ بانجھ اور خشک ہے؟ بلوچ لوک شاعری، لوک داستانیں، پٹھان شاعری، پشتو ادب، خوشحال خٹک، سندھی لکھاری، اسلامیہ کالج پشاور، سندھ مدرسۃ الاسلام، خدائی خدمتگار سماجی تحریک، انجمن حمایتِ اسلام، لاہور، انجمن اسلامیہ، امرتسر، پنجاب اردو پریس، شیخ سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان، اورینٹل کالج، لاہور، حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور، احمد شاہ بخاری پطرس، گورنمنٹ اور اسلامیہ کالج، لاہور، اور پھر پنجاب کی جدید اردو شاعری، سعادت حسن منٹو، لاہور کے مشہور ادبی رسالے، میاں بشیر احمد کا 'ہمایوں'، وارث شاہ سے لے کر استاد دامن تک پنجابی کلاسیکی شاعری، اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے سندھ کی فارسی شاعری۔۔۔ یہ اور بہت کچھ اور بھی مصنف کی نظر سے اوجھل رہا۔ یہ کور چشمی اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ یہ بے بصری آمد نہیں، آورد معلوم ہوتی ہے۔ اگر پروفیسر نے ایسی صریح حماقت کر دی تھی تو کتاب پر نظرِ ثانی کرنے والے تین ماہرین مضمون کیا کر رہے تھے؟ اُن کی آنکھ پر کس نے پردہ ڈال رکھا تھا؟

ہم ایڈیٹرز کی طرف سے اس بیانیے کی متفقہ منظوری سے ایک اور نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ، این ڈبلیو ایف پی، اور وفاقی وزارتِ تعلیم اور حکومت اس سوچ کے ساتھ

گھڑی ہے۔ اس سے یہی تصور ارزاں ہوتا ہے کہ پاکستانی ثقافت مجموعی طور پر بیرونی علاقوں سے لا کر ملک پر مسلط کر دی گئی تھی؛ اس کا سرزمین اور قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ برطانوی استعمار کی جگہ یو پی کے استعمار نے لے لی۔ ہم ابھی بھی غیر ملکی ثقافت اور نو آبادیاتی دور میں رہ رہے ہیں۔ اس طرح حکومت پاکستان وہ کچھ کرنے جا رہی ہے جو انگریز حکمران بھی نہیں کر پائے تھے۔

بعض وجوہ کی بنا پر یہ درسی کتاب اتنی اہم سمجھی جاتی ہے کہ سندھ ٹیکسٹ بورڈ نے بھی اسے اپنے تعلیمی اداروں کے لیے منظور کر لیا۔ سندھ نے اس میں جو واحد تبدیلی کی، وہ اس پر تاریخ، اگست 1989ء درج کر دی۔ این ڈبلیو ایف پی کی کتاب پر کوئی تاریخ درج نہیں تھی۔ کچھ طلبہ، اور اُن کی تعداد کم نہیں ہوگی، ان مختصر درسی کتب کو بھی استعمال نہیں کرتے۔ وہ گائیڈز، خلاصے، اور امدادی مواد اور سوال و جواب پر مشتمل نوٹس استعمال کرتے ہیں۔ یہ مواد مندرجہ بالا درسی کتب کی مدد سے ''تیار'' کیا جاتا ہے۔ نمونے کے طور پر اب میں ان میں سے چند ایک کی جانچ کرتا ہوں۔

یونیورسل ماڈل ٹیسٹ پیپرز: اسلامیات (لازمی) ومطالعہ پاکستان (لازمی) برائے طلبہ انٹرمیڈیٹ 1988-1987، ماہرین تعلیم وامتحانات کا مرتب کردہ، بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، پاکستان، شائع کردہ کشمیری کتاب گھر ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور۔ مصنف: ایس اے بخاری، ایم اے۔ لاہور، ملتان، سرگودھا، بہاولپور، راولپنڈی، آزاد کشمیر، پشاور، حیدرآباد، کوئٹہ اور گوجرانولہ بورڈز کی نئے نصاب کے مطابق تیار کردہ۔

حصہ دوم (صفحات 276-156) مطالعہ پاکستان کے متعلق ہے۔ اس کے مواد سے مندرجہ ذیل کچھ مثالیں:

''1940ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلمانان برصغیر نے اپنے لیے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 161)۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تھا، نہ کہ مسلمانوں کا کوئی جلسہ۔ اور اس میں کسی الگ ریاست کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

این ڈبلیو ایف پی کے پیراگراف میں سرخ قمیص تحریک یا کانگرس کا کوئی ذکر نہیں (صفحہ 162)

پنجاب کے ذکر سے یونینسٹ پارٹی غائب ہے (صفحہ 164)۔

"1885ء میں ایک انگریز مسٹر ہیوم نے کانگرس کی بنیاد رکھی تھی۔ اس پارٹی نے ہندوؤں کے حقوق کے لیے جدوجہد کی" (صفحہ 165)۔ کانگرس کی بنیاد نہ تو ہیوم نے رکھی تھی، اور نہ ہی یہ ہندوؤں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی پارٹی تھی۔

مسلم کے قیام کے اغراض و مقاصد کی طویل فہرست میں سے انگریز سرکار سے وفاداری کا وعدہ غائب ہے (صفحہ 165)۔ لکھنو پیکٹ کے تحت "مسلمان یقیناً صوبائی اسمبلیوں میں نشستیں مختص کرنے کا حق کھو بیٹھے، لیکن وہ کانگرس سے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس نے انہیں ایک الگ قوم تسلیم کرلیا۔ یہ مسلم لیگ کی ایک بڑی کامیابی تھی" (صفحہ 170)۔ لکھنو پیکٹ پر دستخط کرتے ہوئے کانگرس نے مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم نہیں کرلیا تھا۔ باقی تفصیل باب دوم میں۔

1930ء میں اقبال نے تجویز پیش کی کہ "انڈیا کو مختلف نیم خود مختار خطوں میں تقسیم کردیا جائے" (صفحہ 173)۔ اقبال نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

"یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ 1940ء کی قرارداد (لاہور) نے شمال مشرق اور شمال مغرب میں دو مسلمان ریاستوں کے قیام کا تصور پیش کیا تھا۔ بعد میں 1946ء میں دہلی میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک اور قرارداد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ صرف ایک ہی ریاست چاہتی ہے، جس کا نام مملکتِ پاکستان ہوگا (صفحہ 175)۔ قراردادِ لاہور میں دو مسلم ریاستوں کا مطالبہ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ دہلی اجلاس، جس میں قراردادِ لاہور میں (غیر قانونی طور پر) ترمیم کی گئی، وہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس نہیں، بلکہ انڈین دستور ساز اسمبلی، انڈین کونسل آف اسٹیٹ اور صوبائی کونسلز اور اسمبلیوں میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ارکان کی ایک میٹنگ تھی۔" قراردادِ لاہور میں ترمیم کا حق نہیں رکھتے تھے۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

"قراردادِ لاہور تیئیس مارچ 1940ء کو منظور کی گئی" (صفحہ 182)۔ اصل تاریخ چوبیس مارچ ہے، تیئیس مارچ نہیں۔

1945ء میں انگلینڈ میں لیبر پارٹی لارڈ اٹلے کی قیادت میں اقتدار میں آئی (صفحہ 183)۔ اس وقت اٹلے لارڈ نہیں تھے۔

1958ء کے شب خون کے 9 عوامل بتائے گئے ہیں، لیکن فوج کے کردار اور ایوب خان کے عزائم کا کوئی ذکر نہیں ملتا (صفحات 195-194)۔

1970ء کے عام انتخابات کے بعد ''دونوں اہم سیاسی جماعتوں کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ جاری تھا جب انڈیا کے بھڑکانے پر کچھ تخریبی عناصر نے مشرقی پاکستان میں بدنظمی پھیلانا شروع کر دی۔ جب حالات پر قابو پانے کے لیے پاکستان نے اقدامات اٹھائے تو کسی بہانے بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس طرح دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا'' (صفحہ 200)۔

'' قبل اس کے کہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے والی اہم سیاسی جماعتیں نیا آئین بناتیں، کچھ اندرونی اور بیرونی عناصر کی سازش نے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کی سی صورتِ حال پیدا کر دی، جو بعد میں پاک بھارت جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں سولہ دسمبر 1971ء مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا'' (صفحہ 201)۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عوامل باب دوم میں دیکھیے۔

جنرل ضیاالحق کے اسلامی کارنامے: ''عریانی، فحاشی اور دیگر اخلاقی خرابیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے سخت قوانین نافذ کیے گئے ہیں۔ چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلمی صنعت اور پریس کو اسلامی رجحانات اور روایات کو فروغ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر باقاعدگی سے آذان، قرآن پاک کی تلاوت، عربی اور اسلامی ثقافت کے پروگراموں کا سلسلہ متعارف کرایا گیا ہے۔ سرکاری دفاتر میں نماز باجماعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔۔۔ حکومت نے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے خصوصی کوشش کی ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے گروہی، نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات پیدا نہ کر سکے۔ منافرت پھیلانے والی تحریر اور تقریر کے خلاف سخت ایکشن لیا جا رہا ہے؛ جبکہ اس دوران اسلامی رواداری کی بھی ترویج کی جا رہی ہے۔ حکومتی نظام اور انتخابی عمل کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے ان میں ضروری تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے مجلس شوریٰ کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ملک میں مکمل اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں قابل قدر اقدامات اٹھائے

گئے ہیں۔ مستقبل میں مزید اقدامات بھی متوقع ہیں۔ ان سے ملک میں وہ اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا جس کا خواب بانیان پاکستان نے دیکھا تھا'' (صفحات 207-206)۔

نیا دور پر باب دوم میں بات کی گئی ہے۔

1920 ء میں ہندوستان کے مسلمانوں نے ''اسلامی تعلیمات کے وسیع پیمانے پر نفاذ کی ضرورت محسوس کی۔ اس مقصد کے لیے جامعہ ملیہ قائم کی گئی'' (صفحہ 232)۔

مولانا محمد علی اور اُن کے کانگرس نواز ساتھیوں نے ہندوؤں کی شہ پر علی گڑھ یونیورسٹی کو تحریک عدم تعاون کا ساتھ دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کامیابی سے یونیورسٹی گاندھی کے اثر میں چلی جاتی۔ یونیورسٹی نے دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کرتے ہوئے یہ جذباتی اور احمقانہ مطالبہ رد کر دیا۔ اس پر مسلمانوں کے ایک گروہ نے علی گڑھ میں ''قوم پرست'' اور ''محب وطن'' جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی جو علی گڑھ یونیورسٹی کا حریف ہوتی۔ بعد میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ یہ کانگرس کی طرف جھکاؤ رکھنے والے مسلمانوں کا مرکز بنی رہی۔ اس کے قیام کا ''اسلامی تعلیمات کے پھیلاؤ اور ترویج'' سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں ایک ضمنی بات ریکارڈ پر آنی چاہیے کہ گاندھی اور کانگرس کے پلیٹ فارم سے عدم تعاون کی تحریک چلانے والوں نے ہندو بنارس یونیورسٹی کو عدم تعاون پر مائل کرنے یا اس دباؤ ڈالنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اُن کا مقصد انڈین قوم پرستی کے نام پر، اور تحریکِ خلافت کے بہانے علی گڑھ کو تباہ کرنا تھا۔ اس مرحلے پر مولانا محمد علی اور اُن کے ساتھیوں نے کانگرس کے ایجنٹوں کا کردار ادا کیا تھا۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ کتاب میں 1977 ء کے شب خون کا کوئی ذکر نہیں۔

درسی کتب میں ایسا مواد ذہن نشین کرنے کے بعد کوئی عجب نہیں کہ طلبہ سے سوالات بھی ایسے ہی پوچھے جائیں: ''انگریزوں نے انڈین نیشنل کانگرس کیوں قائم کی تھی؟'' (پرچہ تاریخ، ملتان بورڈ، 1987)۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ ہائیر سیکنڈری کلاسز میں سائنس اور عمرانیات گروپس کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی اور اسلامیات کے ساتھ مطالعہ پاکستان ایک لازمی مضمون ہے۔ انٹرمیڈیٹ لیول پر تاریخ ایک اختیاری مضمون ہے۔ مجھے اس مضمون کی ٹیکسٹ بک بورڈ کی شائع کردہ کوئی کتاب

نہیں ملی۔ میں نے اس مضمون پر مارکیٹ میں دستیاب کتب میں سے کچھ ایسی دکھائی دینے والی تین کتابیں منتخب کیں جن کا مواد دیگر کی نسبت قدرے وسیع ہے۔ انھیں بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ کے مجوزہ نصاب کے مطابق تیار کیا گیا ہے (بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ نویں، دسویں، اور گیارویں اور بارویں جماعتوں کے نصاب کا تعین کرنے سے لے کر امتحانات لینے اور ڈپلومہ جاری کرنے کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتا ہے)۔

تاریخ پاکستان: 1708-1977، تالیف کردہ محمد عبداللہ ملک، ایم اے، سربراہ شعبہ تاریخ، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور، شائع شدہ قریشی برادرز، لاہور، 1988-89۔

تاریخ کے مختلف ادوار کو غیر مساوی جگہ دی گئی ہے۔ 1708-1857 کو 138 صفحات، 1858-1947 کو 178 صفحات، اور 1947-1977 کو 142 صفحات دیے گئے ہیں۔ اگر اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل نکات کو اجاگر کرنا ہوگا: اگر 1857 کی بغاوت جنگ آزادی نہیں تھی تو پھر وہ واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے (صفحات 125-138)۔ سر سید احمد خان کو پاکستان کا ''حقیقی بانی'' کہنا مناسب ہوگا (صفحہ 146)۔ سر سید احمد خان اور تحریک علی گڑھ پر ایک پورا باب موجود ہے (صفحہ 139-153)۔ 1905ء میں جان مورلے کو ''پاکستان اور انڈیا کا سیکرٹری آف اسٹیٹ'' مقرر کیا گیا (صفحہ 171)۔ لکھنو پیکٹ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی (صفحہ 183-184)۔ تحریک خلافت کے دوران پیدا ہونے والا ہندو مسلم اتحاد ''انگریزوں کی سازشوں اور تفرقہ پسند ہندو گروہوں کی دشمنی'' کی وجہ سے ختم ہو گیا (صفحہ 198)۔ جب اقبال نے 1930ء میں ''ایک آزاد مسلم مملکت'' کے قیام کی سکیم پیش کی تو مسلمانوں نے اسے اپنا مقصد حیات قرار دیتے ہوئے اقبال کو اپنا رہنما بنا لیا (صفحہ 218)۔ 1937ء میں پنجاب، بنگال اور سندھ میں مسلم وزارتیں موجود تھیں۔ کانگرس ان صوبوں سے لیگ کی وزارتوں کا خاتمہ چاہتی تھی، چنانچہ اس نے لیگ کے خلاف سازش کی اور اس کی وزارتیں ختم ہو گئیں (صفحہ 224)۔ جناح 1896 میں انگلینڈ کی ''لنکن ان سے بیرسٹرایٹ لا کی ڈگری'' لے کر لوٹے (صفحہ 228)۔ جمال الدین پہلے شخص تھے جنھوں نے ایک ''مسلم جمہوری ریاست'' کے قیام کا سوچا (کہاں؟) اور ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا

''انڈیا کو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تقسیم کر دینا چاہیے؛ مسلمانوں کے پاس وندھاچل کا شمالی، اور ہندوؤں کے پاس جنوبی علاقہ ہو(شریف الدین پیرزادہ کا حوالہ دیا گیا ہے) (صفحہ 244)۔ عبدالحلیم شرر نے ہندوستان کو 'ہندو اور مسلم صوبوں' میں تقسیم کی تجویز پیش کی تھی (صفحہ 224)۔ مسلمانوں کے الگ ہونے کے جذبات کا سب سے پہلا اظہار ایک سیاسی پلیٹ فارم الہ آباد میں 1930 کے جلسے، سے کیا گیا جب اقبال نے ''مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 245)۔ چوہدری رحمت علی نے ایک اخبار جاری کیا، 'پاکستان' (صفحہ 246)۔ گول میز کانفرنس میں جانے والے مسلم لیگ کے وفد نے پاکستان سکیم کو ایک طالب علم کا منصوبہ قرار دے تھا (صفحہ 246)۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کا اجلاس فروری 1940ء کو دہلی میں ہوا، اور اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کی تخلیق کا مطالبہ لاہور کے اجلاس میں پیش کیا جائے گا (صفحہ 248)۔ قرارداد لاہور ''تیئس مارچ'' کو پیش کی گئی (صفحہ 250)۔ اقبال نے بیرسٹر آف لا کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی (صفحہ 293)۔ رحمت علی نے ایچیسن کالج سے استعفیٰ دینے کے بعد سرکاری ملازمت کی، اور انھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری لا کالج لاہور سے حاصل کی (صفحہ 304)۔ 1958ء میں ایوب کے شب خون مارنے کی آٹھ وجوہات بیان کی گئی ہیں، لیکن مجال ہے جو فوج یا جنرل کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی ہوس پر قلم کو زحمت دی گئی ہو (صفحات 252-253)۔ شب خون کو ''انقلاب'' قرار دیا گیا ہے (صفحہ 253)۔ 1965ء کی جنگ میں پاکستان نے انڈیا پر تمام محاذوں پر کاری ضرب لگائی، اور اس کی کمر توڑ دی۔ آخر کار انڈیا کے امریکی اور سوویت دوستوں کی سرتوڑ کوششوں کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے ذریعے تیئس ستمبر کو جنگ بندی عمل میں آئی (صفحہ 351-362)۔ ذوالفقار علی بھٹو کی متعارف کرائی گئی تمام اصلاحات کا مقصد پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو خوشحال کرنا تھا (صفحات 382-383)، حکمران جماعت نے انتخابات میں کھلی دھاندلی کی، جس پر عوام نے غصیلا ردعمل دیا۔ اس کے نتیجے میں ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے اور ایک خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس صورت حال پر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کی مسلح افواج نے پانچ جولائی 1977ء کو بھٹو حکومت ختم کر کے ملک کا انتظام سنبھال لیا'' (صفحہ 383)۔ ''بھٹو کے خلاف تحریک نے تمام معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا... بھٹو کی آمریت کے

خاتمے کے لیے تمام قوم سڑکوں پر آ گئی۔ حکمران جماعت نے ملک کو خانہ جنگی کے جہنم میں دھکیلنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ اس بات کے واضح شواہد مل رہے تھے کہ حکمران جماعت محض اپنے اقتدار کی خاطر ریاست دشمن عناصر کے ساتھ مل کر نظریہ پاکستان کو خطرے میں ڈالنے پر تلی ہوئی ہے۔ ان حالات میں اگر بھٹو اپنے جابرانہ اور شاطرانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دینے میں کامیاب ہو جاتے تو کون جانتا ہے آج قوم کا کیا حشر ہوا ہوتا! اس خطرے کو بھانپتے ہوئے پاکستان کی مسلح افواج نے پانچ جولائی 1977ء کو بھٹو حکومت ختم کر کے ملک کا انتظام سنبھال لیا'' (صفحہ 433)۔ ''سپریم کورٹ نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے نظریہ ضرورت کے تحت فوجی کارروائی کی توثیق کر دی۔ ملکی منظر نامہ تبدیل ہونے پر قوم نے سکون کا سانس لی (صفحہ 434)۔ نئی فوجی قیادت نوے روز کے اندر تازہ انتخابات کرانے کے لیے پرعزم تھی لیکن ''عوام کی بڑی اکثریت نے اصرار کیا کہ انتخابات سے پہلے بھٹو کے سیاہ دور کے دوران روا رکھی جانے والی خرابیوں کا احتساب ضروری ہے، تاکہ وہ جرائم پیشہ عناصر کیفر کردار تک پہنچائے جاسکیں جنہوں نے جمہوریت کی آڑ میں ملک و قوم کا خون پیا ہے۔ اس پر نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے جذبے سے سرشار اور عدل و انصاف پر یقین رکھنے والی نئی قیادت نے انتخابات کو ملتوی کرتے ہوئے پوری قوت سے احتساب کا عمل شروع کر دیا'' (صفحہ 434)۔ ''پانچ جولائی 1977ء سے پہلے اپنائی گئی خارجہ پالیسی میں بہت سی خامیاں تھیں۔ پاکستان کے مسلسل دھوکے، جھوٹ، مکر و فریب کی وجہ سے اقوام عالم کا پاکستان پر سے اعتماد ختم اٹھ چکا تھا۔ چند ایک کے سوا تمام مسلمان ممالک پاکستان سے ناراض، اور تنگ آئے ہوئے تھے۔ موجودہ فوجی حکومت نے جنرل محمد ضیاالحق کی قیادت میں ملک و قوم کا مفاد دیکھتے ہوئے خارجہ پالیسی کی سمت درست کی'' (صفحہ 440)۔

ان معروضات میں زیادہ تر غلطیوں کو باب دوم میں درست کر دیا گیا ہے۔ باقی پر یہاں بات کر لیتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ ہم سید احمد خان کو پاکستان کا ''حقیقی بانی'' کیوں تسلیم کریں؟ جان مورلے کی انڈیا آمد کے وقت (1910-1905) جب پاکستان ہی نہیں تھا تو انہیں کس طرح انڈیا اور پاکستان کے لیے سیکرٹری آف سٹیٹ بنا کر بھیجا گیا؟ 1937ء میں پنجاب میں کوئی مسلم وزارت نہیں تھی، وہاں یونینسٹ کی حکومت تھی جسے صوبے کی تین قومیتوں کی حمایت حاصل تھی۔ جمال الدین افغانی نے انڈیا کو مذہبی خطوط پر تقسیم کرنے کی کبھی بات نہیں کی تھی۔ عبدالحلیم شرر ہندو

اور مسلم اضلاع، نہ کہ صوبوں، کی تقسیم چاہتے تھے۔ چوہدری رحمت علی نے ''پاکستان'' نامی کوئی اخبار نہیں نکالا تھا۔ اُن کی سکیم کو گول میز کانفرنس میں مسلم لیگ کے وفد نے نہیں، بلکہ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی برائے آئینی اصلاحات کے سامنے پیش ہونے والے ایک مسلمان گواہ نے مسترد کیا تھا۔ مسلم لیگ نے فروری 1940ء میں انڈیا کی تقسیم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پارٹی کے آفس کی طرف سے شائع شدہ قراردادوں میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ رحمت علی نے لاکالج لاہور سے قانون کی ڈگری نہیں لی تھی۔ اُنھوں نے کالج میں داخلہ ضرور لیا تھا لیکن امتحان دیے بغیر کالج چھوڑ دیا۔ یہ خبر کہ جنرل ضیا کے اقتدار سنبھالنے پر قوم نے سکون کا سانس لیا، معلومات نہیں، محض پراپیگنڈا ہے۔

تاریخِ پاکستان، مصنف: پروفیسر شیخ محمد رفیق، صدر شعبہ تاریخ، اسلامیہ کالج (سول لائنز)، لاہور۔ معاونین: پروفیسر سید مسعود حیدر بخاری، ایم اے (تاریخ اور فارسی)، گورنمنٹ کالج ساہیوال، اور پروفیسر چوہدری نثار احمد، ایم اے (تاریخ اور اردو)، گورنمنٹ کالج فیصل آباد۔ شائع شدہ، سٹینڈر بک ہاؤس، لاہور۔ نیا ایڈیشن 1989۔ لاہور، ملتان، سرگودھا، راولپنڈی اور گوجرانولہ بورڈز کی نئے نصاب کے مطابق تیار کردہ۔

1707-1857 کے دور کے لیے 184، 1857-1947 کے لیے 220، اور 1947-1977 کے لیے 171 صفحات ہیں۔

باب نمبر آٹھ (صفحات 191-169) کا عنوان ''1857ء کی جنگِ آزادی'' ہے۔ باب نمبر 9 سید احمد خان اور علی گڑھ کے لیے مختص ہے۔

لکھنو پیکٹ کے بارے میں کتاب کہتی ہے کہ اس کی منظوری کے ساتھ ''کانگرس نے تسلیم کرلیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، اور مسلم لیگ اُن کی واحد نمائندہ جماعت ہے'' (صفحہ 253)۔ ''از حد مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوؤں نے پنجاب، بنگال اور سندھ کی اسمبلیوں سے مسلم اکثریت کا خاتمہ کردیا، اور اپنی اکثریت قائم کرلی'' (صفحات 254-253)۔ ''چوہدری رحمت علی نے اقبال کی 1930ء کی سکیم کو آگے بڑھاتے ہوئے 1933ء میں پاکستان نیشنل مومنٹ چلائی، اور 1935ء میں ایک چار صفحے کے پمفلٹ میں اُنھوں نے انڈیا سے 'مسلم انڈیا کی علیحدگی' کا مطالبہ

کیا'' (صفحہ 321)۔ ''یونینسٹ پارٹی کی قیادت نے کسی مسلم پارٹی کو پنجاب میں ابھرنے کی اجازت نہ دی۔ نیز اس نے چند متعصب ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے اتحاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا... یہ پارٹی جنگِ آزادی میں کوئی مثبت کردار ادا نہ کر سکی کیونکہ اس کی روح رواں زمیندار، خان بہادر اور سر کا خطاب لینے والے انگریز کے خوشامدی تھے۔ انگریز کی تابعداری اس کی سرشت میں شامل تھی۔ اب آپ حالات کی ستم ظریفی کہہ لیں یا قوم کی بدقسمتی کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے دشمن یہی یونینسٹ لیڈر اس مظلوم قوم پر مسلط ہو گئے'' (صفحہ 344)۔

لکھنو پیکٹ کے تحت کانگرس نے نہ تو مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کیا تھا اور نہ ہی مسلم لیگ کو ان کی نمائندہ جماعت مانا تھا۔ اگر اس پیکٹ کے ذریعے ہندوؤں نے صوبائی اسمبلیوں سے پنجابی اور بنگالی مسلمانوں کی اکثریت ختم کر دی تھی تو جناح اور لیگ نے اسے قبول ہی کیوں کیا تھا؟ کیا یہ ہندوؤں کی مکاری تھی یا لیگ کی کم عقلی؟ رحمت علی نے اقبال کی 1930ء کی تجویز کو آگے نہیں بڑھایا تھا۔ نیز اُن کا پلان 1935ء میں سامنے آیا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے کردار کے لیے باب دوم میں پڑھیے۔

''اقبال نے اپنی پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی ڈگری ٹرانٹی کالج، کیمبرج سے حاصل کی'' (صفحہ 361)۔ ''وہ برِصغیر کے پہلے رہنما تھے جنہوں نے بھرپور طریقے سے دوقومی نظریہ پیش کیا... اور اُن کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد نے پاکستان کا واضح تصور پیش کیا'' (صفحہ 365)۔ ان بے بنیاد دعووں کی حقیقت باب دوم میں دیکھیے۔

باب 18 ''مشہور مسلمان رہنما'' کا عنوان رکھتا ہے۔ اس میں وہی عدم توازن ہے جو باقی کتاب کا خاصہ ہے۔ سید امیر علی پر دو صفحات ہیں، نواب سلیم اللہ پر ایک، محمد علی جوہر پر پانچ، آغا خان پر تین، اقبال پر ساڑھے چار، سر فضل حسین پر ڈھائی، ذوالفقار علی خان پر تین، اے کے فضل الحق پر ایک، سر عبدالقیوم پر ڈیڑھ اور عبداللہ ہارون پر ایک (صفحات 374-351)۔

آزادی بعد کے دور کو انتہائی بے احتیاطی، لاعلمی اور تعصب کے ساتھ لکھا ہے۔

''ملک کی تقسیم کا اعلان ہوتے ہی وسیع پیمانے پر خون کی ہولی کھیلی گئی... مسلمانوں کی بستیوں پر حملے کیے گئے؛ دیہاتوں کو آگ لگا دی گئی؛ اُن پر انتہائی مظالم ڈھائے گئے، یہاں تک کہ وہ اپنا گھربار چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت پر مجبور ہو گئے'' (صفحہ 395)۔

مصنف نے 1947ء کی خونریزی کا غیر مسلموں پر تو فوراً الزام لگا دیا لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ مغربی پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں پر حملے کیوں کیے گئے؟ ایوب خان کے 1958ء کے شب خون کو ''انقلاب'' قرار دے کر اس کی دس وجوہات رقم کی گئی ہیں، لیکن فوج کے ''ذوق حکمرانی'' کا کوئی حوالہ نہیں (صفحات 451-448)۔

1971ء میں ملک ٹوٹنے کو تفصیل، لیکن تعصب کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ خونی فسادات سے جو دو واحد پارٹیاں پاک دامن باہر آتی ہیں، اُن میں سے ایک تو جماعتِ اسلامی ہے اور دوسری فوج (صفحات 492-476)۔

باب نمبر تئیس بھٹو کی وزارتِ اعظمیٰ کے دور کا ہے۔ اسے انتہائی متعصبانہ زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس پر درسی مواد سے زیادہ ضیا دور کی وزارتِ اطلاعات کی پریس ریلیز کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی اختتامی سطریں اس طرح ہیں: ''خدا کا شکر ہے کہ بھٹو مخالف احتجاج کے دوران قربانیوں اور عوام کی بے پناہ جدوجہد کو خدا نے قبول کیا اور قوم سرخ رو ہوئی'' (صفحات 514-493)۔

کچھ بیانات ایوب خان کے بارے میں: ''ایوب نے ملک کی کچھ تعلیم یافتہ خواتین کو خوش کرنے کے لیے مسلم عائلی قوانین نافذ کر دیے۔ ان کی وجہ سے عوام کے دل میں ایوب حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی'' صفحات 472-471)۔

1971ء کی جنگ میں ''پاکستان کی مسلح افواج نے بہادری کے نئے ریکارڈز قائم کیے اور بھارتیوں کو ہر جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑا'' (صفحہ 483)۔ بجا فرمایا، لیکن اگر پاکستان کی مسلح افواج ہر جگہ فتح مند ہوئیں، اور بھارتی ہزیمت اٹھانے پر مجبور ہوئے، تو پھر ڈھاکہ میں فتح مند فوج نے شکست خوردہ فوج کے سامنے ہتھیار کیوں ڈال دیے؟ یہ متناقضہ فاضل پروفیسرز میں سے کوئی حل کر دیتا تو غریب قوم کو بھی سمجھ آ جاتی۔

''مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے مسٹر جناح کی زندگی میں اردو مخالف مظاہروں کو ہوا دی، اور آخر کار وفاقی سیاست دانوں نے ہار مان کر، توہین آمیز طریقے سے بنگالی کو دوسری قومی زبان قرار دے دیا۔ اس تحریک نے نفرت کے بیج بو دیے'' (صفحہ 487)۔

حکومت پاکستان کے لیے بنگالی کو دوسری قومی زبان تسلیم کرنا کیوں باعثِ توہین کیوں تھا؟

آبادی، جمہوریت اور اخلاقیات کا تقاضا تو یہ تھا کہ بنگالی کو ملک کی واحد قومی زبان قرار دیا جاتا۔ اگر اس پر مغربی پاکستان پر زور احتجاج کرتا تو رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو کو دوسری قومی زبان مان لیا جاتا۔

''بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ قادیانیوں کو کافر قرار دینا تھا'' (صفحہ 506)۔

''1965ء میں پاکستان کی فوجی برتری نے انڈیا کو جنگ بندی کی درخواست کرنے پر مجبور کر دیا'' (صفحہ 534)۔

درحقیقت 1965ء میں پاکستان نے انڈیا کو سیز فائر پر مجبور نہیں کیا تھا۔ جنگ میں دونوں کی پوزیشن برابر تھی۔ لیکن پاکستان کے پاس گولہ بارود اور ہتھیاروں کی کمی تھی۔ جنگی ساز و سامان کے لیے اُسے امریکہ پر انحصار کرنا پڑتا تھا، اور وہ تیس دن سے زیادہ کی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔ جنگ بندی اقوام متحدہ کی مداخلت سے ہوئی تھی۔

''1971ء میں انڈیا نے بڑی طاقتوں کی چشم پوشی، اور روس کی کھلی مدد کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت کی اور اسے پاکستان سے الگ کر دیا'' (صفحہ 534)۔ یہ سب کچھ باب دوم میں۔

تاریخ پاک و ہند، مصنف: انوار ہاشمی، ایم اے، کراچی بک سنٹر، کراچی، پانچواں ایڈیشن۔ جون 1984

یہ کتاب حیدر آباد، ملتان، لاہور اور سرگودھا بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے تجویز کردہ نصاب کے مطابق لکھی گئی ہے۔ مصنف کی اردو اور انگریزی میں بہت سی تصنیفات ہیں۔

1857-1974 کا دور مندرجہ بیانات رکھتا ہے:

1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی کہلاتی ہے (صفحات 478-487)؛ لکھنو پیکٹ 1916 درحقیقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ اس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی بطور قوم الگ شناخت، اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مان لیا (صفحات 511-512)؛ ہندوؤں اور مسلمانوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا (صفحہ 516)؛ اقبال نے ڈاکٹری کی ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی (صفحہ 519)؛ تیسری گول میز کانفرنس کے دوران

کیمبرج یونیورسٹی کے کچھ مسلمان طلبہ نے ایک پمفلٹ ''اب، یا کبھی نہیں'' شائع کیا (صفحہ 521)؛ چوہدری رحمت علی کا انتقال 1948ء میں ہوا (صفحہ 523)؛ قراردادِ پاکستان تیئیس مارچ 1940ء کو منظور کی گئی (صفحہ 528)؛ جناح ملک کے پہلے گورنر جنرل منتخب ہوئے (صفحہ 537 پر دو مرتبہ)؛ ملک عام انتخابات کی تیاری کررہا تھا، سیاست دان اپنی اپنی کامیابی کے لیے کوشاں تھے، اور انتخابات کے بعد ایک باقاعدہ جمہوری حکومت کا قیام متوقع تھا، لیکن آٹھ اکتوبر کو مارشل لا نافذ کردیا گیا، 1956ء کا آئین معطل کردیا گیا اور ستائیس اکتوبر کو فوجی حکومت نے اقتدار سنبھال لیا (صفحہ 543)؛ صدر ایوب خان نے استعفادے کر (سال اور تاریخ نہیں بتائی گئی) ملک کا انتظامی کنٹرول فوج کے حوالے کردیا (صفحہ 558)۔

لکھنو پیکٹ کے مندرجات کو یہاں توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا نصف دھڑا، شفیع گروپ سائمن کمیشن کی حمایت کررہا تھا، دوسرے نصف، جناح گروپ نے سرکاری انکوائری کا بائیکاٹ کیا۔ ''اب، یا کبھی نہیں''، کیمبرج میں زیرتعلیم مسلمان طلبہ کا نہیں، صرف رحمت کا شائع کردہ پمفلٹ تھا۔ رحمت علی کا انتقال 1951ء میں ہوا، نہ کہ 1948ء میں۔ جناح منتخب شدہ گورنر جنرل نہیں تھے، کیونکہ یہ اس عہدے کے لیے انتخابات نہیں ہوتے۔ اُنہیں برطانوی بادشاہ نے اس عہدے پر نامزد کیا تھا۔ باقی نکات باب دوم میں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف وسیع پیانے پر پراپیگنڈا پہلے سے ہی کیا جارہا تھا۔ اس دوران قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کی خبر سے صوبے میں ہنگامے پھوٹ پڑے، اور امن وسکون برباد ہوگیا۔ پاکستان کے دشمن عناصر نے صورتِ حال کو اپنے زہریلے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ یہ عناصر مشرقی پاکستان کے معصوم عوام کو پہلے ہی علیحدگی کے مطالبے پر اکسارہے تھے، اور اب اُنھوں نے بنگالیوں کو یقین دلادیا کہ مغربی پاکستان کی قیادت مشرقی پاکستان کو قیادت منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے بعد بنگالیوں کو تاثر دیا گیا کہ اُن کے خلاف کوئی سازش ہورہی ہے۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک زور پکڑتی گئی، یہاں تک کہ حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ مغربی پاکستان کے باشندوں اور بہاریوں کو قتل کیا جانے لگا، اور صوبے میں لوٹ مار شروع ہوگئی۔ جب

صورتِ حال بالکل قابو سے باہر ہوگئی تو یحییٰ خان نے فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ ایک ماہ کے اندر فوج نے مشرقی پاکستان کے ہر حصے سے باغیوں اور شرپسند عناصر اور پاکستان کے دشمنوں اور اُن کے ایجنٹوں کا صفایا کردیا...فوجی ایکشن کے بعد یحییٰ خان نے اصل مسئلے کے سیاسی حل پر توجہ نہ دی۔ چنانچہ باغی عناصر ایک مرتبہ پھر متحرک ہوگئے۔ آخر کار نومبر 1971ء میں بھارتی فوج نے بھرپور قوت کے ساتھ مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا (دسمبر میں مغربی پاکستان پر بھی حملہ کیا)، اور دسمبر کے وسط میں حالات نے اس طرح پلٹا کھایا کہ مشرقی پاکستان بھارت کے ہاتھ میں چلا گیا'' (صفحات 580-579)۔

پاکستان دولخت ہونے کا درست بیان باب دوم میں پڑھیے۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ کتاب کا حصہ، جو جدید عہد کو بیان کرتا ہے، میں سرسید احمد خان پر پورا ایک باب ہے (صفحات 502-494)، لیکن اس میں تحریکِ پاکستان کے دوران قومی سیاست میں بنگال کے کردار پر ایک لفظ بھی نہیں۔

انگلش میڈیم ٹیکسٹ بکس

ٹیکسٹ بک بورڈز تمام جماعتوں کے لیے انگلش میڈیم سکولوں کی کتابیں شائع نہیں کرتے۔ صرف چند استثنات ہیں جن کا میں نے جائزہ لیا ہے۔ اس حصے میں، میں ان کتابوں کو دیکھوں گا جو سرکاری اور نجی سکولوں کی انگلش میڈیم کلاسز کو پڑھائی جاتی ہیں۔

کلاس اوّل

معاشرتی علوم، مصنف قطب الدین خان، بی ایڈ، رہبر پبلشرز، کراچی۔ (صفحہ نمبر نہیں لگائے گئے)

''پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا'' (سبق دوم)۔ ''اقبال وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا'' (سبق چہارم)۔ حکومت کے صرف ایک محکمے، پولیس کا ذکر سبق نمبر چودہ میں ملتا ہے، اور اس واحد چوائس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔

کلاس 1-2

معاشرتی علوم، اقبال بک ڈپو، کراچی

''قائدِاعظم محمد علی جناح نے پاکستان کی بنیاد چودہ اگست 1947ء کو رکھی۔ پاکستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے'' (صفحہ 3)۔ ''اقبال وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ سرزمین، پاکستان، کا تصور پیش کیا۔ آپ نے اپنی پرائمری تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی، اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ اور جرمنی چلے گئے۔ آپ کو بادشاہی مسجد، لاہور کے سامنے دفن کیا گیا''۔ سبق کے آخر میں سوال پوچھا گیا ہے: اُنھوں نے اپنی تعلیم کہاں سے حاصل کی'' (صفحہ 6)؛ سرسید احمد خان نے ''علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی'' (صفحہ 7) محمد علی جوہر نے ''اپنی ابتدائی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی'' (صفحہ 8)۔ ''کراچی میں بہت سے خوبصورت مقامات ہیں جہاں بچے سیر کا لطف اٹھاتے ہیں'' (صفحہ 11)۔

سید احمد خان نے ایم اے او کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی اُن کی وفات کے بیس سال بعد قائم ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایم اے او کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس وقت وہ یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس کے بعد مولانا آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔

کلاس دوم

معاشرتی علوم برائے ایلیمنٹری کلاس، مصنف قطب الدین خان، بی اے، بی ایڈ (علیگ)... (کچھ دیگر ڈپلومے اور سرٹیفکیٹس ہیں جو کم از کم میری سمجھ سے تو باہر ہیں)، ہارون برادرز، کراچی

''اقبال پہلے مسلمان رہنما تھے جنھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 3)۔ سرسید احمد خان نے ''علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی'' (صفحہ 4)۔

سید احمد خان نے ایم اے او کالج کی بنیاد رکھی تھی، نہ کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی۔

معاشرتی علوم، قطب الدین خان، رہبر پبلشرز، کراچی

''پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا... پاکستان اسلامی نظریے کی بنیاد پر قائم

ہوا'' (صفحہ 5)۔ ''قرارداد پاکستان تیئس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی'' (صفحہ 6)۔ سبق نمبر آٹھ حضرت داتا گنج بخش کا ذکر کرتا ہے۔ سبق نمبر گیارہ میجر عزیز بھٹی کے بارے میں ہے۔ وہ ایک فوجی افسر تھے جو 1965ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔ سبق نمبر پندرہ سعودی عرب کے شاہ فیصل کے بارے میں ہے۔

پاکستان پندرہ اگست کو وجود میں آیا تھا۔ طلبہ کو دوٹوک انداز میں یہ بتانا کہ ''پاکستان اسلامی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا'' تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے تدریس اور زبان و بیان کے ناقص استعمال کا تاثر گہرا ہوتا ہے۔ ابھی یورپی اور امریکی دانشور اور فلاسفر لفظ ''نظریے'' کے درست معانی اور اس سے وابستہ تصورات جاننے کی کوشش میں ہیں، لیکن ہمارے مصنفین کو توقع ہے کہ کلاس دوم کے طلبہ اس کی بنیاد پر قیام پاکستان کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ ایسے الجھے ہوئے احمقانہ بیانات اکتائے ہوئے طلبہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ انہیں اندھا دھند یاد کریں اور جان چھڑائیں۔

کلاس سوئم

معاشرتی علوم، مصنف، قطب الدین خان، رہبر پبلشرز، کراچی۔

''پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا۔ قائدِاعظم محمد علی جناح اس کے بانی تھے'' (صفحہ 3)۔

''انڈیا سے لاکھوں مسلمان کراچی میں آباد ہونے کے لیے آگئے۔ اُنھوں نے یہاں بہت سی ملیں، فیکٹریاں، دفاتر، کالونیاں اور عظیم الشان عمارتیں قائم کیں'' (صفحہ 8)۔ قائدِاعظم کا مزار ''رات کے وقت فلش لائٹ میں چمکتا ہے'' (صفحہ 10)۔ عدالتیں ضلع میں امن وامان قائم رکھتی ہیں'' (صفحہ 29)۔ ''پولیس ضلع میں امن وامان قائم رکھتی ہے'' (صفحہ 30)۔ ٹیلی ویژن ابلاغ عامہ کا سب سے موثر میڈیا ہے... یہ سن بھی سکتا ہے اور دیکھ بھی'' (صفحہ 36)۔ قراردادِ پاکستان پر سبق ہمیں بتاتا ہے: ''جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان ایک روز نیند سے بیدار ہوئے، اور اُن سب نے ایک الگ اسلامی ریاست حاصل کرنے کی خواہش کی۔ انڈیا بھر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں تئیس مارچ 1940ء کو قرارداد منظور کرتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ

ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ یہ قرارداد اب قراردادِ پاکستان کہلاتی ہے۔ مسلمان اپنی جدوجہد میں چودہ اگست 1947ء کو کامیاب ہو گئے۔ نظریۂ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے'' (صفحہ 37)۔

قائدِاعظم، بانیٔ پاکستان، پر اردو کلاس اوّل کی پہلی کتاب دیکھیے۔ اُس کا بھی یہی موضوع ہے۔ ٹیلی ویژن میڈیا نہیں، میڈیم ہے۔ پاکستان جنوب مشرقی ایشیا میں نہیں، جنوبی ایشیا میں واقع ہے۔ 1940ء میں مسلم لیگ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی تھی۔ قراردادِ لاہور میں ایک ریاست نہیں، ریاستوں کی بات کی گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر نوجوان طلبہ کو ''نظریے'' کا سامنا ہے؛ کوئی جائے پناہ دکھائی نہیں دیتی۔

جس ''زبان'' میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، اُسے بمشکل ہی انگلش کہا جا سکتا ہے۔

تاریخ پاک وہند، مصنف: اے کیو قریشی، ایم اے (اسلامیات اور تاریخ)، پنجاب پوسٹ گریجویٹ سرٹیفکیٹ ان ایجوکیشن، سینئر ہیڈ ماسٹر، اور صدر شعبہ سوشل سٹڈیز، پی اے ایف پبلک سکول، لوئر ٹوپا، مری ہلز۔ امپیریل بک ڈپو، لاہور۔ پہلا ایڈیشن 1964ء، نظرثانی شدہ ایڈیشن مارچ 1983ء (تاہم یہ کتاب 1986ء تک اپ ٹو ڈیٹ ہے)۔

سرورق پر جناح، اقبال، ایوب خان، سرسید احمد خان اور محمد علی جوہر کی تصاویر اسی ترتیب سے ہیں۔ عنوان ایک نئے علاقے، ملک یا برِصغیر کو تخلیق کر رہا ہے، جو ''انڈو پاکستان'' ہے۔ پیش لفظ میں پی ایچ ہارووڈ، مصنف کے سکول کے پرنسپل، کتاب کو سراہتے ہوئے اسے ایک ''ناول، اور اس موضوع پر موجود کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ'' قرار دیتے ہیں۔

''مغربی پاکستان کے لوگ کئی ایک زبانیں بولتے تھے، لیکن اُنھوں نے اردو کو اپنی قومی زبان چن لیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگ بنگالی بولتے تھے، لیکن یہی اُن کی قومی زبان تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مشرقی پاکستان کے عوام نے سوچا کہ اُن کے پاس ایک اپنا وطن ہوتا، اور وہ اسے بنگلہ دیش کہتے۔ چنانچہ 1972ء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا، اور مغربی پاکستان ''پاکستان'' کہلانے لگا'' (صفحہ 3-2)۔ ''انڈیا سمت تمام ہمسایوں کے ساتھ ہمارے اچھے تعلقات ہیں'' (صفحہ 4)۔ ''آدمی اور عورتیں قمیص اور شلوار پہنتے ہیں'' (صفحہ 4)۔ ''انڈیا کو بھارت بھی کہا جاتا ہے۔ بھارت

غیر مسلموں کا ملک ہے۔۔۔انڈیا میں کئی کروڑ مسلمان رہتے ہیں'' (صفحہ 11) ''محمود غزنوی کئی مرتبہ انڈیا آیا'' (صفحہ 12)۔ ''1878ء میں انڈیا کے لوگوں نے جنگِ آزادی لڑی'' (صفحہ 14) ''انڈین نیشنل کانگرس چاہتی تھی کہ انگریز انڈیا سے نکل جائیں اور اقتدار اُن کے حوالے کردیں'' (صفحہ 15)۔ ''مسلم لیگ کے رہنما ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن چاہتے تھے'' (صفحہ 15)۔ ''چودہ اگست 1947ء کو انگریزوں نے انڈیا کو دو آزاد ملکوں میں تقسیم کردیا'' (صفحہ 16)۔ ''رحمت علی نے انڈیا کے کچھ مسلم اکثریتی صوبوں کے ناموں سے حرف لے کر لفظ پاکستان بنایا'' (صفحہ 17)۔ ''اگر آپ سے پوچھا جائے کہ انڈو پاکستان میں پیدا ہونے والا سب سے بڑا مسلمان کون تھا تو آپ شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام لے سکتے ہیں'' (صفحہ 19)۔ ''شاہ ولی اللہ نے عربیہ سے قرآن اور حدیث کی اسناد حاصل کیں'' (صفحہ 20)۔ ''اُن کا قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کسی بھی زبان میں قرآن پاک کا پہلا ترجمہ تھا'' (صفحہ 21-20)۔ ''اردو برصغیر کے عام افراد کے بول چال کی زبان ہے'' (صفحہ 21)۔ 1857ء کی بغاوت کی وجہ سے ''انگریز سرکار مسلمانوں کے خلاف ہوگئی، اور اُنہیں شہید کیا گیا'' (صفحہ 29)۔ ''محمد علی نے محسوس کیا کہ ہندو مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں، اور چونکہ وہ غلامی سے نفرت کرتے تھے، اس لیے اُنھوں نے کانگرس چھوڑ دی'' (صفحہ 34)۔ ''محمد علی نے اسلامی تعلیمات کی ترویج کے لیے دہلی میں جامعہ ملیہ قائم کی'' (صفحہ 35)۔ ''اُن کا قلمی نام جوہر تھا'' (صفحہ 35)۔ ''اقبال نے کیمبرج اور لندن یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ جرمنی بھی گئے اور ڈاکٹر محمد اقبال بن کر لوٹے'' (صفحات 39-38)۔ ''الہ آباد میں اپنی تقریر میں اُنھوں نے کہا کہ انڈیا کے مسلمانوں کا اپنا ایک الگ ملک ہونا چاہیے۔ اس طرح وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 40)۔ ''کانگرس دراصل ہندوؤں کی پارٹی تھی۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ آزادی کے بعد ہندو اُنہیں اپنا غلام بنالیں گے۔ لیکن جناح ایسا نہیں سوچتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان مل کر آزادی کے لیے جدوجہد کریں'' (صفحہ 47)۔ ''مارچ 1940 کی لاہور کی میٹنگ میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا'' (صفحہ 49)۔ ایوب خان ''ایک سپاہی تھے۔ وہ اقتدار پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم حالات نے اُنہیں ایسا کرنے پر مجبور کردیا۔ حکمران ملک کو تباہ کررہے تھے؛ وہ اسے برداشت نہ کرسکے۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر معاملات

درست کرنے کا فیصلہ کیا'' (صفحہ 56)۔''ایوب خان نے بڑے جاگیرداروں سے زمین واپس لے کر کسانوں کو دی۔ پاکستان کے لوگ ایوب خان سے بہت خوش تھے۔ اُنھوں نے ایوب کو اعلیٰ فوجی اعزاز دیا'' (صفحہ 58)۔''تیئیس مارچ 1940ء کو لاہور کے ایک عوامی جلسے میں ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 60)۔''انڈیا کے مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں ایک طویل جدوجہد کے بعد الگ وطن حاصل کیا'' (صفحہ 62)۔

مغربی پاکستان کے لوگوں کو اپنی قومی زبان کا انتخاب کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اُن پر ایک غیر نمائندہ اسمبلی، اور بعد میں ایک فوجی آمر نے اردو مسلط کر دی۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دل میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک الگ ریاست حاصل کرنے کی سوچ کا پیدا ہونا 1971ء کی خانہ جنگی اور انڈیا کے ساتھ جنگ کا ایک منفرد بیانیہ ہے۔ بہت سطحی سوچ کا حامل کوئی شخص ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ پاکستان انڈیا کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتا ہے، اس کے ساتھ لڑی جانے والی کئی جنگوں کو احمقانہ قرار دینے کے مترادف ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ زیادہ تر درسی کتب ان جنگوں کو یک طرفہ طور پر ایک جنگی کارنامہ بیان کرتی ہیں (یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مصنف مسلح افواج کی زیرِ نگرانی چلنے والے ایک سکول میں معلم ہیں)۔ اگر بھارت غیر مسلموں کا ملک ہے تو وہاں 120 ملین مسلمانوں کی موجودگی کی کیسے وضاحت کی جائے۔ محمود غزنوی کی ہندوستان میں آمد نہیں ہوئی تھی، اُس نے حملہ کیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو چودہ اگست 1947ء کو نہیں، اس سے اگلے روز تقسیم کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ کا قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ اس کا کسی بھی زبان میں پہلا ترجمہ نہیں تھا، اس سے پہلے سترویں صدی میں اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا جا چکا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامی تعلیمات کی ترویج کے لیے نہیں بلکہ کانگرس نواز مسلمان قوم پرستوں کے پراپیگنڈے کے مرکز کے طور پر قائم کی گئی تھی۔ اقبال نے یونیورسٹی آف لندن میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ دیگر نکات کی باب دوم میں وضاحت کی گئی ہے۔

فاضل منصف نے طلبہ کو علم سے جو مستفید کیا، سو کیا، زبان کے بارے میں بھی اُنھوں نے ''خاص احتیاط'' برتی ہے کہ کہیں کوئی مناسب جملہ سپردِ قلم نہ ہونے پائے۔ نمونے کے چند شاہ پارے ملاحظہ فرمائیں:

1- Are not you proud that you have a country of your own.(p 4)

2- Ayub Khan started many reforms in the country. (p 57)

3- On the birthday of Iqbal, we say good words about him. (p 61)

4- During the reign of Shahjahan, all the crops died in the Deccan. (p 91)

5- Sayyid Ahmad Khan was very fond of swimming and arrow-shooting. (p 28)

6- There are crores of Muslims in India but non-Muslim are more in number. (p 11)
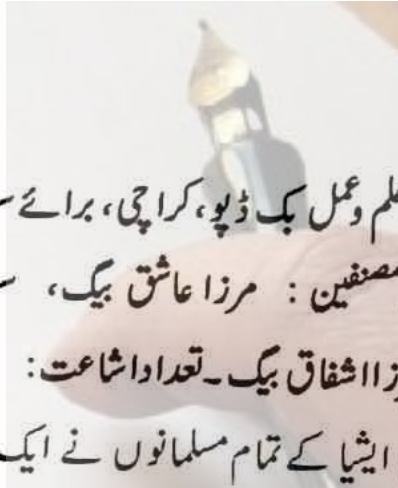
کلاس چہارم

معاشرتی علوم، شائع شدہ علم و عمل بک ڈپو، کراچی، برائے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدر آباد، مارچ 1978 ء۔ مصنفین : مرزا عاشق بیگ، سید تلمیذ حسین رضوی۔ کنوئنر: عبدالمجید عباسی۔ مترجم: مرزا اشفاق بیگ۔ تعداد اشاعت: 10,000 کاپیاں۔

''برطانوی دور میں جنوبی ایشیا کے تمام مسلمانوں نے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ اُس جماعت کا نام آل انڈیا مسلم لیگ تھا۔ اُس جماعت کا مقصد انگریزوں سے آزادی، اور مسلمانوں کے لیے ایک مستقبل سرزمین حاصل کرنا تھا۔ اس نئے ملک کا نام پاکستان تجویز کیا گیا'' (صفحہ 5)۔ قراردادِ پاکستان مسلم اکثریتی آبادی والے ناموں پر مشتمل تھی، جنہوں نے پاکستان تشکیل دینا تھا۔ یہ قرارداد تئیس مارچ 1940 ء کو منظور کی گئی'' (صفحہ 6)۔ ''چودہ اگست کے بعد برٹش انڈین حکومت کے تمام مسلمان ملازمین، جنہوں نے پاکستان جانے کا قصد کر لیا تھا، کراچی پہنچنا شروع ہو گئے۔ ہندو اکثریتی علاقوں میں رہنے والے دیگر مسلمان بھی ہجرت کر کے سندھ پہنچے'' (صفحہ 6)۔ اگرچہ 1978 ء میں سندھ میں مارشل لا لگا ہوا تھا، پھر بھی سندھ اسمبلی کی کارکردگی اور فعالیت کو تین صفحات پر مشتمل سبق میں بیان کیا گیا ہے (صفحات 69-67)۔

1906 ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ ایک طویل عرصے تک انڈیا کے تمام

مسلمانوں کی ترجمان نہیں تھی (1937 ء انتخابات کے نتائج دیکھیں)، اور نہ ہی اس کا مقصد انڈیا کی آزادی (یہ بہت بعد میں ہوا)، یا ایک مسلم وطن کا قیام تھا (ایسا 1946 ء میں ہوا تھا۔ 1940 ء میں تو اس کا مطالبہ ''کچھ ریاستیں'' تھا۔ قرارداد لاہور اُن علاقوں کے ناموں پر ''مشتمل'' نہیں تھی جنہوں نے پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ ہندو اکثریتی علاقوں میں رہنے والے تمام مسلمانوں نے 1947 ء میں سندھ کی طرف ہجرت نہیں کی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو آج سندھ کی آبادی 140 ملین ہو چکی ہوتی، جبکہ انڈیا میں کوئی مسلمان نہ ہوتا۔

کلاس پنجم

معاشرتی علوم، شائع شدہ علم و عمل بک ڈپو، کراچی، برائے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدرآباد۔ فروری 1982 ء۔ مصنف: ایس حامد علی جعفری۔ مترجم: ایڈگر وکٹر۔ تعداد اشاعت: 10,000 کاپیاں۔

''1857 ء میں مسلمان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بغاوت پہلی جنگ آزادی کہلاتی ہے (صفحہ 3)۔ ''برطانیہ کی زیر سرپرستی، ہندوؤں نے اپنی ایک سیاسی جماعت بنائی، جو انڈین نیشنل کانگرس کہلائی'' (صفحہ 3)۔ ''اقبال نے سب سے پہلے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا تصور پیش کیا.... 1930 ء میں الہ آباد کے خطبے میں اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ جنوبی ایشیا کے مسلم اکثریتی علاقوں کو ملا کر ایک آزاد مسلم ریاست قائم کر لی جائے'' (صفحہ 5)۔ ''1940 ء کے سال میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے ایک آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 5)۔ 1971 ء کے سقوط ڈھاکہ کے بارے میں کتاب کہتی ہے: ''بھارت نے اپنے ایجنٹوں اور مفاد پرستوں کے ذریعے پہلے تو مشرقی پاکستان میں شورش برپا کی، اور پھر تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ یہ 1971 ء کا سال تھا جب پاکستان کو اپنے مشرقی بازو کے دفاع کے لیے بھارت کے ساتھ جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ تین ہفتوں تک جاری رہی۔ اس کا اختتام ایک نئی ریاست کے قیام پر ہوا جو بنگلہ دیش کہلاتا ہے'' (صفحہ 8)۔ دس صفحات پر مشتمل ایک باب مسلح افواج پر ہے۔ ایک اور باب ملک کے آئینی اور سیاسی

نظام کے بارے میں بتاتا ہے، لیکن یہ ذکر نہیں کرتا کہ کتاب کی اشاعت کے وقت ملک پر کون سا مارشل لا مسلط تھا۔

کانگرس ہندو پارٹی نہیں تھی، اور نہ ہی اس کا قیام برطانوی سرپرستی کا نتیجہ تھا۔ بلکہ انگریزوں نے سرسید احمد خان کے ایم اے او کالج علی گڑھ، اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کی سرپرستی ضرور کی تھی۔ لیکن یہ حقائق کسی درسی کتاب میں موجود نہیں۔

سوشل سٹڈیز، 1987ء۔ مصنفین: فریدہ سید، اور عاصمہ ابراہیم۔ ایف ای پی انٹرنیشنل پاک (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔

''پاکستان چودہ اگست 1947ء کو مسلمانانِ برِصغیر کے لیے بطور ایک آزاد ریاست وجود میں آیا۔ پاکستان کا نام چوہدری رحمت علی نے چنا۔ اس میں ہر صوبے کے حروف شامل ہیں، اور اس کا مطلب ہے ''پاک لوگوں کی سرزمین''۔۔۔روحانی طور پر اس کا مطلب 'پاکیزہ' ہے۔ نظریۂ پاکستان اسلام ہے، اور ملک کا آئین جمہوری ہے'' (صفحہ 34)۔ کچھ دیر کے بعد (تاریخ نہیں بتائی گئی) ''مسلمانوں نے خوف محسوس کرتے ہوئے کہ اُن کا کلچر اور مذہب معدوم ہو جائیں گے، ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ کرتے ہوئے سیاسی تحریک شروع کر دی۔ برِصغیر کے سیاسی شعور رکھنے والے تمام مسلمان، جیسا کہ علامہ اقبال، سرسید اور بہت سے دیگر اس تصور کے حق میں تھے۔ پاکستان کے لیے جدوجہد کا آغاز 1930ء کی دہائی میں ہو گیا تھا۔ اسے مسلمانوں کی بھرپور حمایت اور تعاون حاصل تھا۔ تحریکِ پاکستان میں روز بروز شدت آتی جارہی تھی، اور پھر ہمارے عظیم رہنما، قائدِاعظم محمد علی جناح بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے.... تیئیس مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان منظور کی گئی... یہ قرارداد برِصغیر میں دو آزاد ریاستوں کا مطالبہ کرتی ہے...قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے بعد برِصغیر کے کئی شہروں میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہنگامے پھوٹ پڑے'' (صفحات 36-35)۔ اس کتاب کی اشاعت غیر معمولی ہے۔

پاکستان چودہ کو نہیں، پندرہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا تھا (مکمل تفصیل باب دوم میں)۔ رحمت علی نے نام پاکستان چنا نہیں تھا، نکسال، یا ایجاد کیا تھا۔ اگر پاکستان کا نظریہ اسلام ہے تو

اس کا مذہب کیا ہے؟ 1987ء میں پاکستان کا آئین یقیناً جمہوری نہیں تھا۔ اس وقت ملک پر ایک فوجی جنرل کی حکومت تھی جس نے بزورِ بازو، آئین سے غداری کرتے ہوئے، اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے نہ صرف ایک جعلی ریفرنڈم کے ذریعے خود کو منتخب صدر منتخب کرالیا بلکہ ذاتی فائدے کے لیے 1973ء کے آئین میں تبدیلیاں کرتے ہوئے غیر معمولی اختیارات حاصل کر لیے۔ اس دوران اُنھوں نے آرمی چیف کی وردی بھی پہنی ہوئی تھی۔ سر سید احمد خان کسی طور ایک الگ مسلم ریاست کے حق میں نہیں تھے۔ پاکستان کے لیے جدوجہد کا آغاز 1930ء کی دہائی سے نہیں، 1940ء سے ہوا تھا۔ قراردادِ لاہور دو ریاستوں کا مطالبہ نہیں کرتی۔ اس میں ریاستوں کی مخصوص تعداد کا ذکر نہیں۔ قرار دادِ لاہور کی منظوری کے بعد کہیں بھی فرقہ وارانہ فسادات نہیں پھوٹ پڑے تھے۔

کلاس ششم

معاشرتی علوم، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، برائے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدر آباد۔ پہلا اڈیشن، مارچ 1982ء۔ مصنف: سید حامد علی جعفری، مترجم: ایڈگر وکٹر۔ تعداد اشاعت: 12,000 کاپیاں۔

1857ء کی بغاوت کو ''پہلی جنگِ آزادی'' قرار دیا گیا ہے (صفحہ 65)۔ ''ہندوؤں نے 1885ء میں کانگرس قائم کی'' (صفحہ 66)۔ ''اقبال نے کھلے الفاظ میں مطالبہ کیا (کب؟ تاریخ نہیں بتائی گئی) کہ پنجاب، سندھ، این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، کو ملا کر ایک آزاد مسلم ریاست بنا دی جائے'' (صفحہ 68)۔ ''تیئیس مارچ 1940ء کو منظور ہونے والی قراردادِ پاکستان میں مسلم علاقوں کو ملا کر ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا اعلان کیا گیا'' (صفحہ 69)۔ پاکستان کی سول زندگی، باب نمبر دس (صفحات 78-72) میں مارشل لا کا ذکر نہیں جو ملک پر مسلط رہا۔

اقبال اور قراردادِ لاہور کے بارے میں تمام بیانات غلط نہیں۔ تصحیح کے لیے باب نمبر 2 ملاحظہ فرمائیں۔

کلاس ہفتم

ہماری تاریخ کے اولین نقوش، مصنف: ڈاکٹر اے حق ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈپلومہ Archivism، سابق جی سی ایس، کلاس ون (سینئر) ریٹائرڈ سربراہ شعبہ جدید مضامین، پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول۔ فیروز سنز، لاہور۔ نیا ایڈیشن۔

پیش لفظ میں میجر جنرل شوکت علی شاہ، کمانڈنٹ پاکستان ملٹری اکیڈمی، کا کہنا ہے: ''تاریخ انسان کی روزی کی تلاش کا ریکارڈ ہے۔ انسانی کشمکش کے ریکارڈ میں شامل تعصب اور مفاد کے عناصر ظاہر کرتے ہیں کہ حکمران کو رعایا کی نسبت بالا دستی حاصل ہے... اس کتاب میں کسی بیرونی خوف سے بے نیاز ہو کر واقعات بیان کیے گئے ہیں'' (صفحہ 6)۔ پیش لفظ میں مصنف کا دعویٰ ہے: ''سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لیے لکھی گئی یہ کتاب اس موضوع پر تحریر کردہ دیگر تمام کتابوں سے مختلف ہے۔ وہ کتابیں حقیقت میں حکایت کو ملاتے ہوئے تاریخ کا دھندلا تصور پیش کرتی ہیں۔ یہ کتاب ہمارے قابل فخر ورثے کے بارے میں مستند حقائق پیش کرے گی'' (صفحہ 8)۔

''انگریز جنہوں نے برصغیر کو فتح کیا وہ ''چالاک اور مکار'' تھے، اور وہ ''چالاکی اور مکاری سے ہمارے ملک کے حکمران بن بیٹھے۔ وہ 150 برسوں تک اقتدار میں رہے، یہاں تک کہ ہم نے آزادی کا فیصلہ کر لیا'' (صفحہ 13)۔ ''انگریزوں کی طرح چالاک اور مکار'' (صفحہ 129)۔ ''1857ء میں ہم نے جنگِ آزادی لڑی'' (صفحہ 133)۔ سر سید احمد خان ''پاکستان کے عظیم مفکرین میں سے ایک تھے'' (صفحہ 141)۔ ''پاکستان کا تصور پیش کرنے والے پہلے شخص'' اقبال تھے۔ (صفحہ 155)۔ ''1930ء میں اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے الگ ریاستوں کا تصور پیش کیا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ دونوں قومیں ایک ریاست میں امن سے نہیں رہ سکتیں'' (صفحہ 158)۔ ''چودہ اگست 1947ء کو برصغیر کو تقسیم کر دیا گیا.... اور احسان مند قوم نے قائداعظم کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنا لیا'' (صفحہ 164)۔

قیامِ پاکستان سے پچاس سال پہلے فوت ہو جانے والے سر سید احمد خان پاکستان کے پہلے مفکر کس طرح قرار پاتے ہیں؟ نیز اُن کا تعلق اس سرزمین سے نہیں۔ انڈیا کی تقسیم چودہ اگست کو نہیں، پندرہ اگست کو ہوئی تھی۔ جناح کو ملک کے گورنر جنرل بنانے میں احسان سے مغلوب پاکستانی قوم نے

کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے خود کو اس عہدے کے لیے چنا، اور اُن کی تقرری برطانوی بادشاہ نے کی تھی۔

برصغیر پاک و ہند کی جونیئر ہسٹری
سید فیاض محمود، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی۔ پہلی اشاعت 1961، دوسرا ایڈیشن 1972، تیسرا ایڈیشن 1988۔

''دسمبر 1971ء کو پاکستان سے مشرقی حصہ الگ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔ اب باقی مغربی حصہ پاکستان کے نام سے جانا جاتا ہے'' (صفحہ 1)۔ ''1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی کہلاتی ہے'' (صفحہ 51-50)۔ ''چودہ سال بعد، انڈو پاکستان کو برطانیہ کی سلطنت قرار دے دیا گیا... گورنر جنرل اب وائسرائے کہلاتا تھا'' (صفحہ 52)۔ سرسید احمد خان، اقبال اور آغا خان کی تصاویر ''تحریکِ پاکستان کے سرکردہ رہنما'' کے ساتھ شائع کی گئی ہیں (صفحہ 56)۔ ''بیس سال تک ہندو اور مسلمان مل کر کانگرس میں کام کرتے رہے؛ پھر مسلمانوں نے 1905ء میں مسلم لیگ قائم کی'' (صفحہ 57)۔ 1947ء میں ''پاکستان نے قائدِاعظم محمد علی جناح کو اپنا گورنر جنرل چن لیا'' (صفحہ 59)۔ ''1958ء میں مارشل لا نافذ کیا گیا، آئین کو معطل کر دیا گیا، اور یوں بدعنوان اور نااہل سیاسی جماعتوں کی حکومت ختم ہوگئی'' (صفحہ 61)۔ ''پچیس مارچ 1969ء کو صدر ایوب خان نے حکومت فوج کے کمانڈر انچیف، جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کردی اور خود ریٹائر ہوگئے (صفحہ 62)۔ ''مشرقی پاکستان کی آبادی میں ایک کروڑ سے زائد ہندو تھے، اور وہ پاکستان کے وفادار نہ تھے'' (صفحہ 63)۔ 1971ء میں پاکستان ٹوٹنے کا بیان انتہائی گمراہ کن ہے (صفحات 65-63)۔ 1977ء کا شب خون: ''آرمی چیفس نے سوچا کہ یہ ضرب لگانے کا مناسب وقت ہے، اور اُنھوں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا'' (صفحہ 68)۔ جنرل ضیاالحق کے مارشل لا پر تحریر کردہ پورے باب میں فوجی حکومت پر تنقید کا ایک لفظ بھی نہیں (72-69)۔ کتاب اس جملے پر ختم ہوتی ہے: ''مستقبل یہ دیکھنے کا منتظر ہے کہ پاکستان میں مکمل جمہوریت کب لوٹتی ہے'' (صفحہ 72)۔

اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ 1857ء میں پورے ہندوستان کو انگریزوں کی سلطنت قرار دے

دیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس تاریخ سے پہلے انڈیا کیا تھا؟ انڈیا کے گورنر جنرل کو 1858ء میں وائسرائے کا درجہ دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب انڈیا کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاجِ برطانیہ کے تحت کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے گورنر جنرل اور وائسرائے کا عہدہ ایک ہی شخص کے پاس ہوتا تھا۔ وائسرائے کا مطلب ہے بادشاہ یا ملکہ کا نمائندہ۔ سرسید احمد خان تحریک پاکستان کے رہنما نہیں تھے، اور اپنی فطری عمر کے اعتبار سے ہو بھی نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ تحریکِ پاکستان شروع ہونے سے چالیس سال پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ نہ ہی آغا خان نے تحریکِ پاکستان میں کوئی کردار ادا کیا تھا کیونکہ وہ 1940 سے لے کر 1945ء کے درمیان سوئیٹزرلینڈ میں مقیم تھے۔ اُن کی سیاسی پناہ کی شرط تھی کہ وہ مقامی یا غیر ملکی، تمام سیاسی سرگرمیوں سے دستبردار ہو جائیں گے۔ 1885ء سے لے کر 1905ء کے درمیان انڈین نیشنل کانگرس میں بہت کم مسلمان تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 1905ء میں نہیں، 1906ء میں عمل میں آیا تھا۔ جناح کو 1947ء میں پاکستان نے پہلا گورنر جنرل منتخب نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے ہی خود کو اس عہدے کے لیے نامزد کر لیا تھا۔ تاریخ کی زیرِنظر کتاب کے مصنف، جو پاکستان ایئر فورس میں گروپ کیپٹن تھے، کو پتہ ہونا چاہیے کہ فوج میں ایک وقت میں ایک ہی آرمی چیف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ 1977ء میں ''آرمی چیفس'' نے کس طرح شب خون مارا تھا؟

معاشرتی علوم (تاریخ اور عمرانیات)، ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ دوسرا ایڈیشن، اپریل 1970ء۔ مصنف: عبدالغفور چوہدری، بی اے (آنرز) (لندن)، ایم اے، ایم ایس سی (ملیگ)، سینئر ایڈیٹر، ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بک ڈپو، ایڈیٹر: ڈاکٹر دین محمد ملک، ایم اے، پی ایچ ڈی (واشنگٹن)، پروفیسر انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، جامعہ پنجاب، لاہور۔ مترجم: ڈاکٹر شیخ اصغر علی، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈائریکٹر، صوتی و بصری ایڈ، لاہور۔ تعداد اشاعت 5000

اس کتاب کے اردو ایڈیشن کا اردو کتب کے سیکشن میں جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اس انگلش سیکشن کے بارے میں دو نکات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اردو ایڈیشن کے پانچ صفحات (68-64) انگلش ایڈیشن سے حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی تعریف کی

گئی تھی ۔ اس کی جگہ نصف صفحے (صفحہ 46) پر 1958ء کے شب خون پر دبے لفظوں میں تنقید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ایڈیشن کا باب نمبر دس مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔

پیغام بہت واضح ہے ۔ ملک پر حکومت کرنے والے افراد کی قسمت اور درسی کتب کا مواد باہم مناسبت سے رقم ہوتے ہیں ۔ جب 1969ء میں ایوب خان اقتدار میں تھے تو اُس وقت اردو کتاب شائع ہوئی تھی، چنانچہ اُن کی تعریف سے عبارت تھی۔ لیکن جب 1970ء میں اس کا انگلش ترجمہ شائع ہوا تو وہ منظر نامے سے ہٹ چکے تھے ۔ چنانچہ درسی کتاب سے فارغ کر دیئے گئے ۔ ضیا دور میں شائع ہونے والی تمام کتابیں اُن کے اصولوں کی پیروی کرتی دکھائی دیتی ہیں ۔ نتیجہ ظاہر ہے: طلبہ کو تاریخ نہیں، حکمران طبقے (اُس وقت کے) کی تعریف پڑھائی جاتی ہے ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مصنفین سکالر نہیں، خوشامدی درباری ہوتے ہیں۔

مصنف اور ایڈیٹر کی بددیانتی یہ ہے کہ وہ پیش لفظ یا دیباچے میں ان تبدیلیوں کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہتے ہیں ۔ اس لیے ہم اُنہیں بری الذمہ نہیں سمجھتے ۔

جماعت ہشتم

معاشرتی علوم، شائع شدہ علم و عمل بک ڈپو، کراچی، برائے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدرآباد۔ پہلا ایڈیشن، جنوری 1983ء، مصنفین: ایس حامد علی جعفری، مترجم حنیف خان، کریم بخش چنا، تعداد اشاعت: 10,000

''1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی کہلاتی ہے'' (صفحات 113-118)۔ ''اقبال نے 1930ء میں انڈیا کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، میں الگ مسلم ریاستوں کا خواب دیکھا'' (صفحہ 135)۔ قراردادِ پاکستان نے مطالبہ کیا کہ انڈیا کے شمال مغربی اور شمالی مشرقی علاقوں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، کو ملا کر آزاد اور خودمختار مسلم ریاست تشکیل دے دی جائے'' (صفحہ 138)۔ پاکستان دولخت ہونے کا حال چار سطروں میں بیان کیا گیا ہے:
''1970ء میں ملک بھر میں عام انتخابات ہوئے ۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی نشستیں بھاری تعداد میں جیت لیں، جبکہ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں اکثریت حاصل کی۔ دسمبر

1971ء میں ملک کا مشرقی بازو الگ ہوگیا'' (صفحہ 150)۔ ملک کے موجودہ سیاسی نظام کو بیان کرتے ہوئے مارشل لا پر ایک لفظ تک کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی (صفحات 154-150)۔
دیگر بیانات کی تصحیح باب دوم میں۔

معاشرتی علوم: جغرافیہ، تاریخ اور عمرانیات (لازمی) برائے انگلش میڈیم سکولز، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدر آباد، سندھ۔ پہلا ایڈیشن، تاریخ اشاعت 1972ء۔ مصنفین: میاں محمد اسلم (باب اوّل، زمین اور لوگ)، اور ڈاکٹر عبدالحمید (باقی کتاب)۔ نظر ثانی: ایس ایچ اے جعفری، ویسٹ پاکستان ایجوکیشن سروس، کلاس ون (سینئر)۔ مترجم: چوہدری عبدالغفور، ویسٹ پاکستان ایجوکیشن سروس، کلاس ون سینئر (ریٹائرڈ)، شیخ عبدالحق، اور محمد احمد خان۔ شائع شدہ: نفیس اکیڈمی، کراچی۔ تعداد اشاعت: 3,000

پیش لفظ میں مندرجہ بیانات شامل ہیں: ''سوشل سٹڈیز کو 1960ء کے بعد سے ایک الگ مضمون کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ یہ تاریخ، جغرافیہ اور عمرانیات کی جگہ تجویز کی گئی۔ اس نئے مضمون کو متعارف کرانے کا مقصد تاریخ، جغرافیے اور عمرانیات کے درمیان مصنوعی فاصلوں کو ختم، اور ان کے مختلف پہلوؤں کو مربوط کرنا تھا تاکہ طلبہ ان کے باہمی تعلق کو سمجھ سکیں۔ اس سے پہلے سوشل سٹڈیز پر کتابیں اس طرح لکھی گئیں کہ مضمون کے مختلف حصے ایک دوسرے سے الگ تھلگ دکھائی دیتے تھے۔ ان پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نے 1966ء میں سوشل سٹڈیز کے نصاب کی دوبارہ تدوین کا فیصلہ کیا۔ زیر نظر کتاب نئے نصاب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے'' (p.iii)۔ ''یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس مضمون کے مطالعے کی مقصد نہ صرف طلبہ کو حقائق سے آگاہ کرنا، بلکہ اُنہیں اُن کی مستقبل کی ذمہ داریوں سے بھی روشناس کرانا ہے۔ اُن کے دل میں اپنے ملک کے مسائل حل کرنے کا احساس بھی اجاگر ہونا چاہیے'' (p.iv)۔

یہ پیش لفظ چھے مارچ 1967ء کا ہے، لیکن اُس کتاب کے ساتھ شائع ہوا جو 1972ء میں سامنے آئی۔

اس کا پہلا باب جغرافیہ کے متعلق ہے۔ باقی کتاب تاریخ، موجودہ سیاست اور انتظامیہ کے بارے میں بتاتی ہے۔ ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ تمام کتاب میں مشرقی پاکستان کو ابھی تک پاکستان کے ایک حصے کے طور پر لکھا، سمجھا، بیان کیا اور زیر بحث لایا گیا ہے۔ دسمبر 1971ء میں پیش آنے والے سانحے کی وجہ سے ملک ٹوٹ گیا لیکن کتاب میں اس کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ چونکہ یہ کتاب نویں اور دسویں جماعتوں کو دو سال تک پڑھائی جاتی تھی، اس کا مطلب ہے کہ 1974ء تک سکول لیول کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو ملک ٹوٹنے کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔

اب دیکھیں یہ کتاب ہمیں تاریخ کے بارے میں کیا بتاتی ہے:

''ہمارا وطن، پاکستان 1947ء کو وجود میں آیا، لیکن اس کا نام چند سال قبل ہی تاریخ رقم کر چکا تھا۔ کچھ لوگ پاکستان کو ایک نیا ملک سمجھتے ہیں، لیکن یہ بات درست نہیں۔'' (یہ حصہ تاریخ کے ابتدائی جملے ہیں۔ صفحہ 63)۔

کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان چار مختصر جملوں میں مصنف کیا پیغام دینے کی کوشش کر رہا ہے؟

''اسلام کی آمد نے ہندو معاشرے کی اصلاح کی۔ شیخ علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، بہاؤالدین ذکریا، بختیار کاکی، بابا فرید شکر گنج، نظام الدین اولیاء اور دیگر بزرگان دین نے عوام (ہندوؤں) کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اُن کی تعلیمات نے ہندوؤں کی بہت سے توہمات کا خاتمہ کیا اور اُن کی خرابیوں کی اصلاح کی۔ اس طرح قدیم دور کے ہندو مذہب کا خاتمہ ہوگیا'' (صفحہ 73)۔

مجھے ہندوازم یا انڈین ہسٹری پر ایسی کوئی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا جو بتاتی ہو کہ مسلمان پیروں اور صوفیوں کی تعلیمات کی وجہ سے قدیم ہندو مذہب کا خاتمہ ہوگیا۔

''مسلمانوں کے دور میں بادشاہ کی تخت نشینی کا کوئی طے شدہ کلیہ نہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ بادشاہ کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا ہی تخت پر بیٹھے۔ دارالحکومت کے شرفا اور علما بادشاہ کے چناؤ کے عمل میں حصہ لیتے'' (صفحہ 75)

تاریخ کی کتابوں یا سلاطین دہلی اور مغلیہ سلطنت کے دور کے کسی ریکارڈ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ درباریوں یا علما نے بادشاہ کا چناؤ کیا ہو۔ عام طور پر بادشاہ کا وارث ہی تخت کا وارث ہوتا یا کسی اور دعویدار شخصیت کے بازوؤں کی طاقت فیصلہ کن عامل ثابت ہوتی۔ تخت کا وارث ہونے کے

عہدیداروں کے درمیان جنگ ایک معمول کی بات تھی۔ وہ ایک دوسرے کی گردن زنی کرتے، اور بعض اوقات کوئی بے صبر ولی عہد بوڑھے بادشاہ کو قتل کر کے تخت پر قابض ہو جاتا۔ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو قید کرنے، اور اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے پہلے کن علما سے مشورہ کیا تھا؟

کتاب میں ایک صفحہ حاجی شریعت اللہ آف بنگال (108-109) پر ہے، جبکہ چار صفحات (110-113) سید احمد بریلوی پر ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی اسی معمول کا تسلسل دکھائی دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں بنگالی رہنماؤں کا کردار کم دکھایا جائے۔

1857ء کے واقعات: ''انگریز اسے ایک بغاوت، اور اپنے مخالفین کو باغی قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستانی اسے جنگ آزادی کا نام دیتے ہیں'' (صفحہ 113)۔ مصنف نے کوئی دلیل نہیں دی، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سر سید احمد خان نے اس جنگ میں حصہ لینے والوں کو باغی قرار دیا تھا۔

علی گڑھ تحریک کے لیے آٹھ صفحات (120-127)، دیو بند سکول کے لیے ڈھائی (128-130)، انجمن حمایت اسلام، لاہور کے لیے بھی ڈھائی صفحات (135-137)، لیکن 1857ء کے بعد کی بنگالی تحریکوں کے لیے صرف چار صفحات (135-137) ہیں۔

''مسلمانوں نے 1906ء میں جداگانہ انتخابات کا حق حاصل کیا'' (صفحہ 134)۔

مسلمانوں نے 1906ء میں اس کی شملہ میں درخواست کی تھی، اور یہ حق اُنہیں 1909ء میں منٹو مارلو اصلاحات کے تحت ملا۔

''1906ء کے شملہ وفد نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے منتخب شدہ اداروں میں نمائندگی کا حق دیا جائے'' (صفحہ 152)۔ ایسا نہیں تھا۔ وفد نے رعایت مانگی تھی۔ اُنھوں نے اُس سے زیادہ نشستوں کا مطالبہ کیا تھا جتنے وہ آبادی کے تناسب سے حقدار تھے۔

''''کانگرس کے بانی ایلن ہیوم تھے'' (صفحہ 154)۔

نہیں، وہ مسٹر ہیوم کانگرس کے بانی نہیں تھے۔ میں اس نکتے کی وضاحت کر چکا ہوں۔

1919ء کی اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھنو پیکٹ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے (صفحہ 169)۔

قراردادِ لاہور نے ''ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 178)۔

اس کی وضاحت باب دوم میں دیکھیے۔

''مسلمانوں کے وطن کے لیے لفظ 'پاکستان' سب سے پہلے چوہدری رحمت علی نے استعمال کیا، جبکہ وہ کیمبرج میں پڑھتے تھے'' (صفحہ 178)۔ یہ جملہ قراردادِ لاہور کے بیان کے فوراً بعد ہے۔ اس سے قدرتی طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ رحمت علی نے اُس ریاست کا نام تجویز کیا تھا جس کا قراردادِ لاہور میں مبینہ طور پر مطالبہ کیا گیا تھا۔ چونکہ رحمت علی کے لفظ ٹکسال کرنے کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی، اس سے غلط تاثر کا احتمال مزید گہرا ہوتا ہے۔

''پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا'' (صفحہ 185)۔

چودہ نہیں، پندرہ اگست۔ مزید وضاحت کے لیے باب نمبر دو میں دیکھیے۔

''ملک کے دونوں بازوؤں کے ساتھ معاشی ترقی کے حوالے سے یکساں سلوک کیا جاتا تھا.... مشرقی پاکستان کو مختص کردہ وسائل میں زیادہ حصہ ملتا تھا'' (صفحہ 197)۔

یہ مغربی پاکستان کا محض دعویٰ رہا ہے۔ اس میں حقیقت کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ باب دوم میں وضاحت دیکھیے۔

''پارلیمانی نظامِ حکومت کی کامیابی کے لیے دو چیزیں درکار ہیں... منظم سیاسی جماعتیں.... اور مخلص اور بےلوث رہنما'' (صفحہ 205)۔

عام افراد ایسی سطحی اور عامیانہ باتیں کر جاتے ہیں، لیکن یہاں یہ بیان پولیٹیکل سائنس کے ایک سینئر پروفیسر کا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے پروفیسر صاحب دو فاش غلطیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں: پہلی یہ کہ بیان میں شفاف انتخابات، آزاد پریس، کابینہ کی اجتماعی ذمہ داری، حکومت کا احتساب، مضبوط اور محترم اپوزیشن کی ضرورت کے علاوہ اقلیتوں کے تصورات کو برداشت کرنے، ایوان کا اعتماد کھو جانے پر استعفیٰ دے کر گھر چلے جانے، اور آرڈیننس جاری کرنے کی بجائے پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی کی اہمیت کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ قیادت کے لیے بیان کردہ خواص صدارتی طرزِ حکومت کی بھی ضرورت ہیں۔

23 مارچ 1956ء کو بنایا گیا نیا قانون عملی طور پر نافذ نہ ہو سکا'' (صفحہ 208)۔

درحقیقت یہ آئین سات اکتوبر 1958ء تک نافذ تھا۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

ایوب خان کا جنرل یحییٰ خان کے حق میں دستبردار ہونے کا ذکر ہے (صفحات 217-218)، لیکن اس عمل کے غیر قانونی ہونے، اور ملک کے مستقبل پر تباہ کن اثرات مرتب کرنے کا کوئی ذکر تک نہیں۔ 1971ء میں پاکستان ٹوٹنے کا ذکر محض چھ سطروں میں ہے۔ مصنف نے کچھ نہیں بتایا کہ کیا یہ خانہ جنگی تھی، بھارت کے ساتھ جنگ تھی، اس کی وجوہات کیا تھیں، نیز مشرقی پاکستان کیوں الگ ہوا؟

کتاب کی تاریخ اشاعت کو دیکھتے ہوئے توقع کے مطابق اس میں ایک پیراگراف ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار سنبھالنے پر خوش آمدید کہتا، اور قائم ہونے والی نئی حکومت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے (صفحات 218-219)۔

''1956ء کا آئین تئیس مارچ کو نافذ کیا گیا'' (صفحہ 222)۔ تاہم صفحہ نمبر 208 پر بتایا گیا ہے کہ یہ آئین نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ طلبہ بے چارے کس بیان پر یقین کریں گے اور سوال پوچھے جانے کی صورت جوابی کاپی میں کیا لکھیں گے؟

1965ء کی جنگ: ''جب بھارتی حملہ روک لیا گیا، اور پاکستانی فورسز نے پیش قدمی شروع کی تو بھارت جنگ بندی کی کوششیں کرنے لگا'' (صفحہ 259)۔ بے چارے طلبہ کے ذہن میں اتاری گئی مخصوص پاکستانی دانش۔ باب دوم میں وضاحت دیکھیے۔

''ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی تینوں عالمی طاقتوں، امریکہ، روس اور چین، کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرتی ہے'' (صفحہ 265)۔

پاکستان کے خارجہ تعلقات کے حوالے سے امریکہ اور روس کو ایک بریکٹ میں رکھنا حقائق مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ نیز روس کی جگہ سوویت یونین پڑھیے۔

تین پروفیسر صاحبان (جن کے بارے میں گمان ہے کہ انگلش زبان کے ماہر ہوں گے) نے ایسا انداز تحریر اپنایا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جہاں قاری کو ذہنی کوفت برداشت نہ کرنی پڑے۔ کی گئی تمام غلطیوں کی فہرست بنانا ناممکن ہے۔ مواد کے علاوہ زبان وبیان، اور ترجمے کی فاش غلطیاں کی گئی ہیں۔

جماعت: نہم و دہم

مطالعہ پاکستان برائے سیکنڈری کلاسز، جمال بک ڈپو، لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، پہلا ایڈیشن۔ مارچ 1987ء۔ مصنفین: سبطِ حسن اور حفظہ جاوید۔ تیار کردہ برائے پنجاب ٹیکسٹ بورڈ، بحوالہ محکمہ تعلیم، گورنمنٹ آف پنجاب، لاہور۔ نظرثانی و منظور شدہ بجٹل ریویو کمیٹی، گورنمنٹ آف پاکستان، وزارتِ تعلیم۔ تعداد اشاعت: 5000 کاپیاں۔

کتاب کے سرورق کے اندر چیئرمین بورڈ کا والدین اور طلبہ کے نام پیغام ہے کہ وہ بورڈ کی نقلی کتب نہ خریدیں۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے نام نصیحت بھی ہے کہ ''وہ محکمہ تعلیم کی تجویز کردہ، اور شائع شدہ کتب کے علاوہ کوئی اور کتاب نہ خریدیں'' اس اپیل میں بنیادی گرائمر کی پانچ غلطیاں ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جملہ:

Man's mission on earth is to follow and establish God's instructions to His commands.

مصنف کا مدعا گرائمر کے ملبے تک کہیں دب چکا ہے۔

''انڈیا کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکومت اسلامی اصولوں کی بنیاد پر قائم کی... مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکومتوں میں مشاورت کا اصول متعارف کرایا۔ حکمران دنیاوی معاملات میں درباریوں سے، جبکہ مذہبی معاملات میں صوفیوں اور عالموں سے مشورہ کرتے تھے'' (صفحہ 9)۔

تاریخ اور اُس دور کا دستیاب مواد اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتا۔

''اکبر کے دور کے بعد مسلم فوج کا معیار گر گیا.... کمانڈر اتنے آرام پسند ہو چکے تھے کہ وہ محاذ پر پالکیوں میں جایا کرتے تھے'' (صفحہ 12)۔

''1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریز برصغیر پر قابض ہو گئے'' (صفحہ 12)۔ انگریزوں نے 1857ء سے بہت پہلے ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ کیا مصنفین نے ریگولیٹنگ ایکٹ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا؟ انگریزوں نے 1803ء کے بعد دہلی کا کنٹرول سنبھال لیا تھا، اور وہ مغل بادشاہوں کو پنشن دیا کرتے تھے۔

''نواب عبداللطیف نے بنگال میں سرسید کی تحریک کو آگے بڑھایا'' (صفحہ 20)۔ نہیں، نواب صاحب نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ ان کی تحریک بنگال کی مقامی پیش رفت تھی، اس کا سرسید احمد خان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہر مصنف تمام مسلم تحریکوں کا منبع علی گڑھ میں کیوں تلاش کرتا ہے؟

''شملہ وفد نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 23)۔

مصنف نے وفد کے لیے Delegation لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ یہ Deputation تھا۔ نیز اس نے جداگانہ انتخابات کے علاوہ بھی رعایت مانگی تھی۔

''برصغیر میں تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی، جب مصطفیٰ کمال نے ترکی کو ایک ریپبلک قرار دیتے ہوئے خلافت کا خاتمہ کر دیا'' (صفحہ 24)۔ ترکی میں خلافت کے ختم ہونے سے دو سال پہلے تحریک خلافت کا عروج ڈھل چکا تھا۔ ستائیس فروری 1924ء کو وسیاف بے (Vasyf Bey) نے خلافت کے خاتمے کی قرارداد گرینڈ اسمبلی میں پیش کی۔ یکم مارچ کو اتاترک نے اس تجویز کی منظوری دی۔ دو مارچ کو پیپلز پارٹی نے اس کی حمایت کی۔ تین مارچ کو اسمبلی نے اسے منظور کر لیا۔ چار مارچ کو آخری خلیفہ، سلطان عبدالمجید نے دن طلوع ہونے سے پہلے استنبول چھوڑ دیا۔ سات مارچ کو وہ ٹیریٹٹ، سوئٹزرلینڈ پہنچے، اور اپنی وفات تک وہیں قیام کیا۔ یکم جولائی سے انھوں نے نظام حیدرآباد سے تین سو پاؤنڈ ماہانہ پنشن وصول کرنا قبول کر لیا تھا۔

''اقبال انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست چاہتے تھے'' (صفحہ 29)۔ اقبال نے ایسا کبھی کچھ کہا نہ چاہا۔ تفصیل باب دوم میں۔

''یہ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دی جائے..... برصغیر کے مسلمانوں کے لیے شمال مغربی علاقوں میں ایک مسلم ریاست کا قیام ناگزیر ہو چکا ہے'' (صفحہ 29)۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ حوالہ اقبال کے خطبہ الہ آباد سے لیا گیا ہے۔

''انڈین رہنما گول میز کانفرنس میں کسی تصفیے پر نہ پہنچ سکے۔ اس پر انگریز حکومت نے ایک دستور، ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935'' متعارف کرا دیا۔ اس ایکٹ نے صوبوں کو زیادہ اختیارات دے دیے'' (صفحہ 30)۔

درحقیقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ انگریزوں اور ہندوستانی رہنماؤں کی چھے سال (34-1928) پر محیط کانفرنسوں، بحث وتمحیص، گفتگو، مذاکرات اور تحقیقات کا نتیجہ تھا۔

''ماضی میں بھی بہت سے مسلمان رہنما مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کے تصور کی حمایت کر چکے تھے۔ اُن میں علامہ اقبال سب سے مشہور تھے۔ چوہدری رحمت علی نے ریاست کا نام ''پاکستان'' تجویز کردیا تھا۔ تاہم مسلم لیگ نے مسلمانان برصغیر کے لیے ایک الگ ریاست کا باضابطہ مطالبہ 1940ء میں کیا۔ ایک وفاق کے تحت متحد بھارت کسی طور قابل قبول نہ تھا۔ تئیس مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک (اب اس کا نام اقبال پارک ہے) میں مسلم لیگ کے جلسے میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ اس میں ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کیا گیا'' (صفحات 32-31)۔

اس پیراگراف میں حقائق کی چار غلطیاں ہیں، جبکہ ایک اہم نکتے کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔ ان کی تصحیح باب دوم میں کی گئی ہے۔

''مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب شدہ مسلمان ممبران نے 1946ء میں دہلی میں ایک اجلاس منعقد کیا'' (صفحہ 32)۔ مسلمان ممبران کی جگہ مسلم لیگ کے ممبران ہونا چاہیے۔

''ریڈکلف نے مسلم اکثریتی علاقے، جیسا کہ فیروز پور، جالندھر اور گرداسپور انڈیا کو دے دیے'' (صفحہ 33)۔

جالندھر ہندو اکثریت رکھنے والا ضلع تھا۔ فیروز پور کی صرف ایک تحصیل، اور گرداسپور کی دو تحصیلوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

''مشرقی پاکستان کے 1970ء کے سانحے ....'' (صفحہ 36)۔ 1970ء نہیں، 1971ء۔

''1970ء میں مشرقی پاکستان اپنے مدرکنٹری سے الگ ہوگیا'' (صفحہ 38)۔ 1970ء نہیں، 1971ء۔ کیا مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کا مدر کنٹری تھا جبکہ ملک کی زیادہ آبادی مشرقی پاکستان میں رہتی تھی؟ یہی وہ احمقانہ احساس برتری تھا جس کی وجہ سے ملک دولخت ہوا۔ پاکستانیوں نے حالیہ تاریخی سانحات سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔

''اُس وقت کے آرمی چیف جنرل محمد یحییٰ خان ایوب کے جانشین بن گئے'' (صفحہ 45)۔

جنرل یحییٰ خان ایوب کے جانشین نہیں، اُنھوں نے زبردستی اور بلیک میل کرتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ طلبہ کو ان حقائق سے باخبر رکھا جانا چاہیے۔ طلبہ کو یہ بات بھی بتائی جائے کہ اقتدار سنبھالنے پر یحییٰ خان نے خود کو صدرِ پاکستان نہیں، بلکہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور آرمی چیف قرار دیا تھا۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے چند ہفتوں کے بعد اُن کے دفترِ خارجہ میں مشیروں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے اعزازات میں اس عہدے (صدرِ پاکستان) کا بھی اضافہ کرلیں ورنہ بیرونی دنیا اُن کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرے گی، اور اُن کے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس پر جنرل یحییٰ صدرِ پاکستان کا منصب بھی اپنے نام کرنے پر راضی ہوگئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایوب خان اور اُن کی فوج نے صدرِ پاکستان کے منصب کو کس قدر بے توقیر کردیا تھا کہ جنرل یحییٰ بمشکل اسے قبول کرنے پر راضی ہوئے۔ نیز جنرل اپنے فوجی عہدے کو دیگر عہدوں پر فوقیت دیتے ہیں۔

''دسمبر 1970ء میں لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) کے تحت پاکستان کے پہلے عام انتخابات کا انعقاد ہوا تاکہ نیا آئین تشکیل دینے کے لیے عوامی نمائندوں کا چناؤ ہوسکے۔ بدقسمتی سے انتخابات کے بعد ملک سیاسی بحران اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہوگیا۔ ہمسایہ ملک، بھارت نے پاکستان پر حملہ کردیا۔ اس کے نتیجے میں دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہوگیا'' (صفحہ 46)۔ تفصیل باب دوم میں۔

''1977ء میں اپوزیشن جماعتوں نے حکمران جماعت، پیپلز پارٹی پر انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا۔ اس سے ملک میں اشتعال پھیل گیا۔ اپوزیشن جماعتوں نے حکومت کے خلاف تحریک شروع کردی۔ امن و امان کی صورتِ حال بالکل بے قابو ہوچکی تھی۔ فوج نے پانچ جولائی 1977ء کو مارشل لگاتے ہوئے ملک کا کنٹرول سنبھال لیا۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل کردی گئیں؛ 1973ء کا آئین جزوی طور پر ساقط کردیا گیا۔ صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے دسمبر 1981ء میں مجلس شوریٰ کے اراکین کو نامزد کیا۔ مجلس کا پہلا اجلاس جنوری 1982ء میں اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدرِ پاکستان، جنرل محمد ضیاالحق نے بارہ اگست 1982ء کو وعدہ کیا کہ مارچ 1985ء سے ملک میں مکمل طور پر اسلامی نظام نافذ ہوجائے گا۔ اپنی منزل کی جانب ایک قدم اور بڑھاتے ہوئے صدرِ پاکستان نے دسمبر 1984ء میں ملک گیر ریفرنڈم کے ذریعے قوم کا

اعتماد حاصل کرلیا۔ اس کے بعد فروری 1985ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ مارچ 1985ء تک سینٹ، اور خواتین اور اقلیتوں کی خصوصی نشستوں پر انتخابات ہوگئے، اور یوں پارلیمان کی ساخت مکمل ہوگئی۔ اس دوران کچھ ترامیم کے ساتھ 1973ء کا آئین بھی بحال کردیا گیا۔ تیس مارچ 1985ء کو جنرل محمد ضیاالحق نے پاکستان کے منتخب شدہ صدر کا حلف اٹھایا۔ اُسی روز وزیراعظم نے بھی اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس طرح ملک میں اسلامی جمہوری نظام فعال ہوگیا'' (صفحات 58-57)۔ ضیا کے شب خون کا مکمل احوال باب دوم میں پڑھیے۔

''مسلمان اس ملک میں اپنے ساتھ صاف ستھری اور شاندار اسلامی تہذیب اور ثقافت لائے۔ ہندو اسلامی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوؤں نے مسلم تہذیب و ثقافت سے بہت کچھ لیا'' (صفحہ 172)۔ یہ ''صاف ستھری ثقافت'' کیا ہوتی ہے؟ کیا انڈیا کا ہندو کلچر ''گندہ'' تھا؟ جہاں تک مسلم تہذیب سے بہت کچھ لینے کا تعلق ہے تو کیا مسلمانوں نے ہندو تہذیب و ثقافت سے کچھ نہیں لیا؟ کیا آج کے پاکستانی کلچر کا ایک بڑا حصہ ہندو کلچر سے متاثر نہیں؟

''اردو وہ واحد زبان ہے جو تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی پشاور (پاکستان) سے لے کر راس کماری تک پورے برِصغیر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے'' (صفحہ 175)۔

''اردو زبان کی لسانی ساخت اس طرح کی ہے کہ دیگر زبانوں کے اس میں شامل ہونے والے الفاظ اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ اس کی بجائے ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ بنیادی طور پر اردو کے ہی الفاظ تھے'' (صفحہ 176)۔ ''ضروری ہے کہ پاکستان کے ہر خطے کے متعلق کہانیاں، ڈرامے، گیت اور مضامین اردو میں لکھے جائیں، تاکہ ان خطوں کے لوگ انہیں پڑھ کر محظوظ ہوں۔'' (صفحہ 180)۔ اردو کے متعلق باب نمبر دو اور تین میں پڑھیں۔

''پاکستان کی تخلیق سے پہلے سعودی عرب ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے بے حد ہمدردی بھرے جذبات رکھتا تھا'' (صفحہ 204)۔ طلبہ کو ''بے حد ہمدردی بھرے جذبات'' کا کوئی ثبوت، اور چند ایک مثالیں دے دی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ جنرل ضیا کی غیر قانونی حکومت کی حمایت کرنے والے ایک ملک کی اتنی خوشامد کی کسی درسی کتاب، بلکہ کسی بھی کتاب، میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔

جب مصنف نے یہ کتاب لکھی تو وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ پولیٹیکل سائنس کے سربراہ تھے۔ لندن سکول آف اکنامکس سے ماسٹر کی ڈگری بھی رکھتے تھے۔ غلطیوں سے لبریز یہی کتاب سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ نے کراچی اور حیدرآباد کے بورڈز کی انٹرمیڈیٹ کلاسز کے لیے منظور کی تھی۔ غالباً اس کتاب کی یہی وہ عظیم علمی کاوش تھی جس کی وجہ سے پروفیسر مالک کو جنوری 1990ء میں بیرنچ سکول سسٹم لاہور کے بورڈ کا مشیر مقرر کیا گیا۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں لاہور کالج آف آرٹس اینڈ سائنسز (جو بہترین پرائیویٹ انگلش میڈیم ادارہ ہے) کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

مطالعہ پاکستان، نہم و دہم۔ حل شدہ پرچہ جات۔ مختصر جواب۔ معروضی سوال و جواب۔ آزاد پبلشرز۔

''اقبال وہ پہلے اہم شخص تھے جنہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 11)۔ ''اقبال نے بار ایٹ لا کا امتحان پاس کیا، اور پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی چلے گئے'' (صفحہ 55)۔ ''درحقیقت یہ علامہ اقبال تھے جنہوں نے مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ سرزمین کا تصور پیش کیا۔ اُن کا 1930ء کا خطبۂ الہ آباد دوقومی نظریے، اور انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا سب سے پہلا تصور پیش کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے 1930ء میں گول میز کانفرنس کے دوران اس تصور کی مزید وضاحت کی'' (صفحات 55-56)۔ ''جناح بار ایٹ لا کرنے انگلینڈ گئے'' (صفحہ 56)۔ ''قراردادِ پاکستان کہتی ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ملا کر ایک آزاد ریاست تشکیل دے دینی چاہیے'' (صفحہ 57)۔ ''کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان اسلامی ثقافت کی سچی تصویر پیش کرتا ہے'' (صفحہ 98)۔ ''اردو پاکستان کی قومی، اور دنیا کی ایک اہم زبان ہے۔ مسلم دورِ حکومت کے آغاز سے ہی اردو کو اہمیت ملنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کی مقبولیت کا سہرا صوفیوں اور بزرگوں کے سر ہے جنہوں نے اردو میں لکھا... انگریزوں کی آمد تک مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی اسے اپنا چکے تھے'' (صفحہ 98)۔ اردو کی مقبولیت کی مندرجہ ذیل وجوہات بتائی جاتی ہیں: ''یہ زبان دوسری زبانوں کو اپنے اندر سمونے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے.... اسے ملک بھر میں بولا اور سمجھا جاتا ہے.... صوفیوں، بزرگوں اور

شاعروں نے اس میں بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ یہ مذہبی سوچ رکھنے والے مسلمان عوام میں مقبول ہوگئی۔ ملک کے بہت سے حصے دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو نے اُن کے صوبے میں جنم لیا'' (صفحات 98-99)۔

اقبال نے گول میز کانفرنس کے دوران پاکستان کے بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ تمام مسلمان صوفیوں اور بزرگوں نے عربی یا فارسی یا دونوں زبانوں میں لکھا۔ اردو میں کسی نے نہیں لکھا۔ اگر پاکستان اسلامی ثقافت کی سچی تصویر پیش کرتا ہے تو اس ثقافت کو نئے معانی دیے جانے، اور اس کی نئی تعریف کرنے کی ضرورت ہے۔ طلبہ کو بے وقوف بنانے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ دیگر غلطیوں کی باب دوم میں تصحیح کردی گئی ہے۔

کلاس گیارویں اور بارویں

مطالعہ پاکستان (لازمی) برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز، شائع شدہ شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی۔ ستمبر 1983ء۔ وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد کی زیرِ نگرانی تیار کردہ۔ پنجاب، سندھ، این ڈبلیو ایف پی، بلوچستان، وفاقی علاقہ جات اور آزاد کشمیر کے محکمہ تعلیم سے منظور شدہ۔ وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد۔ نوٹی فی کیشن نمبر F.11-16/81-HST، بتاریخ دو نومبر 1981ء، انٹرمیڈیٹ کلاسز کے لیے تجویز کردہ واحد کتاب۔ مصنفین: ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر امین اللہ، سعید الدین احمد ڈار، اقبال بخت اور ڈاکٹر اظہر حمید۔ ایڈیٹر: ڈاکٹر اظہر حمید۔

سیکرٹری تعلیم، حکومت پاکستان کی طرف سے پیش لفظ میں بتایا جاتا ہے کہ ''مطالعہ پاکستان پر کتاب حذا وزارتِ تعلیم کی شائع کردہ کتاب کا درست ترجمہ ہے۔ اس کی اشاعت کی وجہ انگلش ایڈیشن کی زبردست مانگ تھی'' (صفحہ v)

''اپنے مشہور خطبے (الہ آباد 1930) میں علامہ اقبال نے پوری قوت سے ایک اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا تحفظ کیا جا سکے'' (صفحہ 4)۔ ''انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد لارڈ ہیوم نے 1885ء میں رکھی'' (صفحہ 27)۔ بانکم چندرا چٹرجی

کے ناول ''آنند اماتھ'' کو ''آنند سکھ'' لکھا گیا ہے (صفحہ 28)۔ ''علامہ اقبال نے 1930ء میں زور دیا کہ اگر مسلمانان برصغیر اپنی روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق رہنا چاہتے ہیں تو لازمی ہے کہ وہ اپنے لیے ایک الگ ریاست قائم کریں (صفحہ 36)۔ ''رحمت علی نے پاکستان کا نام اُس ملک کے لیے تجویز کیا جسے قرار دادِ لاہور میں کیے گئے مطالبے کے تحت قائم کیا جانا تھا'' (گویا فاضل مصنفین کے نزدیک رحمت علی نے 1940ء کے بعد یہ نام تجویز کیا تھا) (صفحہ 39)۔ مسلمانان برصغیر نے اپنی آخری جنگِ آزادی 1857ء میں لڑی'' (صفحہ 82)۔ ''پاکستان زبانوں کا منبع مذہبی موضوعات میں تلاش کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اسلام ہی تمام پاکستانی ادب کا سرچشمہ ہے'' (صفحہ 85)۔ ''تاریخی طور پر اردو مسلمانان برصغیر کی زبان، اور ہماری قومی شناخت کی علامت ہے... یہ ملک کے تمام حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے'' (صفحہ 86)۔ 1971ء میں ملک کے دولخت ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ''1971ء کے آغاز میں ہی مشرقی پاکستان میں امن وامان کی صورتِ حال دگرگوں ہونے لگی تھی۔ بھارت نے اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ایجنٹ داخل کر دیے۔ اُنھوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے شورش پسندوں کو تربیت دی اور اُنہیں مالی وسائل فراہم کیے۔ اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے بھارت نے نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اندرونی مواصلات منقطع ہونے، اور مغربی پاکستان سے کمک نہ پہنچے کے باوجود پاکستانی افواج بہت بہادری سے لڑیں۔ لیکن حالات اُن کے خلاف تھے۔ اُنہیں وسط دسمبر میں ہتھیار ڈالنے اور ہر قسم کی مزاحمت روکنے کا حکم دیا گیا'' (صفحات 98-97)۔

ہیوم لارڈ نہیں تھے، اور نہ ہی اُنھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی تھی۔ غلط بیانات کی تصحیح باب دوم میں دیکھیے۔

تاریخ پاکستان، مصنف: پروفیسر رفیع اللہ صاحب، شائع شدہ: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ 1989۔ دراصل یہ ایک نیا ایڈیشن ہے، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا گیا، اور نہ ہی سابق ایڈیشنز کی تاریخ درج ہے۔

فاضل مصنف لاہور کے اعلیٰ پائے کے تعلیمی اداروں میں عربی یا اسلامیات پڑھاتے ہیں۔

اس کتاب سے انٹرمیڈیٹ کے بہترین طلبہ استفادہ کرتے ہیں۔ ڈگری کلاسز کے کچھ طالب علم بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔

''بہت سے مغربی اور ہندو مصنفین نے اورنگ زیب کو ایک مذہبی جنونی کے طور پر پیش کیا ہے، جو کہ وہ نہیں تھے۔ اُنھوں نے زیادہ تر انہی پالیسیوں کو جاری رکھا جو اکبر کے عہد میں شروع کی گئیں۔.... حتیٰ کہ اُن کے بدترین دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ روادار، وسیع القلب اور ہمدرد تھے'' (صفحہ 33)۔ ''آزادی کی جنگ 1857ء میں لڑی گئی۔ اس دوران انگریزوں پر گھبراہٹ طاری تھی'' (صفحہ 63)۔ انہی صفحات میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کو باغی سپاہی بھی کہا گیا ہے (صفحہ 69)۔ کتاب کے مطابق گول میز کانفرنس 1913ء میں ہوئی (صفحہ 78)۔ ''قرار دادِ پاکستان تیس مارچ 1949ء کو منظور ہوئی'' (صفحہ 83)۔ سرسید احمد خان نے ''پاکستان کی بنیاد اُسی وقت رکھ دی تھی جب اُنھوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا'' (صفحہ 83)، اور ''اس سکول کے قیام کو درحقیقت پاکستان کی بنیاد کی خشتِ اوّل کہا جا سکتا ہے'' (صفحہ 88)۔ اقبال نے اپنا انتیس دسمبر 1931ء کو الہ آباد کا خطبہ دیا، جبکہ خطبے سے بطور حوالہ لیا گیا ایک پیراگراف بھی غلط ہے (صفحہ 92)۔ ''1860ء میں برِصغیر کی زبان اردو تھی'' (صفحہ 102)۔ علامہ اقبال نے الہ آباد میں ''برِصغیر کی تقسیم کے منصوبے کو تفصیل سے بیان کیا، اور بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں اسی سکیم کی منظوری دی گئی'' (صفحہ 113)۔ ''برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت برِصغیر کے عوام کو اپنی مرضی سے حکومت سازی کا اختیار دے دیا'' (صفحہ 113)۔ ''لکھنو پیکٹ برِصغیر کی سیاسی تاریخ کا ایک سنگِ میل تھا'' (صفحہ 117)۔ ''سائمن کمیشن کا کانگرس اور مسلم لیگ، دونوں نے بائیکاٹ کیا'' (صفحہ 118)۔ ''نہرو رپورٹ 1926ء میں شائع ہوئی'' (صفحہ 118)۔ ''1930ء میں اقبال نے مسلمانانِ برِصغیر کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 122)۔ ''قرار دادِ لاہور میں انڈیا کے شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، کو ملا کر ایک مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا'' (صفحہ 124)۔

مصنف کو کچھ حقائق مدِنظر رکھنے چاہیے تھے۔ چاہے اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندر ڈھائے تھے یا نہیں، اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک سخت گیر فقہ (حنفی) ضرور نافذ کر دی۔ اس سے

پہلے اپنے والد کو تخت سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا، اپنے بھائیوں کو قتل کیا، ہر قسم کی آزادی سوچ پر پہرے بٹھا دیے، موسیقی اور مصوری پر پابندی لگا دی، اور سلطنت کے تمام مالی اور عسکری ذرائع جنوبی ہندوستان میں شیعہ ریاستوں کو تباہ کرنے کے لیے جھونک دیے، جس کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔ اورنگ زیب کس حوالے سے روادار، وسیع القلب اور ہمدرد تھے؟ شاید کسی بھی مورخ کے لیے اکبر اور اورنگ زیب کی پالیسیوں میں ہلکی سی مماثلت تلاش کرنا ممکن نہ ہو۔ گول میز کانفرنس 32-1930ء میں ہوئی، نہ کہ 1913ء میں۔ اقبال نے خطبہ الہ آباد 1931ء میں نہیں 1930ء میں دیا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء نے انڈیا کو حکومت سازی کا اختیار نہیں دیا تھا، اس نے وفاقی نظام سے ملتی جلتی ایک سکیم وضع کی تھی جس میں مرکزی اختیار ایک غیر نمائندہ افسر، گورنر جنرل کے پاس تھا، اور اُس کا کوئی احتساب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ایکٹ کے ذریعے صوبوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا گیا، جبکہ اس کے وفاقی حصے کو کبھی نافذ نہ کیا گیا۔ نہرو رپورٹ 1926ء میں نہیں، 1928ء میں شائع ہوئی تھی۔ مزید تصحیح باب نمبر دو میں۔

''تحریک خلافت کا تمام دم خم 1922ء میں ختم ہو گیا جب ترکی کے سلطان کو معزول کر دیا گیا'' (صفحہ 170)۔ ''سائمن کمیشن کی صورت انڈیا پر مسلط کی جانے والی تذلیل کے جواب میں 1926ء میں مسلم لیگ اور کانگرس نے ایک آئینی مسودہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا'' (صفحہ 170)۔ کتاب میں انڈین نیشنل کانگرس کو ''آل انڈیا نیشنل کانگرس'' لکھا گیا ہے (صفحہ 171)۔ ''قرارداد پاکستان تیس مارچ کو منظور کی گئی'' (صفحہ 172)۔ ''نو اپریل 1949ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ارکان اسمبلی کا اجلاس دہلی میں ہوا'' (صفحہ 202)۔

1926ء میں انڈیا کے لیے آئینی مسودے کی تیاری میں مسلم لیگ کانگرس کے ساتھ شریک نہیں تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ نہیں کیا تھا، صرف مسٹر جناح کی قیادت میں اس کے ایک دھڑے نے ایسا کیا تھا۔ نہرو رپورٹ 1928 میں پیش کی گئی۔ مزید وضاحت باب دوم میں۔

''موجودہ مارشل لا حکومت نے پوری ایمانداری سے ویسا ہی اسلامی نظام نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا قائداعظم نے قوم سے وعدہ کیا تھا'' (صفحہ 207)۔ پاکستان ''ستائیس جون

1947ء'' کو وجود میں آیا (صفحہ 211)۔''انیس جولائی 1947ء'' کو دو آزاد ریاستیں وجود میں آئیں (صفحہ 212)۔این ڈبلیو ایف پی کو ''شمال مغربی صوبہ'' لکھا گیا ہے (صفحہ 212)۔یحییٰ خان نے ''یکم مارچ 1970'' کو ڈھاکہ میں ہونے والا قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا (صفحہ 214)۔

کیا جنرل محمد ضیاالحق کے نافذ کردہ اسلامی نظام کا قائدِاعظم محمد علی جناح نے کہیں وعدہ کیا تھا؟ کیا اس کے حق میں قائد کی کسی تقریر یا تحریر کا حوالہ دیا جا سکتا ہے؟ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیں کہ قائدِاعظم ایسا اسلامی نظام ہی چاہتے تھے، تو کیا وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ایک فوجی آمر اقتدار پر زبردستی قبضہ جمائے اور کسی اخلاقی اور قانونی جواز کے بغیر آرڈیننس کے ذریعے اسے قوم پر مسلط کر دے؟ کتاب قیامِ پاکستان کی درست تاریخ بتانے سے قاصر ہے۔

''ایوب خان کی طرف سے ملک کا کنٹرول سنبھالنا ایک موثر انقلاب تھا۔اس کی توثیق کرنے والے سپریم کورٹ کے فیصلے پر تنقید ملک کے سیاسی کلچر اور تبدیل ہوتے طاقت کے توازن کو مدِنظر رکھنے میں ناکامی کا ثبوت ہے ۔ عدالت نے ان عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ دیا تھا''۔ (صفحہ 221)۔''یہ جنرل یحییٰ خان کی بدقسمتی تھی کہ وہ پاکستان کے دولخت ہونے کے وقت اس کے حکمران تھے۔اس سانحے میں اُن کی اپنی غلطی بھی شامل تھی۔انڈیا کے ساتھ 1971ء کی تباہ کن جنگ کے بعد اُن کی توہین آمیز طریقے سے رخصتی کے بعد پیپلز پارٹی کو اقتدار سنبھالنے کا موقع مل گیا'' (صفحہ 222)۔''بھٹو ایک آمر ثابت ہوئے، اور اُنھوں نے 1977ء کے انتخابات میں اس کا عملی مظاہرہ کیا۔ان انتخابات کے بعد ملک میں بے چینی کی آگ دہک اٹھی، جو دیکھتے ہی دیکھتے عوامی احتجاج کے غیر معمولی لاوے میں بدل گئی۔اس کے نتیجے میں پانچ جولائی 1977ء کو مارشل لا نافذ کرنا پڑا'' (صفحہ 223)۔''یہ مارشل لا حزبِ اقتدار اور اپوزیشن جماعتوں کے درمیان تصادم، جس نے ملک کو خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا، کی وجہ سے لگانا پڑا تھا'' (صفحہ 223)۔

کیا سیاسی جماعتیں سپریم کورٹ سے مطالبہ کرتی ہیں جو یہ فوج کی طرف سے آئینی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے اقدام کی نہایت خوشدلی سے توثیق کر دیتی ہے؟ 1971ء میں ملک کے دولخت ہونے، اور ضیا کے مارشل لا پر دوسرے باب میں پڑھیے۔

''علاقائی زبانیں، پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی اُنھی ثقافتی عوامل کی پیداوار ہیں جن کے

نتیجے میں اردو وجود میں آئی۔اس سے ایک بڑی حد تک پاکستان کی ثقافتی ہم آہنگی قائم ہوتی ہے،اگر ہم ثقافت سے مراد زبانوں کی ہم آہنگی اور جذباتی یگانگت کے بے کیف معانی نہ بھی لیں''(صفحہ 226)۔''اردو پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔درحقیقت یہ برصغیر میں رابطے کی زبان تھی۔ اب یہ انڈیا میں بھی رابطے کی زبان بن سکتی ہے۔اردو کے بعد ملک کے زیادہ تر حصوں میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان پنجابی ہے''(صفحہ 227)۔''پاکستان میں بہت سے کھیل کھیلے جاتے ہیں،جن سے ہماری ثقافتی شناخت کا اظہار ہوتا ہے۔ان کھیلوں میں کشتی، ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، سکوائش اور کبڈی شامل ہیں''(صفحہ 228)۔

1981ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں آبادی کا سب سے بڑا حصہ پنجابی بولتا ہے۔ اردو بولنے والوں کی تعداد صرف 7.60 فیصد ہے۔فٹ بال اور کرکٹ سے ہماری ثقافتی شناخت کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ ہم نے یہ دونوں کھیل انگریزوں سے لیے ہیں۔اس حساب سے تو انگلش زبان اور مغربی لباس سے بھی ہماری ثقافتی شناخت کی عکاسی ہونی چاہیے۔کیا ایسا ہے؟ مزید وضاحت کے لیے باب دوم دیکھیے۔

ایک پورا باب (صفحات 88-80) سر سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک کے بارے میں ہے ۔ان کے حوالہ جات دیگر ابواب میں بھی ہیں۔لیکن تحریکِ پاکستان میں بنگالی قوم پرستوں کے کردار کا کوئی ذکر نہیں۔

ہر باب کے اختتام پر دیے گئے حوالہ جات،اور کتاب کے اختتام پر ضمیمے کے طور پر دیے گئے حوالہ جات انتہائی ناقص ہیں۔مثال کے طور پر جے ایم کینز کی'' The General Theory of Employment, Interest and Money'' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب 1957ء میں شائع ہوئی تھی۔کتابوں کے مکمل ٹائٹل نہیں دیے گئے ہیں،اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ جن صاحب کا نام اس پر لکھا ہوا ہے، وہ مصنف ہے یا ایڈیٹر۔سب سے حیران کن بیان یہ ہے کہ ڈی پی سنگھال کی ''A History of Indian People'' انگریز مورخ کی تحریر کردہ ہے۔کتاب کے پیراگرافس متعدد ابواب میں بطور حوالہ جات شامل کیے گئے ہیں۔شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ مبینہ ''انگریز مورخ'' برطانوی حکومت کا ناقد ہے (صفحات: 73,71,64,41)۔شاید مذکورہ کتاب کے

مصنف کو علم نہیں کہ ڈاکٹر سنگھال ایک ہندوستانی دانشور تھے۔

کتاب میں انگلش زبان کا معیار ان چند ایک مثالوں سے ظاہر ہو جاتا ہے:

Many of the problems he had to encounter, were brewing for some time (P.33)

As a result, he did not adopted it as the official code of empire (P.33)

Ministers took over the reign of the governments (P.33)

The struggle for Pakistan culminated in the establishment to Pakistan in August 1947.

It is unfortunate that the Quaid soon parted us on September11, 1948.

ڈگری لیول

جنرل ضیا الحق کی فوجی حکومت نے کالج لیول پر سائنس، آرٹس، قانون، انجینئرنگ، ٹیکنالوجی، میڈیسن وغیرہ کی تمام کلاسز کے لیے مطالعہ پاکستان لازمی قرار دینے کا فیصلہ کیا، تاکہ کوئی لڑکا یا لڑکی اُس وقت تک ڈگری امتحان میں کامیاب تصور نہ کیا جائے جب تک وہ مطالعہ پاکستان کے پرچے میں کامیاب نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے وفاقی وزارتِ تعلیم، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور چند ایک دیگر سرکاری شعبوں کی بہت سی کمیٹیوں اور ذیلی کمیٹیوں کی مشترکہ کاوشوں سے ایک بہت خاص کتاب تیار کی گئی۔

نصاب تیار کرنے کے لیے پروفیسر محمد اسماعیل سیٹھی، ممبر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، اور ڈاکٹر شیر محمد زمان، سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے مشاورت کی گئی۔ ریسرچ سوسائٹی کے سابق ڈائریکٹر، ڈاکٹر عبدالحمید کورس کمیٹی اور کورس ٹیم کی میٹنگز کی روحِ رواں تھے۔ کتاب کی تیاری میں علامہ اقبال اوپن یونیوسٹی کے اُس وقت کے وائس چانسلر، ڈاکٹر محی الدین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

کورس ٹیم مندرجہ افراد ماہرین پر مشتمل تھی:

معاون:

ڈاکٹر اظہر حمید

اراکین:

پروفیسر شریف المجاہد (ڈائریکٹر قائدِ اعظم اکیڈمی، کراچی)

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی (صدر شعبہ پولیٹیکل سائنس، جامعہ پنجاب، لاہور)

ڈاکٹر عبدالحمید (سابق ڈائریکٹر ریسرچ سوسائٹی پاکستان، لاہور)

ڈاکٹر صفدر محمود (ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، پاکستان سپورٹس بورڈ، اسلام آباد)

پروفیسر جاوید اقبال سید

مسز مظفر قریشی

عبدالحمید راٹھور

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

جلیل قاضی

ایڈیٹر نصاب

ڈاکٹر اظہر حمید

سینئر ایڈیٹر

بشیر احمد

کتاب کے ابواب اور اُن کے مصنفین کی فہرست اس طرح ہے:

1۔ نظریہ پاکستان، مصنف ڈاکٹر اظہر حمید (نظر ثانی پروفیسر شریف المجاہد) (صفحات 28-1)

2۔ ارض پاکستان، مصنف ڈاکٹر اظہر حمید (نظر ثانی ڈاکٹر محمد سعد) (صفحات 56-29)

3۔ برصغیر میں اسلامی معاشرے کی تشکیل اور ارتقاع، مصنف پروفیسر محمد اسلم (نظر ثانی خواجہ سعید الدین ڈار) (صفحات 80-57)

4۔ تحریک پاکستان، مصنف ڈاکٹر منیر الدین چغتائی (نظر ثانی ڈاکٹر صفدر محمود) (صفحات 81-132)

5۔ پاکستان کے لیے جدوجہد، مصنف محمد جہانگیر عالم (نظر ثانی ڈاکٹر انعام الحق) (صفحات 133-168)

6۔ تحریک پاکستان میں علما، ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور خواتین کا کردار، مصنف حکیم آفتاب حسن قرشی (نظر ثانی پروفیسر محمد اسلم) (صفحات 169-208)

7۔ قیام پاکستان، مصنف ڈاکٹر اظہر حمید (نظر ثانی ڈاکٹر رفیق افضل) (صفحات 209-238)

8۔ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوششیں، مصنف پروفیسر ذکریا ساجد (نظر ثانی کرم حیدری) (صفحات 239-272)۔

9۔ پاکستان اور اسلامی دنیا، مصنف خواجہ سعید الدین ڈار (نظر ثانی ڈاکٹر رفیق افضل) (صفحات 273-302)۔

یہ کتاب اظہر پبلشرز، لاہور نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لیے ''مطالعہ پاکستان (لازمی)'' کے عنوان سے شائع کی۔ دوسرے ایڈیشن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ڈاکٹر غلام علی الانہ کا تحریر کردہ پیش لفظ شامل ہے۔ اس پیش لفظ میں بتایا گیا ہے کہ اب پیش کیا گیا مواد کچھ اضافے کے ساتھ مکمل طور پر نظر ثانی اور تصحیح شدہ ہے۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے وقت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ڈاکٹر احمد محی الدین کا تحریر کردہ پیش لفظ بھی موجودہ ایڈیشن میں شامل ہے۔ اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں ملک کے قابل ترین ماہرین کا تعاون شامل ہے۔

کتاب میں موجود تاریخی علم کا اظہار مندرجہ ذیل بیانات اور جملوں سے ہوتا ہے:

''1930ء میں علامہ اقبال نے بہت وضاحت اور صراحت سے ہندوستان کی تقسیم کا تصور پیش کیا''۔ ڈاکٹر غلام علی الانہ کا تحریر کردہ پیش لفظ (صفحہ ix)

اقبال اور پاکستان کے تصور کی وضاحت باب دوم میں دیکھیے۔

''انگریزوں کو اپنی طاقت اور دولت پر بہت ناز تھا، اور وہ بہت زیادہ نسلی تعصب رکھتے تھے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہر ہتھیار آزمایا، تحریر اور تقریر پر پہرے بٹھائے، انھیں ملازمت کے حق سے محروم کر دیا، اور انھیں تعلیمی طور پر پسماندہ رکھنے کی پوری کوشش کی۔۔۔ مختصر یہ کہ برطانیہ نے پورے دور میں مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے بچوں کا سا سلوک کیا'' (صفحہ 8)۔

یہ انتہائی مبالغہ آرائی ہے۔ انگریز راج کے دوران انڈیا کے مسلمان (اور دیگر اقوام) تقریر وتحریر کی اُس سے کہیں زیادہ آزادی رکھتے تھے جس کا 1947ء کے بعد سے پاکستانی اپنی حکومت کے دوران خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ انگریزوں نے سر سید احمد خان کے قائم کردہ ایم اے او کالج علی گڑھ، اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بے حد سرپرستی کی۔ بنگال میں کلکتہ محمڈن لٹریری سوسائٹی کو سرکاری امداد اور معاونت حاصل تھی۔

''مسلمانوں نے کبھی دل سے انگریز راج کو قبول نہیں کیا تھا'' (صفحہ 9)۔

واقعی؟ تو پھر اُنھوں نے انگریز راج کے تحت کم وبیش دو سو سال کیسے گزار لیے؟ کچھ مسلمان رہنما اور حکمران انگریزوں کی طرف سے دیگر مسلمانوں بادشاہتوں اور فوجوں کے خلاف کیوں لڑے تھے؟ کچھ غیر معمولی اوقات، جیسا کہ بغاوتِ ہند کے بعد اور تحریکِ خلافت کے دوران، کے علاوہ وہ انگریز سرکار کے ساتھ مجموعی طور پر بہت خوشی کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ درحقیقت مسلمان سیاست، خاص طور پر مسلم لیگ انگریز وفاداری کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ متوازن سوچ رکھنے والے مورخین کو یہ تاریخی حقائق کھلے دل سے تسلیم کرنے چاہییں، اور اس پر ندامت محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ 1906ء سے لے کر 1947ء تک مسلم لیگ کے رہنماؤں کی اکثریت، بنگال یونائیٹڈ پارٹی، کئی ایک سندھی مسلمانوں کی پارٹیاں، پنجاب کی یونینسٹ پارٹی، اور یوپی کے تمام مسلمان دھڑے، نواب، خان بہادر، تعلق دار، زمیندار، درباری، سرکا خطاب پانے والے، پنشن وصول کرنے والے، بمبئی اور کلکتہ کے کاروباری افراد، اور شہروں کے نمایاں پروفیشنلز انگریز اسٹبلشمنٹ کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے اور اس پر ناز کرتے تھے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کمیٹی کے مسلمان اراکین، گول میز میں شامل مسلم وفود، مسلم لیگ مجلس عاملہ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس ایگزیکٹو بورڈز اور دیگر نمائندہ تنظیموں کے مسلم اراکین کو

دیکھیں تو اس طویل فہرست میں بڑے بڑوں کے نام آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر چاپلوسی میں ڈوبا مرثیہ لکھا، 18-1914ء کی جنگ کے دوران وہ ریکروٹمنٹ میٹنگز میں شریک ہوتے رہے، سر مائیکل اوڈائر، گورنر پنجاب، کی منظوم تعریف کی، اور یوں سر کے خطاب کے مستحق ٹھہرے۔ اُن سے پہلے سر سید احمد خان نے ''جنگِ آزادی'' کے ''مجاہدین'' کو بہانگ دھل باغی قرار دیا تھا۔ اور تو اور، ندوہ کی مقدس قیادت بھی وقت آنے پر انگریز سرکار کی خوشامد میں کسی سے پیچھے نہ رہی۔ دارالعلوم کی افتتاحی تقریب میں کی گئی تقاریر پڑھیں تو گمان ہوگا کہ یہ مسلمان علما کی نہیں، چرچ آف انگلینڈ کے پادریوں کے خطبے ہیں۔۔ آغا خان کی برطانوی استعمار سے گہری دوستی تھی، اور اُنھوں نے کبھی اسے راز میں نہیں رکھا تھا۔ مسلمانوں میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی۔

مسلم سیاست میں وفاداری کا عنصر اتنا غالب تھا کہ درسی کتاب کچھ بھی کہتی رہے، اس سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ حقیقی تاریخ کے صفحات اس وفاداری سے عبارت ہیں؛ اُس وقت کے اخبارات میں اس کا برملا اظہار ملتا ہے؛ کتابوں کے صفحات اس سے سیاہ ہیں؛ دانشوروں کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ لیکن یہ حکومت اور اس کے تنخواہ دار نام نہاد ماہرینِ تعلیم ہیں جنھوں نے شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ حقائق سے گریز ایک بات، لیکن یہاں ستم یہ ہے کہ حکومت اپنے نوجوان طلبہ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی نام نہاد دانش نوجوان طلبہ اور تاریخی سچائیوں کے درمیان مکر کا پردہ تانے ہوئے ہے۔

''یہ ملک مسلمانوں کی واضح اکثریت رکھنے والا ملک ہے؛ اسے ایک نظریے کی بنیاد پر تخلیق کیا گیا؛ اور یہ نظریہ مسلمانوں کا مذہب، اسلام ہے۔ نظریۂ پاکستان کی عام فہم تعریف یہی ہے'' (صفحہ 16)۔

کوئی کند ذہن غبی بھی اس سے زیادہ احمقانہ جملہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ اگر نظریہ اور اسلام ایک ہی چیز ہیں، اور پھر ان کے لیے دو الفاظ استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر نظریۂ پاکستان ہی وہ اسلام ہے جو پاکستان کے مسلمان رکھتے ہیں تو اس کا بظاہر مطلب یہی بنتا ہے کہ مسلمان اسلام کے علاوہ بھی کسی اور مذہب کے پیروکار ہیں۔

نظریۂ پاکستان کے بانیوں کی فہرست میں مولانا محمود الحسن اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی

شامل ہیں (صفحہ 20-19)۔ یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ وہ مسلم لیگ کے بدترین مخالف تھے، اور مولانا مودودی تو قیام پاکستان کے خلاف تھے۔

مزید تفصیل باب نمبر دو میں۔

''علامہ اقبال وہ پہلے مفکر تھے جنہوں نے مثبت اور نظریاتی بنیادوں پر برصغیر میں ایک الگ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 22)۔

اقبال ایسا تصور پیش کرنے والے پہلے رہنما نہیں تھے۔ نیز اُنھوں نے 1930ء میں کسی الگ ریاست کا تصور پیش نہیں کیا تھا۔ جب اُنھوں نے 1937ء میں علیحدگی کی حمایت کی تو اُن کے پیش نظر معاشی اور سیاسی معاملات تھے، نہ کہ کوئی نظریہ وغیرہ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے احیا کے باب میں شاہ ولی اللہ، دیوبند، علی گڑھ تحریک، ندوۃ العلوم، جامعہ ملیہ، دہلی، اور انجمن حمایتِ اسلام، لاہور کا ذکر ہے۔ بنگال سے کسی شخص یا ادارے پر ایک لفظ بھی نہیں ملتا (صفحات 79-75)۔

1857ء کے واقعات کو ''جنگِ آزادی'' قرار دیا ہے (صفحہ 90)۔

مزید تفصیل باب دوم میں۔

لکھنو پیکٹ کو مسلم لیگ کی فتح قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کی وجہ سے پنجاب اور بنگال کے مسلمان اپنے اپنے صوبے میں حکومت کرنے کے حق سے محروم ہوگئے (صفحات 96-95)۔

باب نمبر دو میں لکھنو پیکٹ پر مفصل بات کی گئی ہے۔

''یہ مولانا محمد علی تھے جنہوں نے یکم جنوری 1929ء کو دہلی میں کل جماعتی مسلم کانفرنس کا اجلاس بلایا'' (صفحہ 99)۔

تصحیح باب دوم میں۔

''1930ء کے بعد سے ہندو اکثریتی علاقوں اور مسلم اکثریتی علاقوں کی بنیاد پر انڈیا کی تقسیم کا تصور مقبولیت حاصل کرنے لگا تھا۔ اُس وقت علامہ اقبال نے اپنے الہ آباد کے خطبے میں اس تصور کا کھل کر اظہار کیا'' (صفحہ 102)۔

''1890ء میں عبدالحلیم شرر نے مطالبہ کیا کہ انڈیا کو ہندو صوبوں اور مسلم صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے'' (صفحہ 102)۔ مولانا نے صوبے نہیں، اضلاع کہا تھا۔

''انگلینڈ میں مقیم کچھ مسلمان طلبہ نے گول میز کانفرنس کے دوران علامہ اقبال سے ملاقات کی، اور اُن کی ہدایت پر، چوہدری رحمت علی کی قیادت میں 1933ء میں پاکستان نیشنل موومنٹ شروع کی'' (صفحہ 105)۔

اس ملاقات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔ رحمت علی نے اپنی تحریک علامہ اقبال کے مشورے سے شروع نہیں کی تھی؛ اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اُن کا ''پاکستان منصوبہ'' اقبال کے انڈیا کے وفاق کے اندر ایک مسلم صوبے کی تجویز سے قطعی مختلف تھا۔

''1937ء کے انتخابات کے بعد مسلم اکثریتی علاقوں میں مقامی مسلمان رہنما اپنے مفادات کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ مل گئے، اور صوبائی پارٹیاں تشکیل دیں'' (صفحہ 109)۔

ایسا کہاں کیا گیا تھا؟ اُنھوں نے اس طریقے سے کون سی پارٹیاں بنائی تھیں؟ چونکہ اس ضمن میں کتاب نے کوئی معلومات فراہم نہیں کیں، اس لیے اس پر تبصرہ کرنا بھی ممکن نہیں۔

تیئس مارچ 1940ء کو قرار دادِ پاکستان ''جوشیلے نعروں اور داد و تحسین کی صداؤں'' کے درمیان منظور کی گئی (صفحہ 117)۔ تیئس نہیں، چوبیس مارچ۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

''یونینسٹ پارٹی 1924ء میں قائم کی گئی۔ یہ بڑے بڑے جاگیرداروں کی پارٹی تھی.... اس نے صوبوں کے درمیان نفرت پیدا کر دی، جو قیامِ پاکستان تک موجود رہی'' (صفحہ 119)۔

یہ وسیع و عریض جاگیریں رکھنے والوں کی پارٹی نہیں تھی۔ اس کے اہم ترین بانیوں میں علامہ اقبال، شیخ عبدالقادر، محمد ظفر اللہ خان، میاں فضل حسین اور میاں عبدالحیٔ شامل تھے۔ ان میں سے کوئی بھی چھوٹا یا بڑا جاگیردار نہیں تھا۔ اس پارٹی نے کس کے خلاف، کس کے دل میں نفرت پیدا کی تھی؟ اس نے نہ تو انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کی، جس کے یہ مقاصد بجا لاتی تھی؛ نہ ہی ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف، جو اس کی صفوں میں شامل تھے؛ نہ ہی مسلم لیگ کے خلاف؛ جس نے اسے راضی کرنے اور اس کے ساتھ معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ تو کیا اس نے عوام، جو اسے ووٹ دیتے تھے، کے دل میں نفرت پیدا کی؟ اس سے زیادہ نامعقول بات نہیں ہو سکتی۔

''اپریل 1941ء میں مدراس میں ہونے والے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے اپنے اغراض و مقاصد میں ترمیم کی، اور پوری توجہ مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام پر مرکوز کردی'' (صفحہ 141)۔

اگر مسلم لیگ نے قرارداد لاہور کو مدراس کے اجلاس میں اپنے دستور میں شامل کیا تھا، اور درحقیقت ایسا ہی ہوا تھا، تو بھی منزل ''ایک الگ مملکت کا قیام'' نہیں ہو سکتی کیونکہ قراردادِ لاہور میں ایسے کسی عزم کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔

این ڈبلیو ایف پی کی تاریخ میں خدائی خدمتگار تحریک کا کوئی ذکر نہیں ہے (صفحات 145-146)۔

سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کا اجلاس اکتوبر 1936ء کو کراچی میں مسٹر جناح کی قیادت میں ہوا'' (صفحہ 156)۔

درست سال 1936ء نہیں، 1938ء ہے۔

اس صدی کے آغاز میں عظیم فلاسفر، علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کو آزادی اور اسلامی شناخت کا سبق دیا، اور پھر برِصغیر کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام کی تجویز پیش کی'' (صفحہ 160)۔

ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ علامہ اقبال نے اُسی صدی کے آغاز میں کسی ''الگ مملکت کے قیام'' کی تجویز پیش کی ہو۔

''تئیس مارچ 1940ء کو پاکستان کو مسلمانوں کی منزل قرار دیا گیا'' (صفحہ 161)۔

تئیس نہیں، چوبیس مارچ۔ لفظ ''پاکستان'' قراردادِ لاہور میں موجود نہیں۔

''چوہدری رحمت علی بنیادی طور پر ایک صحافی اور ادیب تھے'' (صفحہ 184)۔

اس میں سچ کا ہلکا سا عنصر بھی موجود نہیں۔ رحمت علی نے کوئی ادب تخلیق نہیں کیا تھا، اور نہ ہی وہ کسی اخبار یا رسالے کے لیے کام کرتے تھے۔ اُنہیں زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی مفکر، یا پمفلٹ نویس کہا جا سکتا ہے۔

میاں کفایت علی کی کتاب ''Confederacy of India'' کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا

''وفاق ہند'' کے نام سے ترجمہ کیا گیا ہے (صفحہ 184)۔

فضل کریم خان درّانی کو 'فرزند خان' لکھا گیا ہے (صفحہ 185)۔

لاہور سے جاری ہونے والے مسلم اخبار ''دی ایسٹرن ٹائمز'' کو ''ویسٹرن ٹائمز'' لکھا گیا ہے (صفحہ 185)۔

1947ء میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات اور قتل و غارت کا بیان قطعی طور پر یک طرفہ ہے۔ ان واقعات کا تمام تر الزام غیر مسلموں پر عائد کیا گیا ہے (صفحات 234-233)۔

''پاکستان کی تاریخ کا ایک پہلو قابل رشک نہیں: ملک پارلیمانی اور صدارتی نظام اور فوجی حکمرانی کے تجربات کے باوجود ابھی تک سیاسی استحکام نہیں حاصل کر سکا۔ دراصل ہم پاکستان جیسی نظریاتی ریاست کے لیے کسی موزوں نظام پر اتفاق نہیں کر سکے۔ ہم ابھی تک ایسے سیاسی نظام کا بھی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں جس کے ذریعے اسلامی شریعت اور اسلامی طرزِ زندگی عملی طور پر نافذ کی جا سکے۔ لیکن یہ بات طمانیت بخش ہے کہ ملک کے تمام دھڑے اپنے اختلافات کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس لیے یہ اسلامی نظام کے قلعے کے طور پر ہی موجود رہنا چاہیے'' (صفحات 248-247)۔

پیراگراف کی پہلی سات لائنوں اور باقی چار لائنوں کے مواد میں انتہائی تضاد پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کے ذہین طلبہ کو بھی چکما دینے کی زبردست کوشش کی گئی ہے۔

''1956ء کا دستور ابھی نافذ ہوا ہی تھا کہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلافات ابھر کر سامنے آگئے۔ اس مرحلے پر، اکتوبر 1958ء میں جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لا لگا کر انتظامیہ کا شیرازہ بکھرنے سے بچا لیا'' (صفحہ 259)۔

''ابھی''، نہیں ڈھائی سال تک آئین نافذ رہا تھا۔ ایوب خان نے ملک کو بدنظمی سے نہیں جمہوریت سے بچایا تھا۔

''1969ء میں، ملک میں انتشار اور سیاسی افراتفری کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھام لی'' (صفحہ 260)۔

یحییٰ خان نے صدر کے اختیارات پر ڈاکہ ڈالا تھا، اگرچہ اس میں ایوب خان کی مرضی شامل

تھی (دھمکی اور طاقت کے استعمال سے ایوب کی مرضی حاصل کی گئی تھی)۔

''دسمبر 1970ء کے انتخابات میں مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے اپنے چار نکاتی پروگرام کی بنیاد پر مشرقی پاکستان میں کامیابی حاصل کرلی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے 87 نشستیں حاصل کیں، جبکہ عوامی لیگ کی حاصل کردہ نشستوں کی تعداد 167 تھی۔ مشرقی پاکستان کی پاکستان سے علیحدگی کی تحریک کو اُس وقت زبردست تقویت ملی جب بھارتی فوج نے مکتی باہنی کی مدد کے بہانے مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا، اور پاک فوج کو ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا'' (صفحہ 261)۔

انتخابی نتائج مبہم انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا جملہ مشرقی پاکستان کا حوالہ دیتا ہے، دوسرا جملہ مرکز کی بات کرتا ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق واضح نہیں کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے باب نمبر دو پڑھیں۔

''پی پی پی حکومت ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے میں ناکام ہوگئی؛ اس نے صوبوں کے ساتھ منصفانہ سلوک نہ کیا؛ اس سے این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ ان وجوہات کی بنا پر 1977ء میں ایک تحریک برپا ہوئی جس نے حکومت تبدیل کردی'' (صفحہ 262)۔

پوری کتاب میں بھٹو کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

1977ء کی حکومت مخالف تحریک ان وجوہات کی بنا پر شروع نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کی وجہ انتخابی دھاندلی تھی۔

''مارچ 1977ء میں اپوزیشن کی تمام جماعتوں نے اکٹھے ہوکر نظام مصطفیٰ کو اپنا انتخابی منشور بنالیا۔ انتخابی مہم کے دوران قوم کا جذبۂ ایمانی جاگ اٹھا، اور یوں اپوزیشن کا شروع کردہ احتجاج بعد میں ایک انقلابی تحریک کی شکل اختیار کرگیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کے خلاف ہونے والا احتجاج محض ایک سادہ سیاسی عمل نہیں تھا، بلکہ اس کے ذریعے پاکستان کے عوام نے ثابت کردیا کہ انھوں نے اپوزیشن کے الیکشن پروگرام کو کسی اور وجہ سے نہیں، صرف نظام مصطفیٰ کے نام پر قبول کیا تھا، اور یہ تحریک کسی صورت اسے نظرانداز نہیں کرسکتی'' (صفحات 265-264)۔

تحریک نظام مصطفیٰ کے لیے باب دوم میں دیکھیے۔

''پانچ جولائی 1977ء کو مارشل کے نفاذ کی صورت آنے والی تبدیلی بظاہر ایک سیاسی

واقعہ تھا، لیکن درحقیقت یہ اسلامی انقلاب کا نقطہ آغاز تھا'' (صفحہ 265)۔

غداری کے ارتکاب (جیسا کہ ملک کے آئین میں درج ہے) اور غاصبانہ قبضے کو ''اسلامی انقلاب کا نقطہ آغاز'' قرار دینا سیاسی اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ کے سوا کچھ نہیں۔

اسی نصاب کے مطابق نجی شعبے میں تیار کردہ کئی ایک درسی کتب دستیاب ہیں۔ ان میں سے سات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مطالعہ پاکستان (لازمی)، مصنف پروفیسر عبدالقیوم ناطق، فاضل درس نظامی (ناصریہ)۔ فارسی آنرز، پنجاب، اردو ایڈوانس، الہ آباد، سابق اعزازی پروفیسر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج فاروومین کے شعبہ اسلامی علوم کے پروفیسر، وغیرہ۔ طاہر سنز، کراچی۔ پہلی اشاعت، مارچ 1982ء۔ زیر نظر ایڈیشن، اکتوبر 1989ء۔

''یہ نہ صرف دھوکہ دہی بلکہ فریب اور دغا بازی کے زمرے میں آتا ہے کہ پاکستان کے مطالبے کے وقت رہنماؤں کے ذہن میں انڈیا کی تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل اور ملک کے مستقبل کے دستور کا نقشہ موجود نہیں تھا'' (صفحہ 16)۔ 1910ء میں محمد علی جناح کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگرس نے اپنے اجلاس بیک وقت لکھنو میں رکھے، اور ایک معاہدے پر دستخط کیے'' (صفحہ 170)۔ ''جیسے ہی انڈیا کی تقسیم کا اعلان ہوا، ہندوؤں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس قتل عام کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی'' (صفحات 132-131)۔ یہ ملک کی بدقسمتی تھی کہ چوہدری محمد علی ملک کی وزارت اعظمیٰ پر نہ رہ سکے، اور استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گئے۔ اس کی وجہ سے 1956ء کا آئین نافذ نہ رہ سکا'' (صفحہ 142)۔ ''1962ء کے آئین کی کئی دفعات مقدس شریعت کے خلاف تھیں، مثال کے طور پر زیادہ شادیاں، طلاق، خلع اور پوتے کی وراثت کے مسائل'' (صفحہ 143)۔ ''جو بھی اقتدار میں آیا، ملک میں اسلام نافذ کرنے میں ناکام رہا، کیونکہ اُس کا اپنا ذہن خدا کے قانون کی فہم نہیں رکھتا تھا۔ وہ مہربان گھڑی، جب ملک میں خدا کا قانون نافذ ہوا، دس فروری 1979ء کو آئی، اور

قسمت نے جنرل ضیا الحق کو اُس شخص کے طور پر چن لیا جسے اسلامی قانون کے نفاذ کا اعزاز ملنا تھا'' (صفحہ 146)۔ ''مختصر یہ کہ پاکستان کی تخلیق کا حقیقی مقصد اور عوام کا مطالبہ اُس وقت پورا ہوا جب جنرل ضیا کی مارشل لا حکومت نے اسلامی آرڈیننس جاری کیا'' (صفحہ 158)۔ ''ہمارے ملک کا کافی دیر تک حصہ رہنے کے بعد مشرقی پاکستان دسمبر 1971ء کو ہم سے الگ ہو گیا۔ یہ پاکستان کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ درحقیقت یہ ایک عالمی سازش تھی، جس میں سوویت یونین نے براہِ راست، اور امریکہ نے بلواسطہ کردار ادا کر کے ثابت کیا کہ وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔ انڈیا نے اس مقصد کے لیے اپنی مسلح اور سیاسی قوت استعمال کی۔ کچھ پاکستانی رہنماؤں نے بھی سنگین غلطیاں کیں۔ بڑی طاقتوں نے ان کا بھرپور فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہو گئی اور بنگلہ دیش وجود میں آ گیا'' (صفحہ 179)۔

اگر رہنماؤں کے ذہن میں ملک کے آئین کا واضح نقشہ موجود تھا تو پھر پاکستان کو اپنا پہلا آئین بنانے میں نو سال کیوں لگ گئے؟ لکھنو پیکٹ پر 1910ء میں نہیں 1916ء میں دستخط ہوئے تھے۔ فسادات تقسیم کے اعلان سے کئی ماہ پہلے شروع ہو گئے تھے، اور یہ اعلان تین جون کو کیا گیا تھا۔ فسادات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ قاتل صرف ہندو نہیں تھے۔ 1956ء کا آئین عملی طور پر نافذ تھا، نیز چوہدری محمد علی کے مستعفی ہونے کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ آئین کو اسکندر مرزا نے ساقط کیا تھا۔ ضیا کے اسلامی نظام، اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے باب نمبر دوم دیکھیں۔

کتاب میں علی گڑھ (صفحات 59-47)، دیوبند (صفحات 71-60)، ندوہ (صفحات 78-72)، انجمن حمایتِ اسلام (صفحات 88-79)، سندھ مدرسہ (صفحات 91-89)، اسلامیہ کالج پشاور (صفحات 95-94) اور سید احمد خان (صفحات 104-97) کے طویل حوالہ جات موجود ہیں۔ لیکن عملی طور پر بنگال یا وہاں کے مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

مطالعہ پاکستان، مصنف پروفیسر محمد بشیر احمد، ایم اے تاریخ (یونیورسٹی گولڈ میڈلسٹ، آرنلڈ گولڈ میڈلسٹ)، ایم اے پولیٹیکل سائنس، ڈپلومہ انٹرنیشنل افیئرز، ڈپلومہ صحافت، ڈپلومہ

لائبریری سائنس، شعبہ تاریخ، گورنمنٹ کالج، باغبانپورہ، لاہور۔ شائع کردہ: علمی کتب خانہ، لاہور۔ 1989 ایڈیشن۔

پیش لفظ میں چودہ اگست 1988ء کی تاریخ درج ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ فاضل مصنف کا جھکاؤ جنرل ضیاالحق کی مارشل حکومت کی طرف ہوگا۔

''مسلمان جانتے تھے کہ اگر وہ برِصغیر میں آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اُن کی نئی مملکت پوری دنیا کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز، اور اسلام کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ ثابت ہوگی۔ یہ ملک مشرق اور مغرب کے مسلموں کو متحد کرے گا، اور یوں مسلمان اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ وہ اُن مسلمانوں کو بھی آزاد کرا سکیں گے جو ابھی تک غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں'' (صفحہ 12)۔ 'دسمبر 1930ء میں اقبال نے مسلمانانِ برِصغیر کے لیے ایک الگ اور آزاد وطن کا تصور پیش کیا تھا (یہاں مصنف اقبال کے خطبہ الہ آباد سے ایک غلط حوالہ نقل کرتے ہیں)'' (صفحہ 18)۔ ''لکھنو پیکٹ نے مسلم لیگ کے سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ کر دیا، کیونکہ کانگرس نے اسے واضح طور پر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ اس سے ہندوؤں کو مسلمانوں کی قوت اور یک جہتی کا بھی اندازہ ہوگیا.... (تاہم مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ اس معاہدے کی وجہ سے پنجاب اور بنگال میں مسلمان متاثر ہوئے'' (صفحات 89-88)۔ ''قراردادِ لاہور تئیس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی، اور اس نے ایک الگ سرزمین کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 122)۔ ''جمال الدین افغانی نے برِصغیر کے شمالی حصوں میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔ وہ موجودہ افغانستان، پاکستان اور وسطی ایشیا کے مسلم اکثریتی علاقوں کو ملا کر ایک ریاست، 'جمہوریہ' قائم کرنا چاہتے تھے'' (صفحہ 155)۔ ''اپنے پمفلٹ، 'اب، یا کبھی نہیں' میں رحمت علی نے برِصغیر میں مسلم اکثریتی علاقوں کی فوری علیحدگی کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 159)۔ ''اس سکیم کو گول میز کانفرنس کے وفد نے مسترد کر دیا'' (صفحہ 160)۔ ''1930ء میں اقبال نے پہلی مرتبہ کسی سیاسی پلیٹ فورم سے مسلمانوں کے لیے ایک الگ اور آزاد وطن کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 161)۔ ''1938ء میں کراچی مسلم کانفرنس کی نامزد کردہ ایک کمیٹی کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کے لیے ایک الگ مسلم ریاست کا قیام ضروری ہے'' (صفحہ 161)۔ ''نو اپریل 1946ء کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے پانچ سو مسلمان نمائندوں نے قراردادِ لاہور پر نظر

ہونی کی'' (صفحہ 170)۔ 1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی تمام تر ذمہ داری غیر مسلموں پر ڈالی گئی ہے (صفحہ 202)۔ ''1956ء کا آئین صرف دو سال تک نافذ رہا۔ اس وقت ملک سنگین سیاسی بحران کا شکار تھا؛ زندگی کے ہر شعبے میں افراتفری چھائی ہوئی تھی؛ معاشی گراوٹ اور مہنگائی اور غربت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ حالات پیدا کرنے میں اسکندر مرزا کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ اپنی صدارت بچانے کے لیے، اُنھوں نے سات اکتوبر 1958ء کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے ملک میں مارشل لا لگا دیا اور آئین کو ساقط کر دیا... ستائیس اکتوبر کو اسکندر مرزا کا استعفیٰ منظور کرتے ہوئے اُنہیں انگلینڈ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، جنرل محمد ایوب خان نے ریاست کے سربراہ کا عہدہ سنبھال لیا'' (صفحہ 221)۔ ''سات اکتوبر 1970ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں ملک میں بے چینی پھیل گئی، اور شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں بنگلہ دیش کے نام سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک شروع ہوگئی۔ دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوگیا'' (صفحہ 223)۔ ''بھٹو حکومت کے خلاف احتجاج اس نہج تک پہنچ گیا کہ قومی سطح پر فسادات پھیل جانے کا خطرہ دکھائی دے رہا تھا۔ محبِ وطن پاکستانی ملک کے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھے۔ یہ وہ حالات تھے جب جنرل ضیاالحق نے ملک کا کنٹرول سنبھالا۔ انیس اکتوبر 1984ء کو صدر ضیا نے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے وعدے کے مطابق ملک میں ریفرنڈم کرایا'' (صفحہ 227)۔ ''بدقسمتی سے ماضی میں اسلام کے نفاذ کے محض زبانی وعدے کیے جاتے رہے، لیکن خودغرضی اور سیاسی افراتفری کی وجہ سے کوئی عملی اقدامات نہ اٹھائے گئے.... اب ہمیں اس ضمن میں اٹھائے جانے والے عملی اقدامات پر مشکور ہونا چاہیے'' (صفحہ 232)۔ ''1971ء میں اندرونی اور بیرونی سازشوں، اور بھارت کی ننگی جارحیت کی وجہ سے مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوگیا'' (صفحہ 238)۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں تھا کہ پاکستان کی تخلیق اسلامی دنیا کے اتحاد کا باعث بنے گی، اور نوآبادیاتی نظام سے تمام مسلم علاقوں کو آزادی مل جائے گی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران کی جانے والی تقریروں، اور اس دور کی تحریروں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جمال الدین افغانی سے منسوب بیان کا تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں۔ ''اب، یا کبھی نہیں'' پمفلٹ میں رحمت علی نے پنجاب، سندھ، این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان (مع جموں اور کشمیر) کی علیحدگی کا

مطالبہ کیا تھا، نہ کہ انڈیا کے تمام مسلم اکثریتی علاقوں کا۔ اُن کی سکیم کو آئینی اصلاحات کے لیے قائم جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے مسلمان گواہوں نے مسترد کیا تھا، نہ کہ گول میز کانفرنس کے وفد نے۔ 1946ء کی دہلی میٹنگ میں مسلم لیگ، نہ کہ مسلمانوں، سے تعلق رکھنے والے اراکین اسمبلی نے شرکت کی تھی۔ مسلمان اراکین اسمبلی اور مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی ہم معانی نہیں۔ مزید وضاحت باب دوم میں۔

دیگر تمام درسی کتب کی طرح یہ بھی قومی تحریک میں بنگال کے کردار سے اغماض برتتی ہے۔ فرائضی تحریک پر صرف ایک صفحہ ہے (56 - 55)، جبکہ علی گڑھ تحریک پر گیارہ صفحات ہیں (68-57)۔ سرسید احمد خان اور اُن کے ساتھیوں کے دیگر کئی مقامات پر بھی حوالہ جات ہیں۔

مطالعہ پاکستان (لازمی) برائے ڈگری کلاسز۔ مصنف: ڈاکٹر محمد دین، شعبہ اسلامیات، جامعہ پشاور۔ زیر نگرانی، ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن الازہری، ڈین شعبہ اسلامیات اور عربی، جامعہ پشاور۔ شائع شدہ، تاج کتب خانہ، پشاور۔ دسمبر 1984ء

''1930ء میں علامہ اقبال نے انڈیا میں، یا اس سے باہر ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا'' (صفحہ 19)۔ اقبال کے الہ آباد کے خطبے کے لیے باب دوم دیکھیں۔

مصنف اپنی بے پناہ تعلیم کے باوجود یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں ہیں کہ علی گڑھ کو کالج کہیں یا ادارہ یا تحریک، لیکن اُنہیں یہ یقین ہے کہ اس کے تعلیم یافتہ افراد نے نہ صرف قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بلکہ 1947ء کے بعد بھی پاکستان کے لیے عظیم خدمات سرانجام دیں (صفحہ 47)۔

''تحریکِ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات ناقابل فراموش ہیں'' (صفحہ 51)۔

اسلام کے دقیانوسی تصور کی تبلیغ اور قیام پاکستان کی مخالفت میں دارالعلوم دیوبند کے کردار پر باب نمبر دو میں تفصیل سے بات کی گی ہے۔

''ہندوستان پر حکومت کرنے والے مسلمان حکمرانوں نے اسے انگریزوں کی طرح ایک کالونی نہیں بنایا تھا'' (صفحہ 70)۔ لسانی نزاکتیں ایک طرف (طلبہ اور درسی کتب لکھنے والے مصنفین ان سے نابلد ہیں) عام فہم زبان میں نوآبادیاتی نظام اور استعماریت مترادف اصلاحات ہیں، گرچہ یہ

مترادف نہیں ہونی چاہییں۔ مسلمان حکمران غیر ملکی تھے؛ اُنھوں نے زورِ بازو سے ہندوستان کو فتح کیا، اور مقامی آبادی پر حکومت کی۔ مقامی افراد نے کہیں کہیں غیر ملکی آقاؤں کے خلاف جنگ کی، لیکن زیادہ تر نے اپنے بہترین مفاد میں تعاون کی راہ اپنائی۔ اُنھوں نے حکمرانوں کی زبان (فارسی) سیکھی، اور اُن کی انتظامیہ میں خدمات سرانجام دیں۔ اب آپ مسلمانوں کی جگہ انگریزوں، اور فارسی کی جگہ انگریزی کو رکھ کر لیں۔ عوام وہی رہیں گے۔ یہ مثال برطانوی سرکار اور مسلمانوں حکمرانوں کے درمیان مماثلت واضح کر دے گی۔ اس میں ایک بات کا اضافہ کریں کہ دونوں کیسز میں بیرونی دنیا سے آنے والے حکمرانوں کا مذہب مقامی مفتوح افراد سے مختلف تھا۔ مزید یہ کہ دونوں نے مقامی آبادی کا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں نے صوفیوں کے ذریعے، دنیاوی ترقی کی ترغیب دیتے ہوئے، مساوی حقوق کا احساس (تھیوری کی حد تک)، حکمران اور عوام کی یکساں حیثیت کی تبلیغ، غیر ملکی حملہ آوروں کا نفسیاتی خوف، اور گاہے جبر اور سختی سے، جبکہ انگریزوں نے پادریوں کے ذریعے مندرجہ بالا ترغیبات دیتے ہوئے یہ مقصد حاصل کیا۔ مسلمان حکمران زیادہ مقامی افراد کو اپنا ہم مذہب بنانے میں کامیاب رہے کیونکہ اُن کے اقتدار کا دورانیہ انگریزوں سے کہیں زیادہ تھا۔ دونوں کیسز میں یہ ہندو معاشرے کا نچلا طبقہ تھا جس نے ریاست کا مذہب قبول کیا۔ عام ہندو اسے اپنے اوپر حملہ قرار دیتے ہیں۔ افغان اور مغل دور میں ہندو مسلم جنگیں ہوتی رہتیں تھی۔ ہندو بدیسی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں جنوبی اور مغربی انڈیا میں ہندوؤں اور مسیحیوں کے درمیان بھی فسادات دیکھنے میں آئے، لیکن مسیحیوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے اُن کا پھیلاؤ زیادہ نہ تھا۔ اُن کی معاشرے میں کم تعداد ہندوؤں کے اشتعال کا موجب نہیں بنتی تھی۔ مزید یہ کہ انگریز حکمرانوں نے مذہبی غیر جانبداری کو شعار بنایا تھا۔ لیکن ہندو مسلم فسادات جاری رہے، اور ان کا پھیلاؤ بڑھتا گیا۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی زیادہ تعداد تھی۔ ریاست کی پشت پناہی کے بغیر وہ ہندوؤں کا آسان ہدف ثابت ہو رہے تھے۔

ہندو دونوں استعماری طاقتوں سے ایک جیسی نفرت کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کو ملیچھ، ظالم، بے رحم اور اپنی سرزمین پر زبردستی قبضہ کرنے والے غاصب قرار دیتے۔ وہ اُن دونوں سے اپنی سرزمین کو پاک کرنا چاہتے تھے، اور یہ ایک فطری جذبہ تھا۔

ان تمام معروضات میں مسلمان اور انگریز حکمران ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ لیکن ایک واضح فرق موجود تھا۔ مسلمانوں نے انڈیا کو اپنا گھر بنالیا جبکہ انگریزوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے پیچھے پانچ عوامل کارفرما تھے: آب و ہوا، جغرافیہ، تاریخ، رقبہ اور تعداد۔ انگریزوں کے لیے ہندوستان بہت گرم تھا۔ اُن کا یہاں مستقل رہنا بہت مشکل تھا۔ اگر ہندوستان کی آب و ہوا اُن کے موافق ہوتی تو وہ اسے دوسرا کینیڈا بنا لیتے۔ دوسری طرف یہاں کے جغرافیائی حالات مسلمانوں کے موافق تھے۔ وہ قریبی سرزمینوں سے آئے تھے جہاں کی آب و ہوا ہندوستان کے زیادہ تر حصوں سے مجموعی طور پر مختلف نہیں تھی۔ اُن کے لیے یہاں رہنا آسان تھا۔ تاریخ بھی اُن کا ساتھ دے رہی تھی۔ کئی صدیوں سے غیر ملکی حملہ آور انڈیا کی سرزمین پر آتے رہے تھے۔ وہ اپنی آمد کے کچھ نہ کچھ اثرات یہاں چھوڑ کر رخصت ہوتے رہے، جیسا کہ ہنز اور یونانی۔ تاہم کچھ نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، جیسا کہ آریا۔ چنانچہ اگر وسطی ایشیا کے لوگ یہاں قیام کا فیصلہ کرتے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ ہندوستان کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ انگریز اسے اپنی کالونی نہیں بنا سکتے تھے، چاہے انگلینڈ، سکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ سے کتنے ہی افراد ہجرت کر کے ہندوستان کیوں نہ آ جاتے۔ اُن کی تعداد پھر بھی مقامی آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہوتی۔ انگریز یہاں بہت کم تعداد میں آئے تھے۔ چند ہزار انگریزوں کا ہندوستان کی کروڑوں کی آبادی میں کوئی تناسب نہیں تھا۔ دوسری طرف مسلمان ایک معقول اقلیت تھے۔ اگر چہ وہ ملک پر حکومت نہیں کر سکتے تھے، لیکن فیصلہ سازی میں اُن کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مسلمان حکمرانوں نے انڈیا کو اپنی کالونی نہیں بنایا تھا۔ وہ بہر حال ایک نئے ملک میں آباد کار تھے، اور اُنھوں نے مقامی سماج میں گھل مل کر رہنے کی بجائے اپنے لیے ایک الگ کمیونٹی تشکیل دی تھی۔ وہ یہاں دل لگانے کی بجائے اپنی آبائی سرزمینوں کو یاد کرتے رہتے (تزک بابری، ہمایوں کی یادداشت، گلبدن بیگم کی یادیں، تزک جہانگیری)۔ اسی کو کالونی کہتے ہیں۔ مزید یہ کہ حکمران طبقہ مقامی مذہب قبول کرنے والوں کو بھی اپنے قریب نہیں لایا تھا۔ وہ اُنہیں بمشکل ہی اعلیٰ ملازمتیں دیتے، یا اُن کے ساتھ شادیاں کرتے۔ وہ عام طور پر مقامی لوگوں، خاص طور پر جنہوں نے اُن کا مذہب قبول کیا تھا، کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اورنگ زیب حکومت کے زیادہ تر منصب دار غیر ملکی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکمران پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ ہندوستان پر حکومت

کرتے رہے، لیکن بہت کم مقامی مسلمانوں کی زندگیوں میں بہتری آسکی۔ انہیں کبھی ترجیح نہیں دی گئی۔

یہاں میں جدید مسلم انڈیا اور پاکستان کی سماجی تاریخ سے ایک دلچسپ حوالہ دینا چاہوں گا۔ یہاں رہنے والا تقریباً ہر اہم مسلمان اپنی سوانح عمری، یادداشت، خاندانی پس منظر اور شجرہ نسب میں دعویٰ کرتا تھا (اور ابھی بھی یہی دعویٰ ہے) کہ اُس کے آباؤ اجداد یمن، حجاز، وسطی ایشیا، ایران، غزنی یا کسی اور غیر ملکی سرزمین سے ہندوستان آئے تھے۔ زیادہ تر کیسز میں یہ دعویٰ غلط ہوتا ہے۔ اگر ان کی بات مان لی جائے تو اسلام قبول کرنے والے مقامی باشندوں کی تعداد خوفناک حد تک کم ہو جائے گی۔ دراصل افغانوں اور مغلوں کی خصوصی حیثیت کی وجہ سے خود کو دیارِ غیر سے وابستہ کرنے کی سوچ بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اس سرزمین، جہاں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے، سے کتنے لاتعلق رہے، حالانکہ اُن کا تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ اگر تمام قریشی، واسطی، صدیقی، ہاشمی، خان، سید، بخاری، غزنوی، فاطمی، زیدی، مشہدی، فاروقی وغیرہ کے آباؤ اجداد حملہ آور افواج کے ہمراہ بیرونی ممالک سے ہی آئے تھے تو پھر برِصغیر میں اسلام کی فقید المثال اشاعت کا مقدس دعویٰ کہاں گیا؟ کیا ہم یہ مان لیں کہ مقامی اسلام قبول کرنے والے، جن کی تعداد دعوے کے مطابق بہت زیادہ ہونی چاہیے، انتہائی غبی، کند ذہن اور جاہل تھے... اور اُن میں کوئی عالم، مفکر اور دانشور پیدا ہو ہی نہیں سکتے تھے؟

''انگریزوں نے انڈیا میں تجارت کے بہانے، دھوکہ دہی سے اقتدار پر قبضہ کیا''۔ اس پیراگراف کی سرخی اس طرح ہے: ''انگریزوں کا برِصغیر پر قبضہ''۔ گویا مسلمان حملہ آور قابض نہیں تھے (صفحہ 72)۔

''مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے دہلی میں چار فروری 1940ء کو فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو ایک الگ مملکت کے قیام کا واضح مطالبہ کرنا چاہیے'' (صفحہ 90)۔ ''1947ء میں ہندوؤں نے ملک کی تقسیم کا انتقام لینے، اور مسلمانوں کو پاکستان کے مطالبے کی سزا دینے کے لیے وسیع پیمانے پر لوٹ مار، قتل و غارت اور تباہی اور بربادی پھیلانا شروع کر دی'' (صفحہ 105)۔

اگر مذکورہ تاریخ کو دہلی میں کوئی فیصلہ کیا گیا تھا، تو بھی مسلم لیگ کے دفتر کی طرف سے سرکاری طور پر شائع ہونے والی قراردادوں میں اس کا ریکارڈ نہیں ملتا۔ گروہی فسادات پر پہلے بات

ہو چکی ہے۔

''پاکستان کے قیام کے فوراً بعد اقتدار اُن افراد کے ہاتھوں میں چلا گیا جو اسلام کے نفاذ کے ساتھ مخلص نہیں تھے، اور اُنھوں نے ملک کے نظریاتی پہلو کو لادینیت (سیکولرازم) کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ اس مذموم کوشش کے پیچھے غیر ملکی طاقتیں کارفرما تھیں'' (صفحہ 136)۔

اس احمقانہ الزام کی وضاحت باب دوم میں۔

''تاریخ نظام مصطفیٰ تحریک کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سابق حکومت کے خلاف مارچ 1977ء کو شروع ہونے والی یہ تحریک عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی کرتی تھی کہ اب وہ اسلامی طرز زندگی اپنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ موجودہ حکومت عوام کے ان جذبات سے بخوبی آگاہ ہے... آج اسلامی نظام کے نفاذ میں خاطر خواہ پیش رفت ہو چکی ہے'' (صفحہ 137)۔

اسلامی نظام کی نوعیت اور جہت پر باب نمبر دو میں بحث کی گئی ہے۔

''1970 کے انتخابات کے بعد جب پاکستان میں انتقال اقتدار کا بحران سنگین ہو گیا تو انڈیا نے نہ صرف مشرقی پاکستان کے رہنماؤں کو بغاوت پر اکسایا، بلکہ جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی فوج بھی مشرقی پاکستان میں داخل کر دی۔ بیرونی طاقتوں کی دشمنی اور ہمارے لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ سے پاکستان دولخت ہو گیا'' (صفحہ 204)۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر باب دوم میں کی گئی وضاحت دیکھیے۔

تعمیر مطالعہ پاکستان (لازمی)، بی اے، بی ایس سی، میڈیکل، انجینئرنگ، کامرس اور مقابلہ کے تمام امتحانوں کے لیے مستند کتاب۔ مصنف: پروفیسر سعید عثمان ملک، صدر شعبہ پولیٹکل سائنس، گورنمنٹ کالج، لاہور، اور محمد اکرم ربانی، شعبہ پولیٹکل سائنس، گورنمنٹ کالج، لاہور۔ شائع کردہ، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور۔ 1987 (پیش لفظ پر تاریخ 1985 ہے)۔

اس کے مواد کی چند ایک مثالیں:

''اقبال نے قانون کی ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی'' (صفحہ 20)۔

اقبال بار ایٹ لا تھے۔ انھوں نے انگلینڈ یا کہیں اور سے قانون کی کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔

''علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو معاشی طور پر خوشحال بنادیا'' (صفحہ 44)۔

علی گڑھ تحریک نے ایم اے او کالج قائم کیا۔ اس کالج کے فارغ التحصیل افراد نے سرکاری ملازمتیں حاصل کیں، یا نجی شعبے میں بطور پروفیشنلز کام کیا۔ لیکن چند سو افراد کے لیے مواقع پیدا کرنے کا مطلب کروڑوں کی آبادی رکھنے والے کمیونٹی کی خوشحالی کیسے ہو گیا؟

''لکھنو پیکٹ کی سب سے زیادہ اہمیت یہ تھی کہ ہندوؤں نے کم از کم پہلی مرتبہ یہ تسلیم کیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔۔۔ برطانیہ کی 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی موثر پالیسی کہاں گئی؟۔۔۔اس معاہدے کی وجہ سے انڈیا میں ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا'' (صفحات 75-74)۔

لکھنو پیکٹ پر تفصیل سے باب دوم میں بحث کی گئی ہے۔

''الٰہ آباد کے خطبے میں علامہ اقبال نے ایک الگ مملکت کی تخلیق کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 106)۔

اس کی وضاحت باب نمبر دو میں۔

''چوہدری رحمت علی 1927ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے، جہاں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے، اور ڈبلن یونیورسٹی سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ 1933 رحمت علی اور ان کے تین دوستوں نے ایک مضمون ''اب، یا کبھی نہیں'' شائع کیا'' (صفحہ 107)۔

رحمت علی لاہور سے تیس یا اکتیس اکتوبر 1930ء کو گئے تھے۔ انھوں نے ڈبلن یونیورسٹی سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔ بیرسٹر کسی یونیورسٹی میں نہیں، ''Inn of Court'' میں بنتے ہیں۔ ''اب، یا کبھی نہیں'' کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہونے والا کوئی مضمون نہیں بلکہ اپنے طور پر شائع کردہ ایک پمفلٹ تھا۔

''1956ء کا آئین آٹھ اکتوبر 1958ء کو منسوخ کر کے ملک پر مارشل لا لگا دیا گیا'' (صفحہ 169)۔ مارشل لا لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

''ایوب خان کا آئین 1962ء سے لے کر پچیس مارچ 1969ء تک نافذ رہا، جبکہ جنرل

یحیٰی خان نے ملک پر ایک آئین نافذ کر دیا'' (صفحہ 170)۔

جنرل یحیٰی خان نے پچیس مارچ 1969ء کو، یا اس کے بعد کوئی نیا آئین نافذ نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے دسمبر 1971ء میں اقتدار سے رخصتی تک مارشل لا لگائے رکھا تھا۔

''1969ء سے لے کر 1971ء تک ملک پر مارشل لا لگا رہا۔ اس دوران انڈیا کے اکسانے پر مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک ابھری۔ اس کی آڑ میں انڈیا نے دسمبر 1971ء میں پاکستان پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوگیا، اور مشرقی پاکستان علیحدہ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا'' (صفحہ 170)۔

بنگلہ دیش کی تخلیق کی وضاحت باب دوم میں۔

''1977ء میں نظامِ مصطفیٰ تحریک نے بھٹو حکومت کو ہلا کر رکھ دیا، اور چھے جولائی 1977 کو جنرل محمد ضیاالحق کی قیادت میں ملک پر ایک مرتبہ پھر مارشل لا نافذ کر دیا گیا'' (صفحہ 172)۔

نظامِ مصطفیٰ تحریک پر باب دوم میں بحث کی گئی ہے۔

''یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں حضرت قائدِ اعظم اور اُن کے کچھ پرانے رفقا کے سوا کوئی بھی اسلامی نظام کا نفاذ نہیں چاہتا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں اُن افراد کی بھرمار تھی جو پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانا چاہتے تھے'' (صفحہ 173)۔

مسٹر جناح اور اُن کے رفقا کے خلاف اس تہمت پر باب نمبر دو میں بات کی گئی ہے۔

''شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری سے مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہوگئے، اور مشرقی پاکستان کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انڈیا نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارتی جارحیت کے نتیجے میں مشرقی پاکستان باقی ملک سے الگ ہوگیا'' (صفحہ 173)۔

''1977ء میں موجودہ فوجی حکومت نے جنرل محمد ضیاالحق کی قیادت میں ملک کا نظم ونسق سنبھالا۔ عام طور پر ایک فوجی حکومت کسی آئین یا قانون کی پابند نہیں ہوتی، مگر موجودہ حکومت نے 1973ء کے آئین کو برقرار رکھتے ہوئے ایک مثال قائم کی ہے، اور اس کے ملک کے لیے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ موجودہ حکومت نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بہت خلوص نیت سے عملی اقدامات اٹھائے ہیں، اور ایک عظیم انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس نے اسلامی نظام کے نفاذ کے

لیے بہت سی مارشل لا ریگولیشنز جاری کی ہیں۔ جنرل ضیاالحق کی حکومت نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے لیے موثر اقدامات جاری کیے ہیں۔ اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں'' (صفحہ 174)۔

جنرل ضیاالحق نے 1973ء کا آئین برقرار نہیں رکھا تھا بلکہ اسے ساقط کر دیا تھا، اور بعد میں اپنے تصورات اور عزائم کے مطابق تبدیل کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ضیا دور پر تبصرے کے لیے دیکھیے باب دوم۔

''بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد، آزادی کے پہلے چند سال کے اندر، ملک ایسے عناصر اور ایسی قوتوں کے نرغے میں آ گیا جو پاکستان کو ایک اسلامی معاشرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ یہ عناصر دستور ساز اسمبلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے، جہاں انھوں نے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کی پوری کوشش کی.... آج آزادی کے چھتیس سال بعد بھی ہم اپنی منزل سے بہت دور ہیں.... موجودہ فوجی حکومت 1977ء میں اقتدار میں آئی۔ ملک کے قیام کے حقیقی مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ درست سمت میں قدم اٹھا رہی ہے۔ اس نے ایک مکمل اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ ان اقدامات کو اٹھانے پر جنرل ضیاالحق کی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے۔ سابق حکومتوں کے برعکس اس نے محض اسلام کا نام استعمال نہیں کیا ہے'' (صفحات 179-180)۔ اس پر تبصرہ باب دوم میں۔

مطالعہ پاکستان (لازمی) برائے طلبہ بی اے، بی ایس سی، ایم بی بی ایس، ایگری کلچرل یونیورسٹی، اور دیگر مقابلے کے امتحانات کے لیے۔ مصنفین: زاہد حسین، ایم اے (پولیٹکل سائنس)، ایم اے (ہسٹری)، گورنمنٹ ڈگری کالج، قصور۔ نظر ثانی: پروفیسر انوار الحق قریشی، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، اور پروفیسر محمد سلیم صاحب، گورنمنٹ ڈگری کالج، منڈی بہاؤالدین۔ شائع شدہ: امین بک ڈپو، لاہور۔ نومبر 1989ء

اس میں بیان کردہ کچھ حقائق اس طرح ہیں:

''ہندو اردو زبان کو برصغیر سے ختم کرنا چاہتے تھے، لیکن اردو کے خاتمے کا مطلب تمام (مسلمان) قوم کا خاتمہ تھا، اور انڈین مسلمانوں کو بہت جلد اس کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ بنیادی مقاصد

میں سے ایک اردو کا تحفظ بھی تھا۔ اس طرح پاکستان کا قیام اُن کا مطالبہ تھا'' (صفحہ 14)۔

اس انتہائی متنازع بیان کی وضاحت باب دوم میں۔

''علامہ اقبال کے الہ آباد کے خطبے تک انڈین مسلمانوں کو یقین تھا کہ اگر کانگرس نے اُن کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرلی، اور اُن کے معاشی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے رضامند ہوگئی تو دونوں قومیں ایک متحد بھارت میں اکٹھی رہ سکتی ہیں'' (صفحہ 21)۔

انڈین مسلمان اس تصور پر کبھی بھی یقین نہیں رکھتے تھے۔ اقبال سے پہلے بھی درجنوں افراد نے تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔

''اگرچہ الہ آباد کے خطبے سے پہلے تقسیم ہند کی درجنوں سکیمیں سامنے آئیں، لیکن یہ علامہ اقبال تھے جنہوں نے ایک نئی ریاست کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 21)۔

یہ بیان اس سے پہلے والے بیان سے متصادم ہے۔

''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ الہ آباد کا خطبہ تحریکِ پاکستان کا ایک سنگِ میل تھا، کیونکہ اس سے پہلے تقسیم ہند کے تمام تصورات ذاتی نوعیت کے تھے (گویا کسی شخص نے اپنی ذاتی حیثیت میں پیش کیے تھے)، لیکن علامہ اقبال نے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے سیاسی پلیٹ فورم سے بات کرتے ہوئے نہایت مدلل انداز میں مشترکہ قومیت کے تصور کو رد کردیا، اور پھر اپنے تصور کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہندو اور مسلمان مذہب، سیاست، تہذیب اور ثقافت، الغرض ہر لحاظ سے مختلف اقوام ہیں....اور پھر اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ سندھ، این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان کو انڈیا سے الگ ایک وطن بنا دیا جائے'' (صفحہ 23)۔

الہ آباد میں علامہ اقبال نے دوقومی نظریے پر دلائل نہیں دیے تھے۔ اس کے برعکس اُنھوں نے ''تنوع کے اتحاد'' کی بات کی تھی۔ اُنھوں نے کسی علیحدہ وطن کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے بہت سے صفحات میں اس موضوع پر بات ہوچکی ہے۔ مکمل تفصیل باب دوم میں۔

''لکھنو پیکٹ بے حد تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی شرائط کے مطابق، کانگرس نے پہلی مرتبہ تسلیم کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، جو کہ مسلم لیگ کی ایک عظیم کامیابی تھی....اس معاہدے نے نہ صرف انگریزوں، بلکہ تمام دنیا پر واضح کردیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں'' (صفحہ 54)۔

مسلم لیگ کی کامیابی کی بجائے ،لکھنو پیکٹ اس کی کوتاہ بینی ،اور مستقبل میں بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کے مفادات سے لاعلمی کا ثبوت تھا (اور یہ دو صوبے برصغیر میں سب سے زیادہ مسلم اکثریت رکھتے تھے)۔اس معاہدے کی وجہ سے یہ صوبے یوپی کے رہنماؤں کے کوتاہ بینی کی بھینٹ چڑھ گئے ۔اس کی مفصل وضاحت باب دوم میں ۔

''علامہ اقبال نے 1930ء میں ایک الگ وطن کا مطالبہ پیش کیا'' (صفحہ 85)۔

اُنھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ میں نے گزشتہ صفحات میں اس نکتے کی وضاحت کی ہے ۔ باقی تفصیل باب دوم میں ۔

''چوہدری رحمت علی بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لیے انگلینڈ گئے ...اُنھوں نے اٹھارہ جنوری 1933ء کو 'اب ، یا کبھی نہیں' شائع کیا...وہ بارہ فروری 1951ء کو یورپ میں فوت ہو گئے ۔اُن کی تدفین ووکنگ میں کی گئی'' (صفحہ 87)۔

رحمت علی بار ایٹ لا تھے ،لیکن اُن کا یورپ جانے کا بنیادی مقصد کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا تھا، جو اُنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری لے کر پورا کیا۔ یہ کہنا کہ اُن کی وفات یورپ میں ہوئی، اسی طرح ہے جیسا یہ کہنا کہ جناح صاحب ایشیا میں فوت ہوئے ۔رحمت علی تین فروری ، نہ کہ بارہ فروری، کو فوت ہوئے ۔اُن کی تدفین مارکیٹ روڈ قبرستان، کیمبرج میں ہوئی، نہ کہ ووکنگ میں ۔

''قراردادِ لاہور میں لفظ 'ریاستیں' مسلم لیگ کے نو اپریل 1946ء کے اجلاس میں درست کر لیا گیا'' (صفحہ 101)

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپریل 1946ء میں دہلی میں کوئی اجلاس نہیں بلایا تھا، بلکہ اُس برس اس کا کوئی اجلاس نہیں ہوا تھا۔ مصنف مسلم اور مسلم لیگ میں فرق کرنے سے قاصر ہے کہ مذکورہ اجلاس مسٹر جناح نے مسلمان اراکین اسمبلی کا بلایا تھا، اور اس اجلاس کے پاس آل انڈیا مسلم لیگ کی منظور کردہ قراردادِ لاہور میں ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ مزید تفصیل باب دوم میں ۔

ایوب خان کا مارشل لا: ''ملک کے خودغرض رہنماؤں کی غلط پالیسیوں اور غیر ذمہ دار طرز عمل کے نتیجے میں ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا، یہاں تک کہ کسی مضبوط حکومت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی ۔ان حالات میں جنرل محمد ایوب خان مرحوم نے اکتوبر 1958ء کو مارشل لا

دکھا دیا، اور اقتدار سنبھالتے ہوئے 1956ء کا آئین ساقط کر دیا'' (صفحہ 120)۔

اس کی تصحیح باب دوم میں دیکھیے۔

''1977ء میں حکومت مخالف نظام مصطفیٰ تحریک میں عوام نے اپوزیشن کی جماعتوں کی زبردست طریقے سے حمایت کی۔ ملک کے عوام واضح طور پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے...صورت حال ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ ملک کی ایک اور اہم قوت، مسلح افواج نے ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا'' (صفحہ 125)۔

اگر عوام نے ایک زبردست طریقے سے تحریک نظام مصطفیٰ کی حمایت کی تھی تو ''دو دھڑوں'' میں بٹے والے لوگ کون تھے؟ کیا عوام اور لوگ دو الگ الگ دھڑے ہیں؟ ایسے احمقانہ بیانات پر مزید تبصرہ باب دوم میں۔

مطالعہ پاکستان (لازمی) برائے طلبہ و طالبات ڈگری کلاسز، انجینئرنگ و میڈیکل و کامرس اور زرعی یونیورسٹی۔ پاکستان کی تمام جامعات کے نصاب کے عین مطابق۔ مصنفین: پروفیسر غلام سرور چیمہ، شعبہ تاریخ، گورنمنٹ کالج لاہور، پروفیسر رفیق چوہدری، شعبہ تاریخ، گورنمنٹ کالج فیصل آباد، اور پروفیسر نصیر احمد چوہدری، شعبہ پولیٹیکل سائنس، گورنمنٹ مرے کالج، سیالکوٹ۔ شائع کردہ: قریشی برادرز، لاہور۔ 1985ء

پیش لفظ کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے: ''پاکستان سرسید احمد خان کی خواہشات کا اظہار، اقبال کے خواب کی تکمیل، قائداعظم کی قیادت کا ثمر اور لاکھوں مسلمانوں کی شہادت گاہ ہے'' (صفحہ 1)۔

سرسید احمد خان کی کوئی خواہش نہیں تھی کہ ہندوستان تقسیم ہو، اور ایک مسلم ریاست وجود میں آئے۔ ''لاکھوں مسلمان'' 1947ء میں پاکستان میں شہید نہیں ہوئے تھے، اُن کی 'شہادت گاہ' انڈیا ہے (نیز شہادت گاہ کوئی لفظ نہیں)۔

تاریخ کی دیگر مثالیں:

''درحقیقت یہ علی گڑھ تحریک تھی جس نے مسلمانان برصغیر کو ایک نئی زندگی دی...اس نے مسلمانوں کو انگریز اور ہندو کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کے قابل بنایا'' (صفحہ 81)۔

برصغیر کے تمام مسلمان رہنمائی کے لیے علی گڑھ کی طرف دیکھتے تھے۔ جب بھی کوئی مشکل پیش آئی، مسلمانوں نے قیادت کے لیے علی گڑھ کی طرف دیکھا'' (صفحہ 83)۔ ''تحریکِ پاکستان اور قومی تحریک کی قیادت کرنے والے زیادہ تر رہنماؤں کا تعلق علی گڑھ تحریک سے تھا'' (صفحہ 84)

علی گڑھ کی ایسی جذباتی تعریف اپنی جگہ پر، لیکن اس کا حقائق سے کوئی نہیں۔ علی گڑھ کی اس طرح اہمیت بیان کرنے کا مطلب انڈیا کے دیگر مسلمانوں کی خدمات کو نظرانداز کرنا ہے۔

''دیوبند کے فرزندوں نے صرف ایک نسل کو ہی مذہبی تربیت فراہم نہیں کی....'' (صفحہ 87)۔

جی ہاں، تربیت صرف ایک نسل تک ہی محدود نہیں تھی؛ بدقسمتی سے تین نسلیں فیضیاب ہوئیں۔ مزید تفصیل باب دوم میں۔

جامعہ ملیہ کے لیے مختص ڈھائی صفحات اس کی کانگرس کی پالیسیوں کی حمایت پر خاموش ہیں (صفحات 106-104)۔

''مولانا محمد علی نے اکسفورڈ سے انگریزی ادب کی ڈگری حاصل کی'' (صفحہ 106)۔

مولانا نے ''جدید تاریخ'' میں ڈگری حاصل کی تھی، نہ کہ انگریزی ادب میں۔

انڈین نیشنل کانگرس کو آل انڈیا نیشنل کانگرس لکھا گیا ہے (صفحہ 109)۔

''لکھنو پیکٹ کے تحت آل انڈیا نیشنل کانگرس نے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم تسلیم کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نے آئین اور جمہوری طور پر مسلمانوں کو باقاعدہ ایک الگ قوم مان لیا...انگریز حکومت کی تقسیم کرو، اور حکومت کرو کی پالیسی کو شدید دھچکا لگا'' (صفحہ 125)۔

لکھنو پیکٹ کے متعلق یہ تمام معروضات غلط ہیں۔ تصحیح کے لیے باب دوم دیکھیے۔

''علامہ اقبال نے 1930ء میں ایک آزاد مسلم ریاست کی ضرورت کا تصور پیش کیا'' (صفحہ 157)۔

اقبال نے 1930ء میں ہندوستان کی تقسیم کا تصور پیش نہیں کیا تھا۔ وضاحت کے لیے باب دوم دیکھیں۔

1939ء کی ''ایک پنجابی کی کنفیڈریسی سکیم'' نواب سر محمد شاہنواز خان ممدوٹ کی تخلیق بتائی گئی ہے (صفحہ 174)۔

یہ سکیم شاہنواز ممدوٹ کی نہیں ، میاں کفایت علی کی تصنیف تھی ، جو 'ایک پنجابی' کے نام سے لکھتے تھے۔

''پاکستان کے مشرقی بازو کی آبادی مغربی بازو سے زیادہ تھی ۔ اس لیے بنگالیوں کے ذہن میں یہ تصور ڈالا گیا (کس نے ؟) کہ اکثریتی علاقے کی زبان کو قومی زبان کا درجہ ملنا چاہیے ۔ ۔ پاکستان کے نازک حالات کے پیش نظر ایسے مسائل منظر عام پر نہیں آنے چاہیے تھے ۔ لیکن اس نے ہندوؤں کو ایک سنہری موقعہ فراہم کر دیا۔ وہ مسائل میں گھرے ہوئے پاکستان کو ایک اور مشکل میں ڈالنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے ۔ اگر آج ہم سوچیں کہ بنگالیوں کا مطالبہ معقول تھا ، تو بھی اس کے لیے وہ وقت مناسب نہیں تھا ۔ مزید یہ کہ بعض اوقات قومی ضروریات قربانی کا تقاضا کرتی ہیں ، اور انہیں ذاتی منشا پر مقدم رکھنا چاہیے'' (صفحہ 223)۔

1971 ء کے واقعات پر : ''شیخ مجیب الرحمان اپنی مرضی کا آئین مسلط کرنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے اسمبلی کا اجلاس بلانے پر اصرار کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو چاہتے تھے کہ کسی معاہدے پر پہنچنے کے بعد ہی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے ۔ ان حالات میں مشرقی پاکستان میں عوامی بغاوت پھوٹ پڑی ۔ غیر ملکی طاقتوں اور بھارتی مداخلت نے طاقت کا توازن مجیب الرحمٰن اور اُس کے ٹولے کے حق جھکا دیا ، اور پاک فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے ۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا'' (صفحات 234-233)۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے باب دوم دیکھیے ۔

''1977 ء میں حکومت نے پی این اے (پاکستان نیشنل الائنس) کے ساتھ مذاکرات کیے ۔ یہ اعلان کیا گیا کہ مذاکرات کے نتیجے میں کوئی معاہدہ طے پا گیا ہے ۔ آخری لمحے پر ایئر مارشل اصغر خان نے معاہدہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت مخالف تحریک میں مزید شدت آ گئی ۔ آخرکار ، چار جولائی 1977 ء کو پاکستان کی بہادر ، محبِ وطن فوج نے ملک و قوم کو بچانے کے لیے ایک مرتبہ پھر آگے قدم بڑھایا اور حکومت کا کنٹرول سنبھالتے ہوئے ملک پر مارشل لا لگا دیا۔ اسمبلی اور سینٹ تحلیل کر دیے گئے ۔ 1973 ء کے آئین کے کچھ حصے معطل کر دیے گئے ۔ اپنی غیر جانبداری کے تصور کی لاج رکھتے ہوئے فوجی حکومت نے تین ماہ کے اندر انتخابات کرا کے اختیارات عوامی نمائندوں کے سپرد کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن جلد ہی نئی حکومت کو احساس ہو گیا کہ حالات ضرورت سے کہیں زیادہ خراب ہیں ، چنانچہ

اس کا پہلا فرض صورتِ حال کو قابو میں لانا اور معاملات کو درست کرنا تھا'' (صفحہ 235)۔
ضیا کے شب خون کے بارے میں باب دوم میں پڑھیے۔

مطالعہ پاکستان برائے بی ایس سی، بی کام، ایم بی بی ایس، ایم اے، بی ای۔ مصنف: سعیدالدین، لیکچرار، مطالعہ پاکستان، مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔ شائع شدہ، فاروق کتاب گھر، کراچی۔ پہلا ایڈیشن 1986ء

ڈاکٹر ایس رضوان علی رضوی، پروفیسر پولیٹیکل سائنس، جامعہ کراچی کی اس کتاب پر ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں: ''اس مضمون پر لٹریچر کے بڑھتے ہوئے مطالبے کے پیش نظر یہ ایک جرات مندانہ اقدام ہے... یہ کتاب اس مضمون کا مطالعہ کرنے والوں کی معاونت کرے گی'' (صفحہ xi)۔

''رحمت علی کیمبرج کے پوسٹ گریجوئٹ طالب علم تھے'' (صفحہ 3)۔ ''قیامِ پاکستان کا اوّلین مقصد ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ پاکستان کے بانیوں نے مسلمانانِ برصغیر سے پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا وعدہ کیا تھا'' (صفحات 6-5)۔ ''نظریہ پاکستان کا مطلب ایک ایسا الگ وطن حاصل کرنا تھا جہاں مسلمان اپنے ضابطۂ حیات، اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں'' (صفحہ 10)۔ ''متحدہ ہندوستان میں اقبال پہلے اہم سیاست دان تھے جنہوں نے مسلمانانِ برِصغیر کے لیے ایک الگ سرزمین کا مطالبہ کیا.... چونکہ اقبال پاکستان کا مثالی خواب دیکھنے والے پہلے شخص تھے، اس لیے اُن کے تصورات ہی نظریہ پاکستان ہو سکتے تھے'' (صفحہ 11)۔ ''اقبال نے انڈیا میں ایک اسلامی ریاست کے تصور کو واضح شکل میں پیش کیا، اور اس کی جغرافیائی حدود کا تعین کیا'' (صفحہ 13)۔ ''قراردادِ لاہور تیئیس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی تھی'' (صفحہ 89)۔

رحمت علی عمانیوئل کالج، کیمبرج کے انڈر گریجویٹ تھے۔ وہ پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے طالب علم نہیں تھے۔ بانیانِ پاکستان نے عوام سے اسلامی ریاست بنانے کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ پاکستان اس ''مطالعہ پاکستان'' کے تصورات جیسی ریاست نہیں بننے جا رہا تھا۔ عوام اپنی ''ثقافتی نشو و نما کے مطابق'' کس طرح حکومت کر سکتے ہیں؟ بالکل سکول کے بچوں جیسی زبان استعمال کی گئی

ہے۔ اقبال نے کسی علیحدہ ریاست کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ایک ''مثالی خواب دیکھنے والا'' کون ہوتا ہے؟ پہلے اب ہمیں نظریۂ پاکستان کی نئی تعریف سے آشنا کیا گیا ہے: اقبال کے تخیلات۔ مزید غلطیوں کی تصحیح کے لیے باب دوم دیکھیے۔

مصنف انڈیا میں مسلمانوں کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں کی بات کرتے ہیں: علیگڑھ (صفحات 33-51)، دیوبند (صفحات 52-55)، ندوہ، انجمن حمایت اسلام، سندھ مدرسہ اور اسلامیہ کالج پشاور (صفحات 56-57)۔ یہاں بنگال کا ہندوستان کی مسلم سیاست، تعلیم یا ثقافت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ کتاب میں 1971ء کے سانحے کے لیے کوئی جگہ نہیں نکلی، نہ ہی ملک میں جمہوریت اور مختلف ادوار میں مارے گئے شب خون اور فوجی حکومتوں پر کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

مندرجہ بالا کتابیں ایک لازمی مضمون کا مواد مہیا کرتی ہیں۔ 1980ء کی دہائی کے آغاز میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ڈگری کلاسز کے لیے مطالعہ پاکستان کے جامع نصاب کو بطور اختیاری مضمون پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ نصاب تیار کرنے والے ماہرین کی ٹیم نے مکمل نصاب تیار کیا، درسی کتاب کا مواد تحریر کیا، اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا گیا (پتہ نہیں کس زبان سے)، اس کی ایڈیٹنگ کی گئی، اور پھر یہ تمام کاوشیں مربوط کتاب کی صورت سامنے آئیں۔

اس عظیم علمی کاوش کی ذمہ دار ٹیم کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس کے کوآرڈی نیٹر عبدالحمید راٹھور تھے (تعلیمی اہلیت کا کوئی ذکر نہیں)۔ مصنفین: خواجہ سعید الدین احمد ڈار (صدر شعبہ بین الاقوامی تعلقات، اور ڈین ایڈمنسٹریشن، اسلامیہ یونیورسٹی، قائد اعظم یونیورسٹی)، ڈاکٹر عبدالحمید (سابق پروفیسر شعبہ تاریخ، جامعہ پنجاب)، اور ڈاکٹر محمد اسلم سید (اسسٹنٹ پروفیسر، تاریخ، قائداعظم یونیورسٹی)۔ ایڈیٹرز: جاوید اقبال سید اور انوار الحق (ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی گئی)۔ کتاب کے حصوں پر نظر ثانی ڈاکٹر محمد یوسف عباسی اور ڈاکٹر ریاض احمد (شعبہ تاریخ، قائداعظم یونیورسٹی) نے کی۔

نصاب کمیٹی مندرجہ ذیل اساتذہ پر مشتمل تھی:

ڈاکٹر اے ایچ دانی (سابق پروفیسر قائداعظم یونیورسٹی)، ڈاکٹر سرفراز قریشی (ڈائریکٹر ریسرچ، پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈولپمنٹ اکنامکس)، ڈاکٹر محمد اسلم سید (اسسٹنٹ پروفیسر، تاریخ،

اعظم یونیورسٹی)، پروفیسر جاوید اقبال سید، ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل، عبدالحمید راٹھور، محمد راشد اور فاروق سونگی۔

کتاب کا پہلا والیم، جو تاریخ سے متعلق ہے، 'مطالعہ پاکستان، بی اے (تاریخ)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ تعداد اشاعت 4000 کاپیاں۔ اس کے کچھ دلائل اس طرح ہیں:

1857ء کی بغاوت کو 'جنگِ آزادی' قرار دیا گیا ہے (صفحہ 67)۔

آئی ایچ قریشی کی کتاب کا نام صفحہ 107 پر غلط لکھا ہوا ہے۔

''مولوی عبدالحق کا بیان کہ اردو زبان پاکستان کی بنیاد کی پہلی اینٹ تھی، بالکل صحیح ہے'' (صفحہ 159)۔

اس کا مطلب ہے کہ مسلم قومیت خالصتاً لسانی، پاکستانی حب الوطنی، اور نسلی احساس برتری کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ نہ تو صرف دہلی اور یوپی کے لوگوں کی طرف سے آیا تھا، اور نہ ہی صرف انھوں نے ہی قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی۔ تحریک پاکستان کی چوٹی کی قیادت میں سے کسی نے بھی اردو کے تحفظ کو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ایسی کوئی قرارداد منظور نہیں کی تھی کہ اردو ہی پاکستان کی سرکاری یا قومی زبان ہوگی۔ اور اس حوالے سے بانیان پاکستان، پاکستانی حکمرانوں سے کہیں زیادہ عقلمند تھے۔ اگر وہ اُس وقت اردو کو قیام پاکستان کے ساتھ منسلک کردیتے تو بہت سے بنگالی، سندھی، بلوچی اور پٹھان، اور کسی حد تک پنجابی بھی تحریک پاکستان سے کنارہ کشی اختیار کرلیتے، یا کم از کم پاکستان کے لیے اُن کا جوش اور جذبہ ماند پڑ جاتا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ''بنیاد کی یہ پہلی اینٹ'' بنگالیوں کی طرف اچھالی گئی تو اسی ایک اقدام نے مرکز سے دوری اور علیحدگی کے بیج بودیے۔ یہ وارننگ اُن لوگوں کے لیے کافی ہونی چاہیے جو تاریخ سے سبق سیکھنے کے قائل ہیں۔

''1930ء میں اقبال نے ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کی کوشش کی'' (صفحہ 234)۔ اقبال نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ مزید وضاحت باب دوم میں۔

Sir Theodore Morison کو اکثر مقامات پر Marlin لکھا ہوا ہے۔ ان کا حوالہ

کتاب کا نام بتائے بغیر دیا گیا ہے۔بس یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کتاب 1818ء میں شائع ہوئی تھی (صفحہ 248)۔

اس ناقابل یقین غلطی کی تصحیح باب دوم میں دیکھیے ۔ حیرت ہے کہ ملک کے تمام نامور مورخین، جنہوں نے اس درسی کتاب کی تیاری میں اپنا حصہ ڈالا، کو ایم اے او کالج ،علیگڑھ کے ایک سابق پرنسپل کا نام بھی نہیں آتا تھا، اور نہ ہی اُنھوں نے اُس کتاب کا نام بتانا مناسب سمجھا جس کے وہ حوالے استعمال کررہے تھے۔اور اُنہیں یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کتاب کس صدی میں شائع ہوئی تھی۔تصحیح کے لیے باب دوم دیکھیے ۔

''رحمت علی نے اپنے کتابچے ،'اب ، یا کبھی نہیں' میں انڈیا کی تقسیم کا ایک منصوبہ پیش کیا'' (صفحہ 252)۔

رحمت علی کا چار صفحات پر مشتمل اشتہار کتابچہ نہیں تھا۔

ایوب خان کے شب خون پر: ''سات اکتوبر 1958ء کو ہر کسی نے سنا کہ صدارتی حکم نامہ جاری کیا گیا ہے، جس نے آئین کو معطل کر دیا ہے'' (صفحہ 366)۔''ستائیس اکتوبر 1958ء کی رات اسکندر مرزا کو عہدے سے برطرف کردیا گیا، اور جنرل محمد ایوب خان کی قیادت میں فوج نے ملک کا تمام انتظامی کنٹرول سنبھال لیا۔اس کے ساتھ ہی ملک میں سیاسی استحکام، مضبوط نظم ونسق اور امن اور سلامتی کے نئے دور کا آغاز ہوا'' (صفحہ 372)۔

اگر مارشل لا کا نفاذ، شہریوں کے حقوق کی معطلی ، سیاسی جبر، براہِ راست انتخابات کا خاتمہ، فوجی حکومت اور تمام اختیارات فردِ واحد کے ہاتھ میں آجانے کا نام استحکام ،امن اور سکون ہے تو پھر ایسا استحکام اور امن اور سکون تو قبرستان میں بھی میسر ہوتا ہے ۔فوت شدگان نہ حرکت کرتے ہیں نہ فریاد۔

بھارت کے ساتھ 1965ء کی جنگ کے دوران ''پاکستان نے اپنی سرحدوں کی کامیابی کے ساتھ حفاظت کی'' (صفحہ 390)۔1965ء کی جنگ پر وضاحت باب دوم میں دیکھیے ۔

''1969ء میں مختلف سیاسی گروہ مختلف مطالبات پیش کر رہے تھے ۔ مطالبات کا سلسلہ دراز ہوتا ہوا بدنظمی اور انتشار تک جا پہنچا۔اس کے نتیجے میں صدر (ایوب خان) نے انتظامی معاملات

کمانڈر انچیف، جنرل محمد یحییٰ خان کے ہاتھ میں دے دیے'' (صفحہ 395)۔ قارئین فاضل پروفیسرز کی تحریر کردہ ایک درسی کتاب کے نہایت احمقانہ جملے اور ناقص اردو نوٹ کر سکتے ہیں۔

صدر ایوب خان نے جنرل یحییٰ خان کو ملک کے ''انتظامی حالات چلانے'' کے لیے نہیں کہا تھا۔ انھوں نے شراب وشباب کے رسیا ایسے شخص کو کمانڈر انچیف بنا دیا تھا جو ایک ہاتھ بندوق پر، دوسرا وہسکی کے گلاس پر رکھ کر قوم کی قسمت کے ساتھ کھلواڑ کرتا رہا۔ یحییٰ خان ایوب کے جانشین نہیں تھے۔ انھوں نے فیلڈ مارشل کو زبردستی عہدے سے ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ اُس وقت کے آئین کے مطابق وہ واحد شخص جو ایوب کا جانشین بن سکتا تھا، وہ سپیکر قومی اسمبلی تھا۔ لیکن ایوب یا تو خائف تھے کہ کوئی سولین حکومت اُن کی غلط کاریوں کا احتساب کر سکتی ہے، یا وہ فوج کو خوش کرنے کی کوشش میں تھے، کیونکہ فوج عملی طور پر 1962ء سے اقتدار سے باہر تھی، اور ''احساس محرومی'' کی وجہ سے بے چین ہو رہی تھی، یا پھر ایوب اپنے خلاف احتجاج کرنے والے پاکستانیوں سے انتقام لینے کے لیے اُن پر یحییٰ خان جیسا شخص مسلط کرنا چاہتے تھے۔ ملک میں اُن کے خلاف نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اُنھیں 'کتا' کہا گیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے 'جوابی کارروائی' کرتے ہوئے ملک کو ایسے شخص کے حوالے کر دیا جس نے وقت ضائع کیے بغیر ملک کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ لیکن مجال ہے جو درسی کتاب طلبہ کو ان حقائق کی بھنک بھی پڑنے دے۔ مزید وضاحت باب دوم میں۔

1971ء کے واقعات کے بارے میں: ''دشمن قوتیں پاکستان میں سرگرم عمل تھیں۔ ہندو لیڈر نہیں چاہتے تھے کہ ملک کے دونوں بازوں کے درمیان کوئی معاہدہ طے پائے.... اس پر فوج نے (پچیس مارچ کو) مداخلت کی۔ اسے امن وامان بحال کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مجیب الرحمان کو گرفتار کیا گیا۔ عوامی لیگ کی جیتی ہوئی بہت سی نشستوں کو 'خالی' قرار دیا گیا۔ فوج امن وامان بحال کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن ان اقدامات کے نتیجے میں ملک کے دونوں بازوں کے درمیان شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ انڈیا اس پیش رفت کا بغور جائزہ لے رہا تھا... نومبر کے اختتام تک اس نے پاکستان کے خلاف جنگ کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ پاکستانی قیادت کے پاس عالمی سطح پر اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے سفارتی مہارت اور منظم پراپیگنڈا مشینری کا فقدان تھا۔ چنانچہ جب دونوں بازوں کے درمیان پرتشدد واقعات شروع ہوئے تو انڈیا نے مختلف ممالک میں نام نہاد پاکستانی لابیز کو غیر موثر

کر دیا۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں انڈیا نے دونوں سمتوں سے پاکستان پر حملہ کیا۔ پاک فوج جنگ کرنے کی صلاحیت تو رکھتی تھی لیکن اس کے پاس تجربہ کار، اہل اور فوری فیصلہ کرنے والی قیادت کا فقدان تھا۔ انڈین نیوی نے خلیج بنگال کی ناکہ بندی کر کے مغربی پاکستان سے رابطہ کاٹ دیا۔ اس طرح پاکستان فورسز اس علاقے میں (کس علاقے میں؟) گھیرے میں آ گئیں۔ اُنہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ بیشک ہماری افواج بہادری سے لڑیں، لیکن اُنہیں سولہ دسمبر کو ڈھاکہ میں بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے'' (صفحات 402-400)۔

پاکستان دولخت ہونے کے اصل واقعات اور اسباب باب دوم میں پڑھیے۔

ہر باب کے اختتام پر دیے گئے حوالہ جات تین حوالوں سے ناقص ہیں: وہ ناکافی ہیں، مصنف کے نام اور کتاب کے عنوان کے علاوہ کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں، اور بعض جگہوں پر انگریزی اشاعت کا اردو ترجمہ شناخت کو مشکل بنا دیتا ہے۔

کتاب کا دوسرا والیم تیار کرنے والی ٹیم میں کچھ نئے نام شامل تھے۔ کوارڈی نیٹر عبدالحمید راٹھور ہی تھے۔ مصنفین: سعید الدین احمد ڈار (صدر شعبہ بین الاقوامی تعلقات، قائداعظم یونیورسٹی)، ڈاکٹر محمد ظفر احمد خان (پرنسپل گورنمنٹ کالج، اصغر مال، راولپنڈی)، ڈاکٹر مخدوم تصدق حسین (سابق پروفیسر جامعہ پنجاب)، پرویز اقبال چیمہ (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ بین الاقوامی تعلقات، قائداعظم یونیورسٹی)، توصیف احمد (ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ افرادی قوت، گورڈن کالج، راولپنڈی)، خالد حیات چوہدری (ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ افرادی قوت، اسلام آباد)، نذیر صدیقی اور اقبال احمد بخت (ایسوی ایٹ پروفیسر؟)۔ مترجم: پروفیسر کرم حیدری، حسین ہمدانی اور انوار الحق۔ ایڈیٹرز: پروفیسر جاوید اقبال سید، بشیر محمود اختر، اور انوار الحق۔ کتاب کے کچھ حصوں پر ڈاکٹر محمد ریاض (شعبہ اقبالیات؟) اور سعید شفقت (صدر شعبہ مطالعہ پاکستان، قائداعظم یونیورسٹی) نے نظر ثانی کی۔

یہ ماہرانہ کاوش 1983ء میں شائع ہوئی (دوسرا والیم پہلے والیم سے اشاعت میں کیوں سبقت لے گیا؟)۔ اسے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ''مطالعہ پاکستان، بی اے۔ کتاب دوم'' کے عنوان سے شائع کیا۔ تعداد اشاعت 3000 کاپیاں۔ کتاب کا موضوع پاکستان کی معیشت، تمدن اور بین الاقوامی تعلقات ہیں۔

کچھ دیگر امور کے علاوہ کتاب مندرجہ ذیل آراء، تبصرے اور بیانات رکھتی ہے:

"1947ء کے بعد بہت فکر انگیز مذہبی لٹریچر سامنے آیا۔ نظریاتی طور پر پاکستانی قومیت اور پاکستان کے اسلامی دنیا کے ساتھ تعلقات پر خاطر خواہ لٹریچر دستیاب ہے" (صفحہ 175)۔

اس دعوے کو تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ اسلام پر بہت کم ایسا مواد لکھا گیا ہے جو علمی تحقیق کا نتیجہ، فکر انگیز، قابل مطالعہ ہونے کے علاوہ مسلکی اختلافات سے پاک ہو۔ علمی تحقیق رکھنے والی قابل احترام کتابیں عزیز احمد اور فضل الرحمٰن نے لکھیں، لیکن وہ بیرونی ممالک میں شائع ہوئیں۔ فضل الرحمٰن صرف اُس وقت پاکستان میں ٹھہر سکے جب وہ چند سالوں کے لیے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر مقرر کیے گئے تھے۔ اس کے بعد اُنہیں ملک سے نکال دیا گیا۔ وہ برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ عزیز احمد انگلینڈ اور کینیڈا میں کام کرتے تھے۔ پاکستانی قومیت پر غالباً کوئی مواد دستیاب نہیں۔ جہاں تک پاکستان کے اسلامی دنیا کے ساتھ تعلقات کا سوال ہے تو ترکی، مصر، سعودی عرب یا ایران یا کسی اور اسلامی ملک کے ساتھ تعلقات پر کوئی کتاب دستیاب نہیں، حالانکہ ہم کراچی میں بین الاقوامی تعلقات پر بہت اچھا انسٹی ٹیوٹ رکھتے ہیں۔ کم از کم دو مطالعاتی مراکز شمالی افریقہ، مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا کے لیے مخصوص ہیں۔ پروفیسر صاحبان کو ایسے بے بنیاد دعوے کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے جن کا لائبریری میں قدم رکھتے ہی بھرم کھل جاتا ہو۔

1971ء کے سانحے پر: "یحییٰ خان نے تمام رہنماؤں اور پارٹیوں کے درمیان اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن مجیب الرحمٰن کی مخالفت نے اُنہیں اس کی اجازت نہ دی۔ مجیب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مطالبہ کررہے تھے۔ اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اکیس مارچ 1971ء فوج نے مداخلت کی۔ بہت سے ہندو مہاجرین انڈیا چلے گئے۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ انڈیا نے رضا کاروں اور مہاجروں کو ٹریننگ فراہم کی۔ یہ سلسلہ چار دسمبر 1971ء تک جاری رہا۔ پھر انڈیا نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کردیا۔ دونوں ممالک کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان ملک سے الگ ہوگیا" (صفحات 351-350)۔

سقوط ڈھاکہ پر باب دوم میں پڑھیے۔

حوالہ جات کا معیار والیم نمبر ایک سے بھی بدتر ہے۔

جانچ کی گئی تمام کتب مطالعہ پاکستان (لازمی) تھیں۔ بی اے کے طلبہ کے زیر مطالعہ تاریخ کی کتب (جو کہ ایک اختیاری مضمون ہے) کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں۔ یہاں میں محض مثال کے طور پر تاریخ کی ایک درسی کتاب کا جائزہ لیتا ہوں۔ مشرقی پاکستان کے ایک پروفیسر صاحب کی تحریر کردہ یہ کتاب گزشتہ تیس برس سے زائد عرصہ سے نصاب کا حصہ ہے۔ اس کا موجودہ ایڈیشن 1989ء کا ہے، لیکن اس میں گزشتہ ایڈیشنز اور دوبارہ اشاعت کی کوئی معلومات درج نہیں۔

پاک و ہند کی نئی تاریخ، 1526ء سے اب تک۔ مصنف: کے علی۔ شائع شدہ: نعیم پبلشرز، لاہور۔ 1989ء

یہاں ہمارے سامنے کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو انگریزوں کی آمد سے لے کر 1970ء تک کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔

''یہ سر محمد اقبال تھے جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے الگ سرزمین کا خواب دیکھا''۔ خطبہ الہ آباد سے غلط پیراگراف کا حوالہ دیا گیا ہے (صفحہ 252)۔

اقبال یہ خواب دیکھنے والے پہلے شخص نہیں تھے؛ درحقیقت اُنھوں نے 1937ء سے پہلے یہ خواب نہیں دیکھا تھا۔ اُس وقت درجنوں دیگر افراد ایسا تصور رکھتے تھے۔

''1933ء میں سوچ سمجھ رکھنے والے ایک نوجوان سیاست دان، چوہدری رحمت علی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے لفظ پاکستان تیار کیا'' (صفحہ 252)۔

رحمت علی سیاست دان نہیں تھے۔ پروفیسر صاحب کو علم ہونا چاہیے کہ لفظ 'پاکستان' کوئی پکوان یا آملیٹ نہیں جسے تیار کیا جائے۔ آپ کسی لفظ کو ٹکسال، ایجاد، یا تخلیق یا تجویز کرتے ہیں؛ سوچ حروف کا لبادہ اُوڑھ کر تخیل پرواز ہوتی ہے۔ سب درست، لیکن آپ لفظ 'تیار' بہرحال نہیں کرتے ہیں۔

''تیئیس مارچ 1940ء کو مسلم لیگ نے ایک الگ سرزمین، مسلمانوں کے لیے پاکستان' حاصل کرنے کا اعلان کیا'' (صفحہ 254)۔

دو درجن سے بھی کم الفاظ رکھنے والے اس مختصر سے جملے میں پروفیسر صاحب کمال مہارت کا

مظاہرہ کرتے ہوئے تین غلطیاں کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ 'الگ سرزمین' نہیں، 'آزاد ریاستیں'؛ تئیس مارچ نہیں، چوبیس مارچ؛ اور اُس موقع پر لفظ پاکستان استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

''مولانا محمد علی نے بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ اس تصور کو علامہ اقبال نے شاعرانہ تخلیل کا روپ دیا تھا'' (صفحہ 261)۔

کس کتاب میں اقبال نے دوقومی نظریے کو 'شاعرانہ تخلیل کا روپ' دیا ہے؟ میں گزشتہ 45 برسوں سے اقبال کا مطالعہ کرر رہا ہوں، مجھے تو کسی نظم میں یہ موضوع نہیں ملا۔

''تئیس مارچ 1940ء کو لاہور کی تاریخی قرارداد میں مسلمانوں نے ایک الگ سرزمین کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 269)۔

تئیس مارچ نہیں، چوبیس مارچ؛ اور الگ سرزمین کی بجائے آزاد ریاستیں پڑھیں۔

''اردو ابھی تک (یہ بات 1989ء میں کی جارہی ہے) ملک کے دونوں بازوں کے درمیان سرکاری رابطے اور باہمی تعلقات کی زبان کا عظیم درجہ حاصل رکھتی ہے'' (صفحہ 287)۔

کیا اردو دونوں دھڑوں کے درمیان کبھی سرکاری رابطے کی زبان رہی تھی؟ نہیں۔ سرکاری رابطہ کی زبان انگریزی تھی۔ زبان کو 'عظیم درجہ' کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ تیسری بات یہ کہ اور تو اور، تحریکِ تکمیل پاکستان کے زعما، جو پاکستان اور بنگلہ دیش کو دوبارہ اکٹھا کرنے کا خواب رکھتے ہیں، بھی یقین نہیں کریں گے کہ 1989ء میں مشرقی اور مغربی بازوں کے درمیان کوئی رابطہ تھا۔ یہ جملہ اپنے وقت سے بھی کوئی اٹھارہ سال پیچھے ہے۔

''اکتوبر 1958ء کا انقلاب اس حوالے سے منفرد تھا کہ اس میں خون کا ایک قطرہ نہ بہا، اور اسے عوام کی حمایت حاصل تھی'' (صفحہ 302)۔

1958ء کا شب خون 'انقلاب' نہیں تھا۔ اس میں خون کا کوئی قطرہ نہیں بہا ہوگا، کیونکہ قوم لاچار تھی، لیکن اس اقدام کو عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ اُنھوں نے اسے قبول کیا، کیونکہ وہ فوج سے خوفزدہ تھے۔ خوف کی وجہ سے تسلیم اور ادب کو حمایت یا منظوری نہیں کہتے۔

''کوئی اور متبادل نہ پاتے ہوئے صدر ایوب نے فوج کے کمانڈر انچیف، جنرل آغا محمد یحییٰ خان کو خط لکھ کر درخواست کی کہ وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں کیونکہ وہ سنگین صورتِ حال کو کنٹرول

کرنے میں ناکام ہو چکے تھے'' (صفحہ 327)۔

متبادل نہیں، آئینی پابندی موجود تھی کہ سپیکر قومی اسمبلی کو اختیارات سونپ کر منصب سے الگ ہو جائیں۔ ایوب خان نے یہ آئینی راستہ اختیار نہ کیا۔ اس کی انہی صفحات میں بیان کی گئی کچھ دیگر وجوہات کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ سپیکر قومی اسمبلی ایک بنگالی تھے۔

''اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے، جہاں سے اُنھوں نے بیرسٹرایٹ لا حاصل کیا'' (صفحہ 350)۔

''بیرسٹرایٹ لا'' حاصل کرنے کی بات احمقانہ ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ اُس نے وکیل، یا ڈاکٹر، یا انجینئر حاصل کیا۔ بیرسٹر بننا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مترادف نہیں ہے۔ بہت سی مثالیں ہیں، جن کے مطابق ایک میٹرک پاس شخص بھی بیرسٹر بن گیا، جیسا کہ محمد علی جناح۔

''جناح نے انگلینڈ سے قانون کی ڈگری حاصل کی'' (صفحہ 351)۔

جناح صاحب نے انگلینڈ سے قانون کی کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔ وہ محض ایک بیرسٹر تھے۔

''علامہ اقبال نے 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ سرزمین حاصل کرنے پر زور دیا۔ آخر کار، لاہور کے منٹو پارک (اب اقبال پارک) میں 1940ء میں اپنے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے برِصغیر کو دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا'' (صفحہ 356)۔

اقبال نے الہ آباد میں کسی الگ سرزمین کی بات نہیں کی تھی، چہ جائیکہ کہ زور دے کر کہا ہو۔ دوسرے جملے میں 'دو آزاد ریاستیں' نہیں، آزاد ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

''1970ء کے انتخابات کے بعد بدقسمتی سے ملک سیاسی بحران اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ بھارت نے روس کی شہ پر پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا'' (صفحہ 380)۔

1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کی حقیقت باب دوم میں پڑھیے۔

''ابھی تک 1973ء کا آئین نافذ ہے (یہ جون 1979ء کی بات ہے)'' (صفحہ 380)۔

یہ دعویٰ تو جنرل ضیاالحق بھی نہ کرتے۔ اُن کے اپنے الفاظ ہیں کہ آئین ساقط کر دیا گیا ہے۔

''چوہدری رحمت علی کا نام تاریخ میں ایسے شخص کے طور پر جانا جاتا ہے جنہوں نے برِصغیر میں مسلم ریاست کو لفظ 'پاکستان' دیا'' (صفحہ 387)۔

پروفیسر صاحب زبان کی ایسی کی تیسی کرنے میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔

''سر فضل حسین گول میز کانفرنس کے ایک رکن تھے'' (صفحہ 390)۔

سر فضل حسین نہ تو گول میز کانفرنس کے وفد میں شامل تھے، اور نہ ہی اس کے رکن تھے۔ جن سالوں کے دوران گول میز کانفرنسز ہوئیں، وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل برائے تعلیم کے رکن تھے، اور وہ نئی دہلی اور شملہ میں قیام کرتے تھے۔ ہاں، علالت کے باعث چند ماہ ایبٹ آباد میں گزارے تھے۔ اُنھوں نے اس عرصے کے دوران لندن کا کوئی سفر اختیار نہیں کیا تھا۔
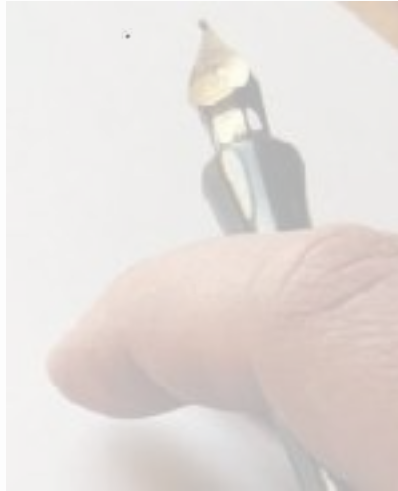
2

غلطیوں کا سیلاب

غلطیوں کی فہرست

درسی کتب کے جائزے کے بعد میں نے ان میں موجود غلطیوں کی ایک فہرست مرتب کی تو ان کی تعداد سو سے بھی تجاوز کر گئی ۔ سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ قاری کو محض ان کی فہرست سے آشنا کرنے کی ضرورت نہیں ۔ محض اعادے سے برین واشنگ تو ہو سکتی ہے لیکن ذہنی صلاحیتیں مرجاتی ہیں ۔ صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر میں نے کچھ مزید غلطیوں کو جگہ دی ہے ۔

غلط تاریخ: قرار دادِ لاہور تئیس مارچ 1940ء کو منظور ہوئی ۔ پاکستان چودہ اگست 1947ء کو وجود میں آیا ۔ مسلم لیگ 1905ء میں قائم ہوئی ۔ گول میز کانفرنس کا انعقاد 1913ء کو ہوا ۔ اقبال نے الہ آباد کا خطبہ 1931ء میں دیا ۔ نہرو رپورٹ 1926ء میں پیش کی گئی ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکینِ اسمبلی کا دہلی میں اجلاس 1949ء کو ہوا ۔ پاکستان اسٹیٹ بنک ستائیس جون 1947ء کو قائم ہوا ۔ (آخری پانچ بیانات رفیع اللہ صاحب کی تحریر کردہ ایک کتاب میں پائے گئے) ۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کا کراچی میں اکتوبر 1936ء کو اجلاس ہوا ۔ لکھنو پیکٹ پر 1910ء میں دستخط کیے گئے ۔

غلط بیانات: جناح نے انگلینڈ سے قانون کی ڈگری حاصل کی ۔ جمال الدین افغانی کا تعلق افغانستان سے تھا، اور وہ وہیں پیدا ہوئے ۔ اقبال نے انگلینڈ سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ اقبال نے بار ایٹ لا کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی ۔ اقبال نے بیرسٹری کی

ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اقبال نے یونیورسٹی آف لندن سے تعلیم حاصل کی۔ شمالی انڈیا میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا لباس ایک جیسا تھا۔ سید احمد خان نے ایک الگ مسلم ریاست کا مطالبہ کیا تھا۔ وفد کی قیادت نواب محسن الملک نے کی۔ مسلم لیگ اور کانگرس، دونوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ پاکستانی مرد شلوار، قمیص اور شیروانی پہنتے ہیں۔ 1947ء سے پہلے سعودی عرب ہندوستانی مسلمانوں کی آزادی کا حامی تھا۔ 1945ء میں لارڈ اٹلے برطانیہ کے وزیراعظم بن گئے۔ رحمت علی نے اقبال کی 1930ء کی سکیم کو پاکستان کا نام دیا۔ رحمت علی نے بیرسٹر کی ڈگری ڈبلن یونیورسٹی سے حاصل کی۔ رحمت علی کی تدفین ووکنگ میں کی گئی۔ رحمت علی کے منصوبے کو گول میز کانفرنس میں شریک مسلم وفد نے مسترد کر دیا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھارتی فورسز کو ہر جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1969ء میں یحییٰ خان نے ملک میں نیا آئین نافذ کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے دہلی میں 1946ء میں ہونے والے اپنے سالانہ اجلاس میں قراردادِ لاہور میں ترامیم کیں۔ مولانا محمد علی نے انگلش ادب میں آنرز کی ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ سید احمد خان نے انگلینڈ میں 1869ء سے لے کر 1878ء تک، نو سال تک قیام کیا۔ جناح کو پاکستان کے عوام نے گورنر جنرل منتخب کیا۔ سید احمد خان نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ مولانا محمد علی نے آل انڈیا مسلم پارٹی کی کانفرنس جنوری 1929ء میں بلائی۔ لاہور کا ''دی ایسٹرن ٹائمز'' ''دی ویسٹرن ٹائمز'' کہلاتا ہے۔ رحمت علی ایک ادیب اور صحافی تھے۔ ایک ''پنجابی'' کی ''The Confederacy of India'' کا ترجمہ ''وفاق ہند'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ فضل کریم خان درّانی کو فرزند خان درّانی لکھا گیا ہے۔ رحمت علی نے 1933ء میں ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کی علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی کے اجلاس کو تمام مسلمان اراکین اسمبلی کا اجلاس لکھا گیا ہے۔ میاں فضل حسین کو گول میز کانفرنس کا رکن بتایا گیا ہے۔

غلط اور متعصبانہ بیانات: 1965ء میں پاکستان اور انڈیا کی جنگ کے دوران انڈیا نے شکست کھانے کے بعد جنگ بندی کی درخواست کی۔ 1947ء میں ہندوؤں اور سکھوں نے لاتعداد مسلمانوں کا خون بہایا (مسلمانوں کے ہاتھوں پاکستان میں ہونے والے فسادات کا کوئی ذکر نہیں)۔ اردو پورے جنوبی ایشیا میں بولی جانے والی زبان تھی۔ اردو وہ واحد زبان ہے جو آج بھی پشاور سے

لے کر اس کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ اردو کی مخصوص خوبی ہے کہ اس میں دیگر زبانوں کے شامل ہونے والے الفاظ اجنبی محسوس نہیں ہوتے، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ ہیں۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جاتی ہے: درحقیقت یہ برصغیر میں عوامی رابطے کی زبان تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ انڈیا میں ابھی بھی یہ مقصد پورا کرسکتی ہو۔ بھارت (انڈیا) غیر مسلموں کا ملک ہے۔ لیاقت علی خان کو قوم نے قائد ملت کا خطاب دیا۔ انگریزوں نے دھوکے اور مکاری سے انڈیا پر قبضہ کیا۔

گنجلک اور مبہم بیانات: انڈیا کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی (سندھ کلاس پنجم)۔ ایک جگہ پر رہتے ہوئے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے، اور آپس میں گھل مل گئے (سندھ کلاس ششم)۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ قانون کی عدالتیں ضلع میں امن وامان قائم رکھتی ہیں، (اگلے صفحے پر ہے) پولیس ضلع میں امن وامان قائم رکھتی ہے (کلاس سوئم)۔ سید احمد خان پاکستان کے ایک عظیم مفکر تھے۔

لاعلمی، تعصب سے لبریز بے سروپا بیانات: شیخ الہند محمود حسن اور مودودی نظریۂ پاکستان کے بانیوں میں شامل تھے۔ 1857ء کی بغاوت جنگِ آزادی تھی۔

عقل وفہم سے ماورا بیانات: قراردادِ لاہور نے ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا تھا۔ 1956ء کا آئین فعال ہونے سے پہلے ہی ساقط کردیا گیا۔

حقائق کا دیدہ دانستہ مغالطہ: این ڈبلیو ایف پی میں سرخ قمیص تحریک، اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا اُن ابواب میں کوئی ذکر نہیں ملتا جو ان صوبوں کے بارے میں ہیں۔ 1971ء میں پاکستان ٹوٹ جانے کا ذکر چند ایک سطروں، یا ایک بمشکل ایک پیراگراف میں کیا گیا ہے، اور ہر جگہ اس کی وجہ بھارتی حملہ بیان کیا گیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے اصل مقاصد کا کہیں ذکر موجود نہیں کہ اس پارٹی کو انگریز حکومت سے وفاداری کی حوصلہ افزائی کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مسلم انڈیا کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی تاریخ میں بنگالیوں کے کردار کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ سکولوں کی زیادہ تر کتب میں مارشل لا کا کوئی ذکر نہیں۔ طلبہ کو یہ نہیں بتایا گیا کہ شملہ وفد کا مدعا انگریز سرکار سے رعایت حاصل کرنا تھا: صرف اسی کا ذکر ہے کہ اس نے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا تھا۔

1930ء میں اقبال نے انڈیا کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ 1930ء میں اقبال نے ہندوستان کے تمام مسلم اکثریتی علاقوں کو ملا کر آزاد مسلم ریاست تشکیل دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس ایک ہندو جماعت تھی۔ لکھنو پیکٹ مسلمانوں، مسلم لیگ اور جناح صاحب کے لیے بہت بڑی کامیابی تھا۔ 1977ء کے شب خون کا نہ صرف جواز پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی فوجی حکومت کی تعریف کی گئی ہے۔ 1937ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے محض اتفاقاً صوبائی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور فکری بیداری کا تمام کریڈٹ علی گڑھ تحریک کو جاتا ہے۔ ایوب خان کے 1958ء کے شب خون کو انقلاب کہا گیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامی، دہلی اسلامی تعلیمات کی ترویج کے لیے قائم کی گئی تھی (کسی جگہ بھی اس کا کانگرس نواز، اور مسلم لیگ مخالف کردار بیان نہیں کیا گیا)۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں تحریک دیوبند کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو معاشی طور پر خوشحال بنایا۔

غلطیوں کی درستی

یہ آٹھ قسم کی غلطیاں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونی چاہییں کہ کس طرح تاریخ کو مسخ کیا گیا، مبہم اور یک طرفہ معلومات کے ذریعے حقائق کو روندنے کی کوشش کی گئی۔ حقائق مسخ کرنے اور ابہام پیدا کرنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کیا گیا۔ بعض جگہوں پر صریحاً جھوٹ بولا گیا۔ طلبہ کے ذہن میں ایسی چیزیں اتاری گئیں جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ حقیقت سے ہر طرح کا انحراف روا رکھا گیا: فاش غلطیاں، ادھورا سچ، دھوکہ دہی، خوش فہمی، داخلی تصورات، مبہم تصورات، کمزور دلائل، من گھڑت تصورات، محدود حقائق، کھوکھلے بیانات، اندازے کی غلطی، کوتاہ بینی، بے یقینی، قلم کی لغزش، عدم توجہی اور بے خیالی۔ غلطیوں اور غیر معمولی تصورات کا ایسا طومار باندھا گیا کہ حقائق نظر سے اوجھل ہو گئے۔ التباس کی دھند میں حقیقت چھپ گئی۔ خالی ذہن جہالت کو جذب کر لیتے ہیں۔ ان کتابوں کے نوخیز قارئین کے سامنے صرف معلومات کا کاٹھ کباڑ، اور سچ سے گریز پر مبنی والی سوچ ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے وہ بھی آہستہ آہستہ مفلوج، ساکت اور جامد سوچ کے حامل انسان بن جائیں گے۔ اس مصنوعی علم کا نوجوان طلبہ کے چوکس، متجسس اور بیدار ذہنوں پر کتنا منفی اثر

ہوگا، یہ سوچ کر انسان کا دل دہل جاتا ہے۔

ان کتابوں میں جانچ، علم کی درستی، فہم وفراست، تعلیم، دانش، بیدار سوچ، محنت کا جذبہ، سچ جاننے کی طلب اور واضح تصورات کا فقدان ہے۔ الغرض ہر وہ چیز جو ایک درسی کتاب میں ہونی چاہیے، ان میں نہیں ہے۔ اگر انہیں بہتر بنانے، نظر ثانی کرنے، اور غلطیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مفید بنانے، اور منفی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو انہیں جدید خطوط پر از سرِ نو مرتب کرنا ہوگا۔ لیکن انہیں درست کرنے کی ہر کوشش سے پہلے ضروری ہے کہ ہم غلطیوں کی جانچ کر لیں۔ بالفاظ دیگر، ہمیں نشاندہی کرنی ہے کہ تباہی کے اس سفر میں سچ اور حقیقت کی راہ سے گریز کہاں کہاں روا رکھا گیا ہے۔

آخری باب میں ہر کتاب پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے اس میں موجود غلطیوں کی فہرست بنائی ہے۔ بعض جگہوں پر انہیں درست بھی کر دیا ہے۔ لیکن حقائق اور بیان کی تواتر سے ہونے والی غلطیاں ایسی ہیں کہ اگر میں انہیں اُسی مقام پر درست کرنے کی کوشش کرتا تو قارئین اکتاہٹ محسوس کرتے۔ کچھ ایسی غلطیاں ہیں جن کا تعلق تاریخی پیش رفت کی تشریح سے ہے؛ ان کے لیے طویل وضاحت درکار تھی۔ محض تاریخ یا نام تبدیل کرنے سے کام نہیں چلتا تھا۔

میں نے یہ باب ریکارڈ کی درستی، اور باب اوّل میں کی گی تنقید میں توازن پیدا کرنے اور غلطیوں کی اصلاح کے مثبت جذبے سے لکھا ہے۔ یہی میری کاوش کا حاصل ہے۔ میں نے انتہائی فاش اور واضح غلطیوں کو منتخب کرتے ہوئے دو کام کیے: غلطیوں کی جہت اور مضرات کی نشاندہی، اور انہیں درست کر کے صحیح معلومات کی فراہمی۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے اکثر مقامات پر تفصیل میں جانا پڑا تھا، کیونکہ اس کے بغیر درسی کتب کے غلط بیانات کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ دیگر مقامات پر میں نے مختصر الفاظ میں غلطی درست کر دی ہے، تاکہ قاری اُس کا اصل کتاب سے موازنہ کر کے خود ہی سمجھ جائے۔ کچھ مقامات پر کتاب کے دلائل کو رد کرنے کے لیے میں نے سخت تنقیدی لہجہ بھی اپنایا ہے۔

میں نے زیر نظر کتابوں سے ایک ٹیکنیک مستعار لی ہے، اور جو کہ اعادہ کرنا ہے۔ لیکن میرا مقصد درسی کتب میں روا رکھے گئے اعادے سے مختلف ہے۔ قارئین کی برین واشنگ نہیں، تبصرے کو ممکنہ حد تک واضح الفاظ میں قارئین تک پہنچانا مقصود تھا۔ میں ایسی کوئی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس

کی وجہ سے غلط فہمی اور غلطی پر غلطی کرنے کا تاثر ابھرے۔ چنانچہ باب اوّل میں درست کی گئی کچھ غلطیوں کا یہاں بھی اعادہ کیا گیا ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ بات واضح کرنے کی کوشش میں دہرائے جانے والے تبصروں کو برداشت کریں۔

اس باب میں، میں نے مواد کو ترتیب دینے کے لیے معروضی طریقہ استعمال کیا ہے۔ ہر سیکشن میں پہلا پیراگراف درسی کتاب سے براہِ راست نقل کیا گیا ہے (حوالے کے لیے واوین ڈالنے کی ضرورت نہیں)۔ اس سے اگلے پیراگراف میں غلطی کو درست، اور اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

1857ء کے واقعات

یہ جنگِ آزادی تھی (تمام صوبوں، وفاقی حکومت، نجی شعبے میں کام کرنے والے مصنفین، اردو اور انگریزی کتب، تمام کلاسز شامل ہیں)۔ یہ پہلی جنگِ آزادی تھی (سندھ، انگلش، کلاس پنجم) یہ مسلمانوں کی آخری جنگِ آزادی تھی (وفاقی حکومت، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

اس بغاوت یا شورش کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں 1857-1759 کے دوران سالوں کا مختصر جائزہ لینا ہوگا۔ شاہ عالم ثانی نے 1759ء میں مغل تخت سنبھالا۔ نواب، اودھ کے وزیر، شجاع الدولہ کی غداری اور خود غرضی پر مبنی پالیسیوں سے مایوس ہوتے ہوئے مغل بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنی خود مختاری بحال کرنے میں معاونت کی درخواست کی۔ اُن کے انگریزوں کو لکھے گئے خطوط کو پڑھنا ایک تکلیف دہ امر ہے۔ وہ مرہٹوں سے خوفزدہ تھے، اور اکیلے اُن کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ اُنھوں نے کلائیو کو مدد کی درخواست کی تھی۔ جب یہ درخواست رد کر دی گئی تو اُنھوں نے کلکتہ میں پناہ لینا چاہی۔ یہ درخواست بھی منظور نہ کی گئی۔ الہ آباد میں کافی دیر تک مثبت جواب کا انتظار کرنے، اور یہ یقین کر لینے کہ بعد کہ اب جواب نہیں آئے گا، شاہ عالم ثانی انگریزوں کے خلاف میر قاسم کے ساتھ مل گئے۔ لیکن اُنھوں نے بکسر کی جنگ میں حصہ نہ لیا۔ اُنھوں نے بچی کھچی سلطنت کی حفاظت کی درخواست کرتے ہوئے اسے خود ہی انگریز کے حوالے کر دیا۔ انگریز کے نام بمبئی، مدراس اور شمالی سرکار کی جائیدادیں لکھ دیں، اور 1765ء کے الہ آباد معاہدے کے تحت بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی اُن کے نام کر دی۔

1787ء میں شاہ عالم نے گورنر جنرل، لارڈ کارن ویلز کے نام ذاتی خطوط لکھے، اور انھیں بڑی اپنائیت سے "میرا بیٹا" کہہ کر مخاطب کیا، اور اپنی زندگی عذاب بنانے والے امیروں اور وزیروں کو کچلنے کے لیے مدد طلب کی۔ یہ امیر اور وزیر اُن کے اپنے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ کارن ویلز نے یہ رحم بھری درخواست نظر انداز کر دی۔ پھر شاہ عالم نے افغانستان کا رخ کیا، اور بادشاہ زمان شاہ کو انڈیا پر حملہ کرنے، اور مغل اشرافیہ کو سبق سکھانے کی دعوت دی۔ اس خط کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار ایک ہندو، سندھیا مغل شہنشاہ کے بچاؤ کے لیے آگے بڑھا اور غلام قادر روحیلہ کا مقابلہ کیا۔

نئے گورنر جنرل، لارڈ ویلزلے نے مغل سلطنت کی کمزوری بھانپتے ہوئے اسے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنھوں نے 1803ء میں جنرل لیک کو شمالی علاقے فتح کرنے کا حکم دیا۔ سندھیا کو شکست ہوگئی، اور شاہ عالم برطانیہ کے قبضے میں آ گئے۔ آخری ایام میں مغل بادشاہ دہلی میں انگریز کی دی ہوئی پنشن پر گزارہ کرتا ہوا انیس نومبر 1806ء کو دنیا سے رخصت ہوا۔

جب اکبر ثانی نے تخت سنبھالا، تو اُسے احساس ہوگیا کہ وہ صرف نام کا بادشاہ ہے۔ حتیٰ کہ دارالحکومت کی انتظامیہ بھی برٹش ریذیڈنٹ کے کنٹرول میں تھی۔ اگلے گورنر جنرل، وارن ہیسٹنگ نے نام نہاد مغل بادشاہت کے بھرم کو بھی ختم کر ڈالا۔ اُن کی مہر پر یہ تحریر، کہ گورنر جنرل مغل شہنشاہ کا ملازم ہے، ختم ہوگئی۔ جب شہنشاہ نے گورنر جنرل کے ساتھ ملاقات کا کہا تو اس شرط پر اجازت ملی کہ اُن کے انگریز پر برتری کے تمام رسمی آداب ختم کرنے پڑیں گے۔ 1827ء میں شہنشاہ کی نئے گورنر جنرل، ایم ہرسٹ سے ملاقات کسی رسمی تقریب کے بغیر ہوئی۔ 1835ء میں انگریز نے شاہ عالم کے 1778ء میں جاری کردہ سکے منسوخ کر دیے، اور نئے جاری کردہ سکوں پر برطانوی بادشاہ کی تصویر اور چھاپ تھی۔ اس سے پہلے 1807ء میں اکبر ثانی پنشن میں اضافے کی درخواست کر چکے تھے۔

جب بہادر شاہ ظفر 1837ء میں تخت پر بیٹھے تو وہ جانتے تھے کہ اصل حکمران کون ہے۔ اُن کی حکومت اُس محل کی دیواروں تک ہی محدود تھی جس میں وہ رہتے تھے۔ وہ اپنے ولی عہد کا انتخاب کرنے میں بھی آزاد نہ تھے۔ جب 1856ء میں مرزا فخر الدین فوت ہوئے تو شہنشاہ جیون بخت کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اس کی منظوری کے لیے اُنھوں نے انگریز کے پاس درخواست بھیجی۔ اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ 1857ء کے واقعات کے دوران اُنھوں نے مبہم رویہ اپنایا۔ پہلے تو اُنھوں نے

باغیوں کی قیادت کرنے سے انکار کر دیا، اور انگریز سے مذاکرات کرنے کا کہا۔ لیکن بعد میں وہ بغاوت کا حصہ بننے کے لیے راضی ہو گئے۔

حکیم احسان اللہ خان اور محبّ علی خان کو شہنشاہ کا اعتماد حاصل تھا، لیکن وہ دونوں انگریز کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ جب باغیوں نے خوراک، رقم اور ہتھیاروں کے لیے درخواست کی تو ان دونوں افراد نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ مئی 1857ء کے آخری ہفتے تک میرٹھ سے احسان اللہ خان کی انگریز افسران کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت ہوتی رہی۔

1857ء کو واقعات کا آغاز بغاوت کی صورت ہوا تھا، لیکن بعد میں واقعات شورش، یا مزاحمت، یا غدر اس سے ملتی جلتی کیفیت میں ڈھل گئے۔ بغاوت کے واقعات کے مراکز دہلی اور یوپی کے کچھ مقامات تھے۔ دیگر علاقوں میں اکا دکا واقعات پیش آئے، لیکن ہندوستان کے زیادہ تر علاقے پرسکون، لاتعلق اور انگریز کے وفادار رہے۔ زیادہ تر مقامی شہزادوں، جیسا کہ نظام حیدر آباد، نے زبانی اور عملی طور پر انگریز کی حمایت کی۔ سکھ پوری استقامت کے ساتھ انگریز کے ساتھ کھڑے تھے۔ اسی طرح پنجابی، پٹھان اور سندھی مسلمانوں کی اکثریت بھی انگریز سرکار کے ساتھ تھی۔

ہندوستان کے اہم ترین مورخین اس بغاوت کو قومی سطح پر پیش آنے والا واقعہ نہیں سمجھتے۔ سرندرا ناتھ سن نے اپنی کتاب ''اٹھارہ سو ستاون'' (کلکتہ 1958) میں لکھا ہے: ''اودھ اور شاہ باد سے باہر ایسے کسی واقعے کا ثبوت نہیں ملتا جس کی بنا پر اس بغاوت کو قومی سطح کی جنگ کا درجہ دیا جا سکے''۔ آر سی مجومدار نے اپنی کتاب ''The Sepoy Mutiny'' (کلکتہ 1963) میں لکھا: ''اسے جنگ آزادی تو کجا، قومی سطح پر برپا ہونے والی شورش بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس کا مقصد آزادی حاصل کرنا تھا بھی نہیں''۔ پاکستانی مورخ، ایس معین الحق نے اپنی کتاب ''دی گریٹ ریولیشن''، کراچی 1968) ان واقعات کو نہ صرف انقلاب اور جنگِ آزادی قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اسے ''مشرقی عوام کی مغربی تسلط کو اکھاڑ پھینکنے کی پہلی اہم کوشش'' کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔ تاہم تاریخ انڈین مورخین کے تصور کی حمایت کرتی ہے۔

باغیوں کا کمانڈر، جنرل بخت خان بغاوت کے وقت انگریز فوج کے توپ خانے میں صوبیدار تھا۔ بنگال میں انگریز کا مکمل کنٹرول تھا۔ بیرک پور اور برہم پور میں سپاہیوں کی بغاوت کو

فروری 1857ء میں کسی مشکل کے بغیر دبا دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ بنگال کی محمڈن ایسوسی ایشن، جو تعلیم یافتہ طبقہ تھا، نے انگریز کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا۔ سرسید احمد خان نے باغیوں کی حمایت کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا، بلکہ زبانی اور عملی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی، جس کے وہ ملازم تھے، کی حمایت کی۔ اردو کے عظیم شاعر، مرزا غالب نے اپنا انگریز کی طرف جھکاؤ چھپانے کی کوشش نہیں بلکہ اُنھوں نے دشمنی رکھنے اور فساد برپا کرنے والوں پر تنقید کی۔ اور اس کی وجہ ظاہر تھی۔ وہ 1806ء سے انگریز سے پنشن لے رہے تھے۔ بغاوت کے دوران اُنھوں نے مغل دربار سے ملنے والے خطابات ترک کر دیے۔ مرزا نے انگریز حکمرانوں کی تعریف میں کئی ایک قصیدے بھی لکھے۔ ان میں سے ایک میں مرزا پنجاب کی فتح پر لارڈ ہارڈنگ کی نہ صرف تعریف کرتے ہیں، بلکہ افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ اس جنگ میں انگریز فوج کا حصہ نہ بن سکے۔ مرزا نے ایلن برو، لارڈ کینگ اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان کا کنٹرول اپنے ہاتھ لینے پر انگریز حکومت کی تعریف میں بھی قصائد لکھے۔ ایک طویل قصیدہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھتے ہوئے درخواست کی اُنہیں لندن میں درباری شاعر نامزد کیا جائے (یہ درخواست مسترد کر دی گئی)۔ اُنھوں نے بغاوت کو ''رستخیزِ بیجا'' قرار دیتے ہوئے انگریز کی حکم عدولی کرنے والوں کو باغی، یا غدار عناصر کہا۔ اُن کا خیال تھا کہ انگریز مقامی افراد کے کتوں اور بلیوں کو بھی ہلاک کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ آئینِ اکبری کے نئے ایڈیشن (جسے سید احمد خان نے شائع کیا) کے پیش لفظ وہ انگریز ثقافت اور اداروں کے معترف ہیں۔

اردو شاعری کے کچھ اور بڑے نام بھی انگریز کے معترف تھے۔ اپنے آخری ایام میں میر تقی میر نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں درخواست دی، مگر وہ منتخب نہ ہوئے۔ وہ اس بات پر بھی رضامند ہو گئے تھے کہ اُن کے دیوان کا پہلا ایڈیشن کلج کی زیر سرپرستی شائع ہوگا۔ مومن خان مومن انگریز سرکار سے ماہانہ پچیس روپے وظیفہ وصول کرتے تھے۔

اس طرح ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقات اور عام افراد انگریز دور کے حامی تھے۔ جنگ آزادی لڑنے کے لیے عوامی اتحاد، منصوبہ بندی، پیش بینی، تنظیم سازی، عوامی حمایت اور مشترکہ منزل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام عوامل 1857 کے ہندوستان میں نہیں تھے۔ بغاوت کا نام نہاد قائد مغل بادشاہ تھا۔ فرض کریں بغاوت کامیاب ہو جاتی اور باغی دستے انگریز کا تختہ الٹ دیتے تو وہ مغل بادشاہ

پھر اپنے تخت پر بیٹھ جاتا۔ لیکن یہاں معاملہ یہ تھا کہ وہ بادشاہ تو خود انگریزوں کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا، اور پھر وہ اُن کا پنشن خوار تھا۔ اپنے دو پیش روؤں کی طرح اُس کے انگریز سرکار سے تعلقات غلام اور آقا جیسے تھے۔ اگر کوئی غلام اپنے آقا کی حکم عدولی کرے، یا اُس کے سامنے کھڑا ہو جائے تو اسے جنگِ آزادی نہیں کہتے۔ فرض کریں مغل بادشاہ جیت جاتا تو کیا اٹھارویں صدی کے وسط سے مغل سلطنت کے لیے چیلنج بننے والے مرہٹے، جٹ، روہیلے اور سکھ اُسے بادشاہ مان لیتے؟ کیا نظام حیدر آباد اور اودھ کا فرمانروا، جنہوں اپنی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بنائی ہوئی تھیں، مغل بادشاہ کی اطاعت میں سر جھکا دیتے؟

یہاں درسی کتابیں لکھنے والوں کے سامنے ایک گھمبیر الجھن ہے۔ اگر اسے مسلمانوں کی قابلِ نفرت انگریز استعمار کے خلاف جنگِ آزادی مان لیں تو پھر اس جنگ کی مخالفت کرنے، اور انگریز کے ساتھ کھڑے ہونے والے سر سید احمد خان کو طلبہ کے سامنے ''عظیم ہیرو'' اور ''پاکستان کے عظیم مفکر'' کے طور پر کیسے پیش کیا جائے گا؟ ''پہلی جنگِ آزادی'' اور ''آخری جنگِ آزادی'' جیسے دہرائے جانے والے الفاظ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

انڈین نیشنل کانگرس

1885ء میں ہندوؤں نے اپنی سیاسی جماعت، انڈین نیشنل کانگرس، کی بنیاد رکھی (پنجاب، جماعت ششم)۔ انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کا مقصد ہندوؤں کو سیاسی طور پر منظم کرنا تھا (پنجاب، جماعت ہشتم)۔ ہندوؤں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد 1885ء میں رکھی (سندھ، انگلش، جماعت ششم)۔ انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد لارڈ ہیوم نے رکھی (وفاقی حکومت، انگلش، انٹر میڈیٹ)۔ انڈین نیشنل کانگرس کو آل انڈیا نیشنل کانگرس لکھا گیا ہے (این ڈبلیو ایف پی، جماعت نہم و دہم، پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ، پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

کانگرس کو غلط نام دینے کے علاوہ اس کے متعلق جملے تین بنیادی غلطیاں کرتے ہیں۔ کانگرس کو منظم کرنے والے ہندو نہیں، ہندوستانی تھے۔ اس کے افتتاحی اجلاس کی رپورٹ میں کہیں نہیں کہا گیا کہ یہ صرف ہندوؤں کو ایک سیاسی پلیٹ فورم پر لائے گی؛ نہ ہی اس کی بنیاد لارڈ ہیوم نے رکھی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کانگرس میں زیادہ تر رہنما ہندو تھے۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، اور پھر یہ جماعت تلک اور گاندھی جی کی پالیسیوں پر کاربند تھی، اور زیادہ تر مسلمان انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ بااین ہمہ، کانگرس کو ایک ہندو جماعت قرار دینا ایک تنقیدی حملہ تو ہوسکتا ہے، تاریخی سچائی نہیں۔ اس کی صفوں میں مسلمان شامل رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ بہت ہی قابل احترام مسلمان شخصیات برس ہا برس تک اس کے اہم عہدوں پر کام کرتی رہی ہیں۔ رحمت اللہ ایم سیانی، بدرالدین طیب جی، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، مظہرالحق، سرعلی امام، ڈاکٹر ایم اے انصاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، اور سب سے بڑھ کر، قائدِ اعظم محمد علی جناح۔ کیا یہ سب اہم شخصیات ہندوؤں کی ایجنٹ تھیں؟ سستے سیاسی نعروں کی درسی کتب میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ نعرے تاریخ کو جھٹلاتے ہوئے نوجوان ذہنوں کو زہریلا بنانے کے سوا اور کچھ مقصد پورا نہیں کرتے۔

شملہ وفد

اس کی قیادت نواب محسن الملک نے کی (پنجاب، جماعت ہشتم)۔

درحقیقت اس کی قیادت آغا خان نے کی تھی جنہیں عدن سے انڈیا اس مقصد کے لیے خاص طور پر بلایا گیا تھا، حالانکہ وہ ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے یورپ جارہے تھے۔

زیادہ تر کتابیں اس بیان تک محدود رہتی ہیں کہ وفد نے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا تھا، لیکن وہ نشستوں میں اضافے کی اہم درخواست کا ذکر نہیں کرتیں۔ وفد کے مطالبات کی درست فہم کے لیے اس کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔

1892ء میں سنٹرل کونسل کے انتخابات کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کے نامزد کردہ امیدواروں میں مسلمانوں کو اُن کی عددی طاقت کے اعتبار سے صرف نصف تعداد میں ممبر ملے تھے۔ یوپی کے صوبوں کی کونسل کے لیے ایک بھی مسلمان کو نامزد نہ کیا گیا۔ چنانچہ جب پتہ چلا کہ انگریز سرکار انڈیا میں اصلاحات متعارف کرانے کا سوچ رہی ہے، اور اس کے لیے نمائندہ عناصر کی ایک بڑی تعداد متعارف کرائی جائے گی، تو مسلمان ایک وفد لے کر وائسرائے، لارڈ منٹو کے پاس صوبائی اور مقامی کونسلز میں جداگانہ نمائندگی کے اپنے موقف پر قائل کرنے گئے۔ یہ دعوی تین بنیادوں پر کیا گیا تھا:

(1) ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود تناؤ کی وجہ سے اپنی کمیونٹی کی پورے خلوص سے نمائندگی کرنے والا کوئی مسلمان الیکشن میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ دو کے علاوہ تمام صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں؛ (2) اگر دونوں قوموں کو انتخابی معرکے میں الگ نہ رکھا گیا تو لڑے جانے والے ہر الیکشن کے موقع پر گروہی فسادات اور خونریزی ہو گی۔ اس کی تلخ یادیں ملک کے سیاسی بندوبست کو کمزور کر دیں گی؛ (3) میونسپل کمیٹیوں اور ضلعی بورڈز سمیت ہر جگہ متعارف کرائے گئے جداگانہ انتخابی نظام کی وجہ سے امن قائم رہا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ، وفد نے مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے دی گئی نشستوں کی تعداد بڑھانے کی بھی درخواست کی۔ اس مطالبے کے ساتھ مزید تین دلائل دیے گئے تھے: (1) مسلمان انڈیا میں بہت کم جائیداد کے مالک ہیں؛ (2) اُن کی انڈین آرمی میں بہت بڑی تعداد ہے؛ (3) وہ جغرافیائی طور پر انڈیا کے محافظ رہے ہیں۔
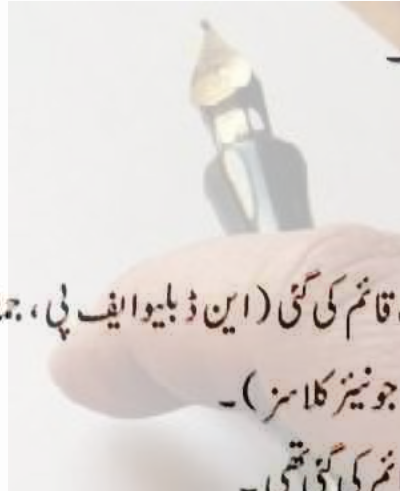
آل انڈیا مسلم لیگ

یہ 1911ء کے بعد کسی وقت قائم کی گئی (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہشتم)۔ یہ 1905ء میں قائم کی گئی (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جونیئر کلاسز)۔

یہ ڈھاکہ میں 1906ء میں قائم کی گئی تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کم از کم ایک کتاب (این ڈبلیو ایف پی، انٹرمیڈیٹ) میں سچ کو چھپاتے ہوئے اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا گیا ہے۔ درسی کتب کے مطابق لیگ کے قیام کا مقصد انڈیا کے مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فورم پر لانا تھا۔ یہ دیگر بہت سے مقاصد میں سے ایک تھا۔

(a) ہندوستان کے مسلمانوں کے دل میں برطانوی راج سے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا، اور حکومت کے کسی بھی نیت سے اٹھائے گئے اقدامات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی کو دور کرنا۔ (b) ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا، اور اپنی ضروریات اور خواہشات کو مناسب طریقے سے حکومت کے سامنے رکھنا۔ (c) انڈیا کے مسلمانوں کے دل میں دیگر

قومیتوں کے خلاف نفرت پیدا ہونے سے روکنا۔

لندن مسلم لیگ اور علامہ اقبال

علامہ اقبال نے سید امیر علی کے ساتھ مل کر لندن مسلم لیگ قائم کی (پنجاب، جماعت ہفتم)

آل انڈیا مسلم لیگ، اور لندن مسلم لیگ کے کاغذات میں اس دعوے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ علامہ اقبال لندن مسلم لیگ کے ایک رکن تھے، اور اس کی کمیٹی میں بھی شامل تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہاں علامہ کے پاس کوئی عہدہ بھی نہیں تھا۔ امیر علی اس کے صدر تھے؛ سی اے لطیف نائب صدر، ابن احمد اعزازی سیکرٹری؛ عبدالعلی اونک اعزازی خزانچی، ظہور احمد جائنٹ سیکرٹری، اور مسعود الحسن اسسٹنٹ سیکرٹری اور نائب خزانچی تھے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ چھ مئی 1908ء کو جب لندن مسلم لیگ قائم کی گئی تو اقبال محض ایک طالب علم تھے، اور اس کے چند ماہ بعد وہ انگلینڈ سے واپس انڈیا آ گئے۔ درسی کتاب کے الفاظ سے ایسا تاثر ملتا ہے جیسے علامہ اقبال اس کے حقیقی بانی تھے، جبکہ امیر علی تو محض معاون تھے۔ ایسے احمقانہ اور بچگانہ بیانات کے ذریعے علامہ اقبال کو اُن کی حیثیت سے بڑھ کر پیش کرتے ہوئے ہم اُن کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ اقبال ایک عظیم انسان تھے، انہیں ایسی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم انہیں بلاضرورت عہدوں اور مرتبوں سے زیر بار نہ کریں تو اُن پر مہربانی ہوگی، اور تاریخ کا بھی بھلا ہو جائے گا

لکھنو پیکٹ

اس پر 1910ء میں دستخط ہوئے (پرائیویٹ، کراچی، بی اے)۔ یہ مسلمانوں کی ایک جیت تھی (این ڈبلیو ایف پی، کلاس نہم، دہم)۔ اس نے اُن کی اہمیت دو چند کر دی (این ڈبلیو ایف پی، انٹرمیڈیٹ)۔ یہ مسلم لیگ کی ایک فتح تھی (وفاقی حکومت، بی اے)۔ اس کے تحت کانگرس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اس کی شرائط کے تحت ہندوؤں نے مسلمانوں کو ایک الگ قوم مان لیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے، تین مختلف درسی کتب)

لکھنو پیکٹ دلچسپ تاریخ رکھتا ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے پیش کی گئی شرائط پر سب سے پہلے لیگ

کونسل نے لکھنو میں اکیس اگست 1916 ء کو ہونے والی اپنی میٹنگ میں غور کیا۔ اس میٹنگ میں صرف نو افراد شریک تھے، اور سب کا تعلق لکھنو سے تھا۔ گیارہ اکتوبر کو ہونے والی ایک اور میٹنگ میں شرائط کو حتمی شکل دی گئی۔ اس میٹنگ میں آٹھ افراد شریک تھے، جن میں سے سات کا تعلق لکھنو اور ایک کا الہ آباد سے تھا۔ کانگرس اور لیگ کی مشترکہ اصلاحاتی کمیٹی کا اجلاس کلکتہ میں 18-17 نومبر کو ہوا۔ اس میں شرکا کی کل تعداد 71 تھی۔ اس میں لیگ کے بیس ارکان تھے (بارہ بنگال، چار یوپی، بہار، این ڈبلیو ایف پی، مدراس سے ایک ایک، جبکہ ایک نامعلوم شہر سے)۔ بنگال اور یوپی کے سوا تمام صوبوں کے لیے نمائندگی کا کوٹہ طے کیا گیا (پنجاب کی قسمت کا فیصلہ کسی پنجابی نمائندگی کے بغیر ہی کر لیا گیا)۔ 28-25 دسمبر کو ہونے والی ایک میٹنگ میں زیر التوا کیسز نمٹائے گئے۔ اس میں بنگالی مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھے، جبکہ غالب اکثریت یوپی کے مسلمانوں کی تھی۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے لکھنو میں بیک وقت ہونے والے اجلاس میں معاہدے کی توثیق کی گئی۔ تاہم ان میں نمائندگی کے اعداد و شمار ناقابل فہم تھے۔ کانگرس کے اجلاس میں شرکت کرنے والے 433 مسلمانوں میں سے 400 کا تعلق لکھنو سے تھا، اور وہ سب کرائے کے نمائندے تھے۔ لیگ کے اجلاس میں جناح صاحب (جو صدارت کر رہے تھے) کے علاوہ بہت کم لوگ بمبئی سے آئے۔ مدارس کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ بنگال کے چند ایک ترجمان تھے، اور یہی حال پنجاب کا تھا۔ اس اجلاس میں یوپی کا طوطی بول رہا تھا۔

اس پیکٹ کے نتیجے میں مسلمانوں کو صوبائی کونسلوں میں مندرجہ ذیل نمائندگی ملی۔

صوبہ	آبادی میں مسلمانوں کا تناسب	کونسلو میں مسلم نشستوں کا تناسب
بنگال	52.6	40.0
بہار اور اوڑیسہ	10.5	25.0
بمبئی	20.4	33.3
سی پی	4.3	15.0
مدراس	6.5	15.0
پنجاب	54.8	50.0
یوپی	14.0	30.0

یہ اعداد و شمار تمام کہانی سنا رہے ہیں۔ کسی بھی سمجھ دار سیاست دان کو جاننا چاہیے تھا کہ یہ معاہدہ مسلم اکثریت رکھنے والے دو سب سے بڑے صوبوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔ اُس وقت کے اخبارات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب اور بنگال نے دیگر صوبوں کی روا رکھی گئی اُس ناانصافی پر سخت ردعمل دیا تھا۔ مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں، جیسا کہ بہار اور سی پی کو دی گئی زیادہ نمائندگی کا انڈیا کے دیگر مسلمانوں کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ اس کا ان صوبوں کو بھی اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہونا تھا کہ انہیں کچھ کھوکھلا اعتماد مل جاتا۔ دوسری طرف پنجاب اور بنگال کو ہونے والے احساس محرومی نے ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ بنگال میں غیر مستحکم وزارتیں، سیاسی غیر یقینی پن اور ہندو مسلم مہا سبھا کولیشن کا عجیب سا منظر نامہ تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے قیام نے پنجاب کو ایسی خطرناک صورت حال سے بچالیا۔

طویل عرصہ تک جاری ان مذاکرات کے دوران کسی بھی وقت کانگرس یا ہندوؤں نے مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کا کوئی ہلکا سا، یا مبہم اشارہ تک نہ دیا۔ مسلمانوں یا مسلم لیگ کی فتح کی بجائے یہ پیکٹ 1947ء تک انڈیا کے مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا رہا۔

پنجاب یونینسٹ پارٹی

پنجاب نے قوم پرستی کی جدوجہد میں ایک اہم فریق کا کردار ادا کیا۔ شروع میں کچھ مسلمان رہنما اپنے ذاتی مفاد، اور انگریز سرکار سے روابط کی وجہ سے مسلم لیگ سے دور رہے۔ اُنھوں نے یونینسٹ پارٹی میں شرکت اختیار کر لی اور قیام پاکستان کی مخالفت کی (پنجاب، جماعت نہم و دہم)۔ دیگر درسی کتب میں یونینسٹ پارٹی کا ذکر تک نہیں ہے۔

پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کا قیام اپریل 1927ء کو عمل میں آیا۔ اس کے بانی اراکین میں سر محمد اقبال، ملک فیروز خان نون، سر رحیم بخش، چوہدری ظفر اللہ خان، سردار سکندر حیات خان، شیخ عبدالقادر اور نواب شاہنواز خان آف ممدوٹ شامل تھے۔ اس کے قیام کی تحریک سر فضل حسین کی طرف سے آئی۔ یہ پارٹی لکھنو پیکٹ کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ اس کے نتیجے میں اگرچہ کانگرس کو صرف ایک نشست زیادہ مل تھی، لیکن کوئی مسلمان پارٹی بھی حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ یونینسٹ پارٹی نے بیس سال تک صوبے میں نہایت مہارت اور عمدگی سے حکومت چلائی اور استحکام

...برقرار رکھا۔ 1937ء میں جناح صاحب مسلسل دو سال کی محنت کے بعد کہیں جا کر سکندر حیات کو مسلم ...گ کے ساتھ معاہدے پر راضی کر سکے، اور وہ بھی سکندر حیات کی اپنی شرائط پر۔ یہ معاہدہ بعد میں اُس ...ت ٹوٹ گیا جب خضر حیات ٹوانہ (سکندر کے جانشین) سے لیگ نے معاہدے کی شرائط کے برعکس اپنا ...ستعفیٰ دینے کا کہا۔ پارٹی نے خضر حیات کے مسلم لیگ سے اخراج سے پہلے قیام پاکستان کی مخالفت نہیں ...کی تھی۔ اگر یہ یونینسٹ مسلمان اتنے ہی خود غرض اور انگریز کے پٹھو تھے تو لیگ پنجاب میں حمایت حاصل ...کرنے کے لیے ان سے اتنی توہین آمیز شرائط پر معاہدے کیوں کر رہی تھی؟

یہ یونینسٹ لیڈر، سر فضل حسین تھے جنہوں نے عملی طور پر وائسرائے کو گول میز کانفرنس میں ...شریک مسلم وفود کے نام لکھوائے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مسلم انڈیا کے یہ ترجمان آغا خان، سر محمد شفیع، ...علامہ اقبال اور محمد علی جناح تھے۔ اُس وقت کسی کو بھی اس وفد کی دانائی، سیاسی مہارت اور نمائندگی کی ...صلاحیتوں پر شبہ نہ تھا۔ پاکستان یونینسٹ مسلمانوں کا اُس سے کہیں زیادہ احسان مند ہے جتنا درسی کتب ...لکھنے والوں اور مورخین کو علم ہے۔

سائمن کمیشن کا بائیکاٹ

انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ، دونوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا (پنجاب، ...جماعت ہشتم، پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)

اس کا اصل نام انڈین آئین کمیشن تھا۔ اسے برطانوی حکومت نے چھبیس نومبر 1927ء کو ...مقرر کیا۔ اس نے انڈیا کا دو مرتبہ دورہ کیا: پہلی مرتبہ 1928ء میں تین فروری سے اکتیس مارچ تک، ...اور دوسری مرتبہ 1929ء میں گیارہ اکتوبر سے تیرہ اپریل تک۔

آل انڈیا مسلم لیگ اس ایشو پر دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک دھڑے، جس کی قیادت ...جناح صاحب کر رہے تھے اور جو عوامی زبان میں جناح لیگ کہلاتا تھا، نے کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ ...کیا۔ دوسرے دھڑے، جس کی قیادت سر محمد شفیع کر رہے تھے اور جو شفیع لیگ کہلاتا تھا، نے تعاون کا ...فیصلہ کیا۔ اس کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا انیسواں اجلاس دھڑے بندی کا شکار ہو گیا۔ جناح ...لیگ نے اپنا اجلاس تیس دسمبر 1927ء سے لے کر یکم جنوری 1928ء تک کلکتہ میں مہاراجہ آف محمود

آباد کی صدارت میں منعقد کیا۔ شفیع لیگ نے یکم جنوری 1928ء کو اپنا اجلاس لاہور میں بلایا۔ سر شفیع نے خود اس کی صدارت کی۔ اُس دور کے اخبارات کی رپورٹس، اور وفود کی فہرستوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا دھڑا مسلمانوں کے جذبات کی بہتر نمائندگی کر رہا تھا۔ جناح صاحب کو ایک طرف کرتے ہوئے، ایک بڑی تعداد میں مسلم سیاسی، سماجی اور مذہبی گروہ اور جماعتیں کمیشن سے ملیں اور اپنی رپورٹس پیش کیں۔ اُن کے نام، نمائندوں کے انٹرویوز اور پیش کردہ رپورٹس کی فہرست وائٹ پیپر میں موجود ہیں۔

چنانچہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا۔ یہ جھوٹا دعویٰ لیگ کا انگریز مخالف تصور ابھارنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے، جو کہ وہ نہیں تھی۔

نہرو رپورٹ

نہرو رپورٹ 1926ء میں پیش کی گئی (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ دیگر کئی درسی کتب مسلمانوں میں علیحدگی کے جذبات ابھارنے والی اس رپورٹ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔

سب سے پہلی بات، سائمن کمیشن کو چیلنج کرنے والی رپورٹ سائمن کمیشن سے پہلے کس طرح شائع ہو سکتی ہے؟

سائمن کمیشن چھبیس نومبر 1927ء کو مقرر کیا گیا تھا۔ کمیشن کی تقرری کے موقع پر ہاؤس آف لارڈز میں تقریر کرتے ہوئے سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان، لارڈ برکن ہیڈ نے وضاحت کی کہ کیوں کسی انڈین کو کمیشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ انڈین نمائندگی والے پینل سے کسی متفقہ رپورٹ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کانگرس کے رہنماؤں نے اس کا برا منایا۔ اُنھوں نے انڈیا آفس کو حیران کرنے کے لیے فوراً ہی ایک آئینی مسودہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

دسمبر 1927ء میں مدراس میں ہونے والے اپنے سالانہ اجلاس میں کانگرس نے دیگر تمام جماعتوں سے کہا کہ آئین کی تیاری میں اس کی مدد کریں۔ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے فروری۔ مارچ 1928ء میں دہلی میں کل جماعتی کانفرنس ہوئی۔ اس میں جناح لیگ موجود تھی جبکہ شفیع لیگ غیر حاضر

تھی۔ دو کمیٹیوں کو نامزد کر کے یہ ذمہ داری سونپی گئی، لیکن جب انیس مئی 1928ء کو بمبئی میں اُن کا اجلاس ہوا تو وہ کوئی رپورٹ بھی پیش نہ کرسکیں۔ اس پر کانفرنس نے ایک کمیٹی قائم کی، جس کی قیادت پنڈت موتی لال نہرو کر رہے تھے۔ اس مناسبت سے یہ نہرو کمیٹی کہلائی۔ اس میں دو مسلمان نمائندے، علی امام اور شعیب قریشی، بھی شامل تھے۔ لیکن یہ دونوں افراد اپنی کمیونٹی کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت انہیں کافی عرصے سے مسترد کر چکی تھی۔ کچھ دیر کے بعد سکھ لیگ نے کمیٹی میں شامل ممبران سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ انڈین کرسچن کانفرنس نے رپورٹ میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے اختیار کردہ اصولوں سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے خود کو اس سے الگ کر لیا۔

نہرو کمیٹی نے اگست 1928ء کو اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس نے ایک مکمل ذمہ دار نظام حکومت کی سفارش کی جس میں ہندوؤں کو بالادستی حاصل ہوتی۔ مسلم انتخابی حلقوں کا خاتمہ تجویز کیا گیا تھا۔ اس پر مسلمان حیرت زدہ رہ گئے، اور کم و بیش تمام مسلمان جماعتوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

رپورٹ پر غور کرنے کے لیے اٹھائیس سے اکتیس اگست تک کل جماعتی کانفرنس لکھنو میں ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دسمبر میں کلکتہ میں ایک کل جماعتی کنونشن کا انعقاد کرتے ہوئے عوام کی رائے لی جائے گی۔ اٹھائیس اگست کو ہونے والے کنونشن نے رپورٹ کی ہر شق مسترد کر دی، اور جناح صاحب نے ایک زوردار تقریر کرتے ہوئے اپنا مطالبہ سامنے رکھا۔ اب تک محمد علی جناح کو سیاسی تجربات نے نکھار دیا تھا، اور وہ ایک منجھے ہوئے سیاست دان بن چکے تھے۔ اُنھوں نے فوراً ہی شفیع لیگ کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا جس نے اب تک تمام کمیٹیوں اور کانفرنسوں سے خود کو الگ رکھا تھا۔

نہرو رپورٹ کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو متحد کر دیا، ورنہ اُن معروضی حالات میں کوئی چیز ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ تمام سیاسی اختلافات اور رقابت بازی کو بھلا دیا گیا۔ اس لمحے کے بعد "انڈین قوم پرستی" نامی کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ نہرو رپورٹ سے ہونے والی مایوسی اور حقیقت پسندی کا ایک نتیجہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے قیام کی صورت نکلا۔ اس میں جناح کے سوا ہر اہم اور بااثر مسلمان سیاست دان نے شرکت کرتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق اور مطالبات کے لیے انگریز سرکار سے بات کرنے کے لیے قرارداد منظور کی۔

مولانا محمد علی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس

مولانا محمد علی نے یکم جنوری 1929ء کو دہلی میں کل جماعتی مسلم کانفرنس کا اجلاس بلایا (وفاقی حکومت، بی اے)۔

یہ تاریخ درست نہیں۔ اس کانفرنس کا انعقاد اکتیس دسمبر 1928ء اور یکم جنوری 1929ء کو عمل میں آیا تھا۔ کانفرنس کی باضابطہ رپورٹ پر دستخط کرنے والوں میں مولانا محمد علی کا نام شامل نہیں اور وہ کانفرنس کے عہدیدار بھی نہیں تھے۔ جن افراد نے کانفرنس بلانے کا تصور پیش کیا اور دس ستمبر 1928ء کو اس کا منشور پیش کیا، اُن میں اس کے صدر آغا خان، نواب محمد اسماعیل خان اور فضل ابراہیم رحمت اللہ اس کے سیکرٹریز، خواجہ غلام السیطین جنرل سیکرٹری، اور محمد شفیع داؤدی ورکنگ سیکرٹری شامل تھے۔ محمد علی ورکنگ کمیٹی کے انیس ممبران میں سے ایک تھے۔ اُنھوں نے کبھی اس کے سالانہ اجلاس کی صدارت بھی نہیں کی تھی۔

میرے علم میں نہیں اگر یکم جنوری 1929ء کو مولانا محمد علی نے دہلی میں کل جماعتی مسلم کانفرنس بلائی ہو۔

گول میز کانفرنس

گول میز کانفرنسز 1913ء میں ہوئیں (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ کچھ درسی کتب کا مواد مبہم ہے، کچھ میں تاریخیں اور سال غلط ہیں۔

گول میز کانفرنسز کے لندن میں تین اجلاس ہوئے۔ پہلا بارہ نومبر 1930ء سے لے کر انیس جنوری 1931ء تک؛ دوسرا سات ستمبر سے لے کر یکم دسمبر 1931ء تک؛ اور تیسرا سترہ نومبر سے چوبیس دسمبر 1932ء تک۔

اقبال کا خطبۂ الہ آباد

اقبال کا الہ آباد کا خطبہ: 1930۔ یہ خطبہ انتیس دسمبر 1931ء کو دیا گیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

اس کا درست سال 1930ء ہے۔

ہر درسی کتاب، چاہے وفاقی ہو یا صوبائی یا پرائیویٹ، اردو یا انگلش میڈیم، دوسری کلاس کے بعد طلبہ کو بتاتی ہے کہ اقبال نے 1930ء کے خطبۂ الہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا۔ سب سے پہلے تو جماعت اوّل کو مبارک باد کہ کم از کم اُن کی خطبۂ الہ آباد سے جان بخشی ہو جاتی ہے۔ اب رہی دوم سے لے کر گریجویشن تک باقی تمام جماعتوں کی بات تو اس ضمن میں انھیں جس ابہام میں مبتلا کیا گیا ہے، پہلے اس کی بات کر لیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ تعلیم کے نام برین واشنگ کرنے والے دراصل کیا چاہتے ہیں:

اقبال وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا (پرائیویٹ، کراچی، جماعت دوم، این ڈبلیو ایف پی، جماعت پنجم، سندھ، جماعت پنجم)۔ وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا (پرائیویٹ، کراچی، انگلش، جماعت اوّل، دوم)۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، کلاس سوئم)۔ وہ اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ جنوبی ایشیا کے مسلم اکثریتی علاقوں کو ایک آزاد مسلم ریاست قرار دیا جائے (سندھ، انگلش، جماعت پنجم)۔ اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ وہ تمام علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، کو ملا کر ایک آزاد اور خود مختار ریاست بنا دی جائے (این ڈبلیو ایف پی، جماعت پنجم، سندھ، جماعت پنجم)۔ اُنھوں نے ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ کیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہفتم)۔ اُنھوں نے ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہشتم)۔ اُنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت نہم و دہم)۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک ریاست کا مطالبہ کیا (پنجاب، جماعت نہم و دہم)۔ اُنھوں نے ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا (سندھ، جماعت نہم و دہم)۔ وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے پاکستان کے تصور کو الفاظ کا روپ دیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جماعت ہفتم)۔ اُنھوں نے انڈیا کے شمال مغرب اور شمال مشرق، جہاں وہ اکثریت میں تھے، ایک الگ مسلم ریاست کا خواب دیکھا (سندھ، انگلش، کلاس ہشتم)۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست چاہتے تھے (پنجاب، انگلش، جماعت نہم و دہم)۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور پیش کیا (این ڈبلیو ایف پی، انٹرمیڈیٹ)۔ اُنھوں نے پوری استقامت سے ایک اسلامی ریاست کی تخلیق کی وکالت کی (وفاقی حکومت، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

اُنھوں نے برِصغیر کی تقسیم کی سکیم پوری تفصیل سے بیان کی، اور اسی سکیم کو آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں قرارداد کی صورت منظور کیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ وہ پہلے مفکر تھے جنھوں نے مثبت اور نظریاتی بنیادوں پر ایک الگ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا (وفاقی حکومت، بی اے)۔ اس صدی کے آغاز میں، اُنھوں نے مسلمانوں کو آزادی اور اسلامی شناخت کا درس دیا، اور پھر سیاسی حل کے طور پر ایک الگ مملکت کے تخلیق کی تجویز پیش کی (وفاقی حکومت، بی اے)۔ اُنھوں نے مسلمانانِ برِصغیر کے لیے ایک الگ اور آزاد سرزمین کا تصور پیش کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اُنھوں نے پہلی مرتبہ کسی سیاسی پلیٹ فورم سے ایک الگ اور آزاد سرزمین کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اُنھوں نے انڈیا کے اندر یا باہر ایک آزاد اسلامی ریاست کے تخلیق کی سکیم پیش کی (پرائیویٹ، پشاور، بی اے)۔ اُنھوں نے ایک الگ مملکت کا مطالبہ پیش کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اُنھوں نے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اُنھوں نے انڈیا کی تقسیم کی سکیم پیش کی (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اُنھوں نے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق کی تجویز پیش کی (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بی اے)۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا خواب دیکھا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، بی اے)۔

سب سے پہلے تو کچھ احمقانہ نکات سے نمٹ لیا جائے۔ اقبال انگلش میں تقریر کر رہے تھے۔ اُن کے کسی لفظ کا اردو ترجمہ ''مملکت'' دو حوالوں سے غلط ہے۔ پہلے یہ کہ اُنھوں نے یہ لفظ بولا ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس لفظ، مملکت، کا ماخذ اسے ''ملوکیت'' کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، جو کہ بادشاہت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محبِ وطن اور اسلام پسند، لیکن محدود علم رکھنے والے اردو لکھاریوں کو ''مملکتِ خداداِ پاکستان'' کی اصطلاح بے حد مرغوب ہے۔ لیکن اقبال یہاں جدید سیاسی ریاست کی بات کر رہے تھے۔ وہ بادشاہت یا ملوکیت کا احیاء نہیں چاہتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ درسی کتابیں لکھنے والوں نے اسم صفت، ''مسلم'' اور ''اسلامی'' اس طرح استعمال کیے ہیں گویا اُن کے نزدیک یہ ایک ہی چیز ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ ایک مسلم ریاست وہ ہے جس کی آبادی مسلمان ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں اقلیت نہ ہو، یا کوئی ایک، یا ایک سے زیادہ ہوں، لیکن اس کی واضح اکثریت کا مذہب اسلام ہو۔ ایک اسلامی ریاست مختلف چیز ہے، لیکن بدقسمتی سے اس کی تشریح

نہیں کی جا سکتی۔ ہر فرقے، مسلک اور حتیٰ کہ ہر عالم کا اسلامی ریاست کا اپنا تصور ہے۔ حتیٰ کہ پاکستانی فوج کے جنرل بھی اس پر اپنے جاندار تصورات رکھتے ہیں۔

تیسری یہ کہ اقبال نے پنجاب، این ڈبلیو ایف پی، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ہندوستان کے اندر ہی ایک صوبہ بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ اُنھوں نے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں کہا تھا۔ بارہ اکتوبر 1931ء کو ''دی ٹائمز'' میں شائع ہونے والا اُن کا ایک خط اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ راغب احسان کو لکھے گئے اُن کے ایک خط سے اس تصور کو مزید تقویت ملتی ہے (اس کی مکمل تفصیل ''A History of the Idea of Pakistan''، وینگارڈ، لاہور، 1987، والیم ون، باب: چار، پانچ اور چھے، صفحات 327-184)۔

چوتھی بات یہ کہ اقبال نے بنگال کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اُن کی تجویز شمال مغربی ہندوستان تک محدود تھی۔ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں کہ وہ 1930ء میں مسلم صوبوں یا مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک مسلم ریاست کا قیام چاہتے تھے۔

پانچویں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ مذہبی بنیادوں پر انڈیا کی تقسیم چاہتے تھے، تو یہاں بھی تین غلط دعوے سامنے آتے ہیں: (1) یہ مطالبہ کرنے والے وہ پہلے شخص تھے؛ (2) کسی سیاسی پلیٹ فورم پر یہ مطالبہ کرنے والے وہ پہلے شخص تھے؛ (3) ایسا کرنے والے وہ پہلے مسلمان تھے۔

جوابات: (1) چوبیس جون 1858ء سے لے کر اکتیس دسمبر 1929ء کے درمیان ایسی 64 سکیمیں (واضح یا مبہم) سامنے آئی تھیں۔ (اس کی تفصیل میری کتاب ''A History of the Idea of Pakistan''، والیم تین، صفحات 680-671 میں دیکھیں۔ (2) اکتیس دسمبر 1929ء کو نواب ذوالفقار علی خان نے بطور چیئرمین استقبالیہ کمیٹی، خلافت کانفرنس کے لاہور کے اجلاس میں اپنے خطاب میں انڈیا کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا تھا۔ (3) اقبال سے پہلے اٹھائیس مسلمان ایسی تجویز پیش کر چکے تھے۔

چھٹی بات یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس، جس میں اقبال نے مذکورہ خطبہ دیا، میں اس تجویز کے حق میں یا مخالفت میں کوئی قرارداد منظور نہیں ہوئی تھی۔ اجلاس نے اقبال کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ مسلم لیگ کی باضابطہ کارروائی کا ریکارڈ میرے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

1935ء کی اصلاحات

گول میز کانفرنسیں 1933ء کو ہوئیں (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیئیٹ)۔ بہت سی دیگر کتابیں مبہم یا الجھی ہوئی تاریخیں بتاتی ہیں۔ نیز، ایک بڑی تعداد میں کتابیں کہتی ہے کہ گول میز کانفرنس میں عدم اتفاق کی وجہ سے انگریزوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی صورت انڈیا پہ ایک نیا نظام مسلط کر دیا تھا۔

گول میز کانفرنسز کے لندن میں تین اجلاس ہوئے۔ پہلا بارہ نومبر 1930ء سے لے کر انیس جنوری 1931ء تک؛ دوسرا سات ستمبر سے لے کر یکم دسمبر 1931ء تک؛ اور تیسرا سترہ نومبر سے چوبیس دسمبر 1932ء تک۔ یہ کہنا کہ 1935ء کی اصلاحات انگریزوں نے ہندوستانیوں کی مرضی کے خلاف مسلط کر دی تھیں، حقائق سے سنگین چشم پوشی ہے۔ مندرجہ ذیل معروضات پر غور کریں:

سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ مئی 1930ء میں شائع کی۔ ہمہ جہت مطالعہ، گہرا مشاہدہ، دلائل کی فصاحت، حقیقت پسندی اور معقولیت اس قانون سازی کی روح رواں تھی۔ یہ رپورٹ گول میز کانفرنسز کے بعد سامنے آئی تھی۔ پہلے اجلاس میں کانگرس غیر حاضر تھی۔ کانگرس کا اصرار تھا کہ کانفرنس کو یہ بات زیر بحث نہیں لانی چاہیے کہ انڈیا کو ذمہ دارانہ حکومت کی ضرورت ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہ اسے آزاد انڈیا کو ایک آئین کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام پارٹیاں کانفرنس میں شریک تھیں۔ زیادہ تر کارروائی وفاقی منصوبے کو بتدریج واضح جہت دینے کی بابت تھی۔

دوسرے اجلاس میں کانگرس نے شرکت کی۔ اس میں قومیتوں کے معاملے پر سنجیدہ بحث ہوئی۔ آغا خان، مسٹر جناح، سر محمد شفیع اور ظفراللہ خان نے گاندھی کے ساتھ مذاکرات کیے۔ لیکن کانفرنس میں کانگرس کی طرف سے شریک واحد رہنما، گاندھی نے کسی مفاہمت پر غور کرنے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ مسلمان نہرو رپورٹ من وعن قبول کر لیں۔ اس پر سکھوں کے سوا تمام قومیتوں نے مطالبات کا ایک مشترکہ ڈرافٹ تیار کر کے اپنے کم از کم معروضے کے طور پر برطانوی حکومت کو پیش کیا۔ مسلمانوں کے مطالبات کی بنیاد آل انڈیا مسلم کانفرنس، دہلی کی چار اور پانچ اپریل 1931ء کو منظور کردہ قرارداد تھی۔ مختصر الفاظ میں یہ مطالبات اس طرح تھے: صوبائی اختیارات؛ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی؛ این ڈبلیو ایف پی کی مکمل خودمختاری؛ بلوچستان میں اصلاحات؛ جداگانہ انتخابات؛ سیاسی

کام میں مسلمانوں کی ترجیحی نشستیں، بنیادی حقوق کے لیے آئینی تحفظ؛ گروہی تعصب پر مبنی قانون سازی کے خلاف تحفظ؛ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مناسب حصہ؛ اور صوبوں کی رضامندی سے آئین میں ترمیم۔

اس کے باوجود ہندو مسلم مسئلہ حل نہ ہوا۔ یہ بات واضح ہوگئی کہ برطانوی حکومت کو ثالثی کا فریضہ سرانجام دینا پڑے گا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا مجوزہ قانون سازاداروں میں حصوں کا تعین کیے بغیر قانون سازی میں پیش رفت نہیں ہوسکتی تھی۔ کانگرس ایک مرتبہ پھر تیسرے اجلاس سے غائب تھی۔ اس میں کچھ مزید بحث ہوئی؛ زیادہ تر کام کمیٹیوں کے ذریعے کیا گیا؛ کچھ کڑیاں ملانے کی کوشش کی گئی۔

تینوں اجلاسوں میں کی گئی محنت کو مارچ 1933ء میں ایک وائٹ پیپر کی شکل میں جامع انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ پیپر کانفرنس میں ہونے والے معاہدے کی درست ترجمانی کرتا تھا۔ لیکن اس پر مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ یہ مرکز کو مضبوط کرتا ہے۔ وائٹ پیپر کا جائزہ لینے کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ آئینی طور پر یہ کمیٹی صرف ارکانِ پارلیمنٹ پر ہی مشتمل تھی، لیکن کمیٹی کے معاونین کے طور پر برٹش انڈیا سے بیس، اور ریاستوں سے سات نمائندے مقرر کیے گئے۔ پانچ مسلمان معاونین آغا خان، سر ظفر اللہ خان، سر عبدالرحیم، سر شفقت احمد خان اور سر اے ایچ غزنوی تھے۔ کمیٹی نے اپریل 1933ء سے لے کر نومبر 1934ء تک کام کیا، اور آخرکار بائیس نومبر 1934ء کو پارلیمنٹ کے سامنے رپورٹ پیش کی۔ اس پر ہاؤس آف کامنز میں دس سے بارہ دسمبر 1934ء کو، اور ہاؤس آف لارڈز میں اٹھارہ دسمبر کو بحث کی گئی۔ اس کی دوسری ریڈنگ فروری 1935ء کو، اور تیسری فروری 1935ء کو ہوئی، اور انڈین بل آخرکار چوبیس جولائی کو قانون کی کتاب کا حصہ بن گیا۔

اس سے پہلے برطانوی حکومت نے کبھی نوآبادیاتی قانون پر اتنے طویل عرصے تک محنت نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے کبھی انڈیا برطانوی پارلیمنٹ میں اتنے تسلسل اور اتنی دیر تک زیرِ بحث نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد برطانیہ نے کبھی ہندوستان پر اتنی توجہ مرکوز نہیں کی۔

لیکن اس ایکٹ کے نتیجے میں وجود میں آنے والا وفاق لچک دار ہونے کی بجائے قطعی اور

دوٹوک تھا۔ ہندوؤں کی مرضی خاص طور پر اسمبلیوں کی ساخت میں غالب آئی تھی۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کیونکہ اُن کے نزدیک ایک مضبوط مرکز کا مطلب ہندوؤں کی طاقت میں اضافہ تھا۔ مسلم لیگ نے وفاقی سکیم کو'' بنیادی طور پر خراب، دقیانوسی، رجعت پسند، ناقص اور مہلک'' قرار دیتے ہوئے مسترد کردیا۔ تاہم وہ آئین کے صوبائی حصے پر عمل کرنے پر رضامند ہوگئی، کیونکہ یہ اس کے لیے سازگار تھا۔ کانگرس نے ایکٹ کے دونوں حصوں کو مسترد کردیا، لیکن انتخابات لڑنے، اور اسمبلیوں میں آکر آئین کو زک پہنچانے کا فیصلہ کیا؛ تاہم پہلی مرتبہ اختیار کا مزہ چکھتے ہوئے اس نے بھی وصوبائی وزارتیں تشکیل دے دیں۔

1937ء کے انتخابات

انڈین نیشنل کانگرس کی انتخابات میں حاصل کردہ کامیابی اتفاقی تھی (پنجاب، جماعت نہم ودہم)۔

1937ء کے انتخابات میں کانگرس کی حاصل کردہ نشستیں:

بنگال دستور ساز اسمبلی کی 250 میں سے 54؛ بہار 152 میں سے 91؛ آسام 108 میں سے 32؛ بمبئی 175 میں سے 87، مدراس 215 میں سے 159؛ یوپی 228 میں سے 134؛ پنجاب 175 میں سے 18؛ این ڈبلیو ایف پی 50 میں سے 19؛ اوڑیسہ 60 میں سے 36؛ سندھ 60 میں سے 8؛ سی پی 112 میں سے 71۔ اس طرح کل 1771 نشستوں میں سے کانگرس کے حصے میں 762 نشستیں آئیں۔

مسلم لیگ کی حاصل کردہ نشستیں:

بنگال کی 250 نشستوں میں سے 54؛ آسام 108 میں سے 4؛ بمبئی 175 میں سے 18؛ مدراس 215 میں سے 9؛ یوپی 228 میں سے 26؛ پنجاب 175 میں سے 2؛ سی پی 112 میں سے 5؛ جبکہ بہار، این ڈبلیو ایف پی، اوڑیسہ اور سندھ میں سے ایک کوئی نشست نہیں ملی (ذرائع: سرکاری وائٹ پیپر)۔

میری عقل سے باہر ہے کہ ان نتائج کو کس طرح 'اتفاقی' دیا جاسکتا ہے؟ اُس وقت کانگرس

باون سالہ تجربہ رکھنے والی مستحکم اور منظم؛ اور انتہائی مخلص اور ذہین قیادت رکھنے والی پارٹی تھی۔ درحقیقت اس نے اُس سے کم نشستیں حاصل کیں جتنی عمومی رائے تھی، یا اسے خود توقع تھی۔

پاکستانی پروفیسر انتخابی نتائج کو ایماندارانہ حقیقت تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں انتخابی دھاندلی یا دھاندلی کے الزامات ایک رواج بن چکے ہیں؟ حتیٰ کہ آل انڈیا مسلم لیگ یا محمد علی جناح نے ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ کانگرس کی فتح محض جھولی میں گرنے والا پھل تھا۔ تمام انتخابات انگریز سرکار کی زیرِ نگرانی نہایت شفاف طریقے سے ہوئے تھے، اور لیگ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔

سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس

اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر 1936ء کو کراچی میں ہوا (وفاقی حکومت، بی اے)۔ کراچی مسلم کانفرنس کی ایک کمیٹی نے ایک الگ مسلم ریاست کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

اس کا اجلاس آٹھ سے تیرہ اکتوبر 1938ء کو ہوا، نہ کہ 1936ء میں۔ اس کا نام ''کراچی مسلم کانفرنس'' نہیں تھا بلکہ یہ ''سندھ صوبائی مسلم لیگ'' کی بلائی ہوئی کانفرنس تھی۔ جہاں تک اس کے مطالبے کا تعلق ہے تو طلبہ کو مندرجہ ذیل تفصیل کا علم ہونا چاہیے:

استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر اپنے خطاب میں سر عبداللہ ہارون نے کہا کہ اگر قومیتوں کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے اطمینان بخش طریقے سے حل نہ ہوا تو انڈیا کو ''ہندو انڈیا'' اور ''مسلم انڈیا'' میں تقسیم ہونے سے بچانا ناممکن ہوگا، اور دونوں کا اپنا ایک الگ وفاق ہوگا۔ محمد علی جناح، جو اس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے، نے اپنی تقریر میں سر ہارون کے موقف کی حمایت یا تائید نہ کی۔ لیکن جناح صاحب کی بے اعتنائی کے باوجود سندھ مسلم لیگ کی قیادت نے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کر کے سبجیکٹ کمیٹی کے پاس بھجوا دیا، اور دھمکی دی کہ اگر کانگرس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو مسلمانوں کے پاس ''پاکستان سکیم'' کی طرف پیش رفت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ یہاں اس نے الگ وفاق کا تصور بھی پیش کیا۔ لیکن کمیٹی نے قرارداد کے اس حصے کو مسترد، اور انڈیا کو تقسیم کرنے والے تمام ریفرنسز کو حذف کر دیا۔ نئی تحریر شدہ قرارداد اجلاس میں منظور کی گئی۔ پہلا ڈرافٹ سر عبداللہ ہارون اور علی محمد راشدی نے شیخ عبدالمجید

سندھی کے تعاون سے تیار کیا تھا۔ جناح کی سرزنش سے کبیدہ خاطر ہوتے ہوئے اُنھوں نے دونوں مسودے پریس میں جاری کردیے۔ مزید یہ کہ عبدالمجید سندھی نے قرارداد کا اصل مسودہ ایک بار پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش کیا، لیکن اسے ایک بار پھر مسترد کردیا گیا۔

قراردادِ لاہور: تاریخ

ہر درسی کتاب، چاہے وہ کسی بھی بورڈ، جماعت، زبان، مصنف، پبلشر کی ہو، ہمیں بتاتی ہے کہ قراردادِ لاہور 23 مارچ 1940ء کو منظور ہوئی۔ اس سے ایک مرتبہ پھر درسی کتب کا غیر مستند ہونے کا تاثر گہرا ہوتا ہے۔

قرارداد کی منظوری کی تاریخ کا ایک سادہ سا معاملہ بلاوجہ قومی اور تاریخی دروغ گوئی کی نذر ہوگیا۔ اُس دور کے تمام اخبارات اور تیار کیے جانے والے مسودے آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس کے مندرجہ ذیل نظامِ عمل کی تصدیق کرتے ہیں:

اجلاس کی کارروائی 22 مارچ کی سہ پہر تین بجے شروع ہوئی۔ نواب آف ممدوٹ نے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے خطاب کیا۔ اس کے بعد جناح صاحب نے ایک طویل فی البدیہہ تقریر کی۔ اس پر پہلے دن کا اختتام ہوا۔ 23 مارچ کو سہ پہر تین بجے اجلاس شروع ہوا۔ فضل حق نے قراردادِ لاہور پیش کی، اور اس پر ایک تقریر کی۔ چوہدری خلیق الزماں نے اس کی حمایت میں بات کی۔ ظفر علی خان، سردار اورنگ زیب خان اور عبداللہ ہارون نے اس قرارداد کی حمایت میں مختصر تقریریں کیں۔ اس کے بعد کارروائی اگلے دن کے لیے ملتوی کردی گئی۔ 24 مارچ، صبح سوا گیارہ بجے اجلاس شروع ہوا۔ قرارداد پر نواب اسماعیل خان (یوپی)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان) اور عبدالحمید خان (مدراس) نے تقریریں کیں۔ اس موقعہ پر جناح صاحب، جو کسی اور معاملے میں مصروف تھے، اجلاس میں آئے اور صدارتی کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ قرارداد پر تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسماعیل ابراہیم چندریگر (بمبئی)، سید عبدالرؤف شاہ (سی پی)، اور ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب) نے قرارداد کی پرجوش حمایت کی۔ اس موقعہ جناح صاحب نے کارروائی روکتے ہوئے عبدالرحمٰن صدیقی کو فلسطین کے حق میں قرارداد پیش کرنے کی اجازت دی۔ سید رضا علی اور عبدالحمید بدایونی نے اس کے

حق میں بات کی۔ اجلاس نے اس قرارداد کو منظور کرلیا۔ اس پر اجلاس شام 9 بجے تک کے لیے ملتوی کردیا گیا۔ رات کا اجلاس قراردادِ لاہور پر باقی رہ جانے والی دو تقریروں کے ساتھ شروع ہوا، جو سید ذاکر علی اور بیگم محمد علی نے کیں۔ اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی، اور اسے متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا۔ پارٹی آئین میں ترامیم اور خاکساروں پر مزید دو قراردادیں پیش کی گئیں اور انہیں فوراً منظور کرلیا گیا۔ آخر میں اجلاس میں آنے والے سال کے لیے عہدیداروں کا انتخاب ہوا، اس پر شب ساڑھے گیارہ بجے اجلاس ختم ہوگیا۔

چنانچہ اس حقیقت پر ذرہ بھر شبہ نہیں کہ قراردادِ لاہور 24 مارچ کو منظور ہوئی تھی۔ لیکن پاکستان میں کسی نے بھی درست تاریخ کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس میں حکومت بھی شامل ہے، جو کہ ایک غلط تاریخ، 23 مارچ کو یومِ پاکستان مناتی ہے۔ ایک تاریخی حقیقت سے گریز کی وجہ کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

قراردادِ لاہور: موقعہ

قراردادِ لاہور 23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے جلسے میں منظور کی گئی (این ڈبلیو ایف پی، جماعت چہارم)۔ 23 مارچ کو جناح صاحب نے لاہور میں ایک اجلاس بلایا اور مسلمانوں کو ایک الگ سرزمین حاصل کرنے کے تصور کی وضاحت کی (پنجاب، کلاس چہارم)۔

کیا مصنفین بچوں کو یہ بتانے کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے کہ وہ مسٹر جناح کا منعقد کیا ہوا کوئی جلسۂ عام نہیں، بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا؟

قراردادِ لاہور: معانی

کم و بیش تمام درسی کتابیں، چاہے حکومت کی شائع کردہ ہوں، یا تدریسی عمل میں مصروف پروفیسر کی تحریر کردہ، تحریکِ پاکستان کی سب سے اہم دستاویز کو غلط طریقے سے بیان کرتی ہیں، اس کے غلط حوالے دیتی ہیں، اور اس کے سیاق و سباق کی مبہم تشریح کرتی ہیں۔ اس غلط بیانی کی مزید سنگین مثالوں کا حوالہ دینا ضروری ہے تاکہ اس ابہام کی گہرائی تک جا کر طلبہ کے ذہن میں پیدا کیے گئے

اثرات کا جائزہ لیا جا سکے:

اس نے دو آزاد ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، کراچی، انگلش، جماعت پنجم)۔اس نے جنوبی ایشیا میں ایک علیحدہ، آزاد ریاست کا مطالبہ کیا، جس کا نام پاکستان ہوگا (سندھ، جماعت ششم)۔اس نے انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد سرزمین کا مطالبہ کیا (پنجاب، جماعت ششم)۔اس نے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا مطالبہ کیا جس کا نام پاکستان ہوگا (سندھ، جماعت ششم)۔اس نے انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ سرزمین کا مطالبہ کیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ششم)۔اس نے ایک آزاد اور خودمختار اسلامی حکومت کا مطالبہ کیا (سندھ، جماعت ہفتم)۔اس نے ایک آزاد حکومت اور آزاد مملکت کا مطالبہ کیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہشتم)۔اس نے ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کیا (سندھ، جماعت ہشتم)۔اس نے ایک آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ کیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت نہم ودہم)۔اس نے مسلمانانِ برِصغیر کے لیے ایک الگ سرزمین کا مطالبہ کیا (سندھ، جماعت نہم ودہم)۔اس نے اعلان کیا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو ملا کر ایک آزاد اور خودمختار ریاست تشکیل دی جائے گی (سندھ، انگلش، جماعت ششم)۔اس نے ایک آزاد اور خودمختار ریاست مسلم ریاست کا مطالبہ کیا (سندھ، انگلش، جماعت ہشتم)۔اس نے ایک الگ مسلم ریاست کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔اس نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کی تخلیق کا مطالبہ کیا (وفاقی حکومت، بی اے)۔اس نے ایک الگ سرزمین کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔اس نے ایک الگ سرزمین حاصل کرنے کا دعویٰ کیا؛ اس نے برِصغیر کو دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، بی اے)۔

مندرجہ بالا احمقانہ معروضات پر تبصرے سے پہلے آیئے اس کے اصلی مواد کا جائزہ لیں۔ قراردادِ لاہور کا فعال حصہ، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے باضابطہ طور پر شائع ہوا، اس طرح ہے:

''آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس میں متفقہ طور پر طے کیا گیا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو کوئی آئینی منصوبہ اُس وقت تک قابلِ قبول نہ ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کے مطابق نہ ہو۔ جغرافیائی طور پر ملحق اکائیوں کو ملا کر علاقے بنائے جائیں، جن کی حد بندی کرتے ہوئے خیال رکھا جائے کہ جہاں مسلمان عددی طور پر اکثریت میں ہیں، جیسا کہ انڈیا کے شمال مغربی

اور مشرقی علاقوں میں، اُنہیں ملا کر آزاد ریاستیں بنا دیا جائے، جن کی اساسی اکائیاں آزاد اور خود مختار ہوں گی۔''

اس کی اصل (انگلش) عبارت ناقص الفاظ اور خستہ انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ اس میں پانچ مختلف انواع کی علاقائی اصلاحات کو ان کی معنوی وضاحت کے بغیر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ ایسی مبہم، الجھی ہوئی اور غیر واضح دستاویز نے ایک ملک کا نہ صرف مطالبہ کیا، بلکہ اسے حاصل بھی کر لیا۔ اس میں ''آزاد ریاستوں'' کو واوین میں لکھا گیا ہے۔ کیوں؟ کیا کوئی ایسی ریاست بھی ہو سکتی ہے جو آزاد نہ ہو؟ کچھ مزید الجھاؤ بھی ہے۔ آخری دس الفاظ اعلان کرتے ہیں کہ یہ ریاستیں ''آزاد اور خود مختار'' ہونی چاہیے۔ انداز قطعی اور دوٹوک ہے۔ ایک ریاست خود مختار اکائیوں کی بنیاد پر کیسے وجود میں آ سکتی ہے؟ کیا با اختیار اور خود مختار ہم معانی اصلاحات ہیں؟ اس قرارداد میں لفظ ''وفاق'' استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ کیا شمال مغربی اور شمال مشرقی ریاستیں اکائیوں پر مشتمل ہونی چاہیں؟ یہ مطالبہ ''ریاستوں'' (جمع کا صیغہ) کا ہے، اور ان کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ کیا دونوں علاقے دو ریاستیں بنیں، یا زیادہ؟

میں نے یہ سوالات اس لیے سامنے رکھے ہیں کیونکہ مجھے کسی بھی درسی کتاب میں ان کا کوئی حوالہ نہیں ملا۔ یہ مصنفین کا فرض تھا کہ کم از کم کالج کی سطح پر قرارداد کا کوئی تنقیدی جائزہ پیش کر دیتے، اور اس کی تفہیم میں حائل مشکلات کی نشاندہی ہو جاتی۔ گمان ہے کہ کتابیں لکھنے سے پہلے مصنفین نے قرارداد پڑھی ہوگی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو ہم درسی کتب میں ایسا ابہام نہ دیکھتے۔

اب قرارداد کی اصل تحریر قارئین کے سامنے ہے۔ کیا وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس میں سے ایسے الفاظ تلاش کر سکتے ہیں جن کی بنیاد پر مختلف درسی کتب نے مندرجہ ذیل نو بیانات تراشے ہیں؟ اُن کے نزدیک قرارداد مطالبہ کرتی تھی:

1۔ دو آزاد ریاستیں؛

2۔ ایک الگ آزاد ریاست؛

3۔ ایک آزاد سرزمین؛

4۔ ایک آزاد ریاست، جس کا نام پاکستان ہوگا؛

5۔ ایک الگ اور آزاد اسلامی حکومت؛

6۔ ایک آزاد حکومت اور ایک آزاد مملکت؛

7۔ انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک وطن؛

8۔ ایک الگ سرزمین؛

9۔ انڈیا کی دو آزاد ریاستوں میں تقسیم۔

ایسا لگتا ہے کہ درسی کتابیں قراردادِ لاہور نہیں، کسی اور گمنام اعلامیہ کی بات کر رہی ہیں۔

قراردادِ لاہور سے روا رکھے جانے والے سلوک سے ایک بنیادی سوال اٹھتا ہے: اگر درسی کتابیں نصاب کی تیاری میں شائع شدہ اور آسانی سے دستیاب دستاویز کو توڑ مروڑ کر من گھڑت انداز میں پیش کر سکتی ہیں تو پاکستان کی سیاسی پیش رفت، جس کی کوئی تحریری دستاویز موجود نہیں، اور جہاں متضاد آراء، حب الوطنی اور مسلکی اور نسلی مفادات کا ٹکراؤ تاریخ کا افق مکدر کر دیتا ہے، اور ابہام کی گہری دھند حقائق کو نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے، وہاں یہ کتابیں کیا کیا گل نہیں کھلاتی ہوں گی۔ جو کچھ ہم اپنے بچوں کو بتا رہے وہ محض نیم پختہ سچائی، مبالغہ آرائی، اصلاحات کے ساتھ کھلواڑ، غلط معلومات، حقیقت سے گریز یا مسخ شدہ، ادھوری اور تبدیل شدہ سچائیاں نہیں؛ ہم انہیں جھوٹ، دروغ گوئی، دیومالائی قصوں، اساطیر، اور طوطے مینا کی کہانیوں پر پال رہے ہیں۔ عزیز قارئین، مقامِ فکر ہے۔ کہاں ہے وہ حق جس کے ہم دعویدار رہے ہیں! کہاں گیا وہ سچ جو اسلام کا سب سے پہلا سبق ہے!

قراردادِ لاہور: جہالت کی بازگشت

قارئین کی پیش خدمت یہ جملہ جہالت اور لاعلمی کا شاہکار ہے: مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک میں پیش کی۔ اس نے ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کیا (پنجاب، انگلش، جماعت، نہم و دہم)۔ فاضل مصنف لندن یونیورسٹی سے ریسرچ کی ڈگری رکھتے ہیں؛ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ریٹائرڈ پروفیسر، اور اس وقت لاہور کے ایک بہترین انگلش میڈیم کالج کے پرنسپل ہیں۔

ایک جملے میں حقائق کی پانچ غلطیاں سمو دینا انہی کی مہارت ہے، ہما شما کے بس کی تو بات

ہیں۔ نوجوان قارئین کے لیے غلطیوں کی نشاندہی پر کوئی انعام نہیں، لیکن اگر میں ممتحن ہوتا تو میں اس بیچ کو ایم اے تاریخ یا پولیٹیکل سائنس کے امتحان میں شامل طلبہ کے سامنے رکھتا تو کہتا کہ اس میں موجود تمام غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ مجھے شک ہے اگر وہ اس ''امتحان'' میں کامیابی کے کم از کم نمبر بھی حاصل کر لیں۔ سکولوں اور کالجوں، بلکہ جامعات کے اساتذہ کے امتحانی نتائج بھی مختلف نہ ہوتے۔

اب غلطیوں کی درستی: (1) یہ قراردادِ پاکستان نہیں، قراردادِ لاہور تھی۔ (2) یہ کوئی جگہ عظیم الشان عوامی اجتماع نہیں بلکہ سالانہ اجلاس تھا۔ (3) اسے مسلم لیگ نے نہیں، آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی تنظیم نے منظور کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ نویں جماعت کا کوئی غیر معمولی طالب علم (جس کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے) ''لاہور'' اور ''مسلم لیگ'' جیسے الفاظ پر غور کرنے کے بعد یہ تاثر لے کہ یہ قرارداد پنجاب مسلم لیگ نے منظور کی تھی۔ (4) یہ 23 کو نہیں، 24 مارچ کو منظور ہوئی تھی۔ (5) یہ ایک آزاد ریاست کا مطالبہ نہیں کرتی، بلکہ لفظ ''ریاستوں'' استعمال کیا گیا تھا۔

یہ قرارداد اتنے بھونڈے انداز میں ڈرافٹ کی گئی ہے کہ کچھ محتاط سکالرز کی رائے میں یہ بات بھی قابل بحث ہے کہ اس نے آزاد ریاستوں کا مطالبہ کیا تھا یا انڈین ریاست اور مسلم ریاستوں کے درمیان کسی قسم کے وفاقی معاہدے کی تجویز پیش کی تھی؟ لیکن میں مصنف کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دوں گا۔ اُن کی غلطیاں اُن کی علمی تادیب کے لیے کافی ہیں۔

مسلم لیگ کے ارکین اسمبلی کا کنونشن

مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب شدہ مسلمان اراکین نے 1946ء میں دہلی میں ایک اجلاس منعقد کیا (پنجاب، انگلش، جماعت نہم و دہم)۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی کا کنونشن نواپریل 1949ء کو دہلی میں ہوا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ نواپریل 1946ء کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں سے تعلق رکھنے والے پانچ سو مسلم اراکین نے قراردادِ لاہور پر نظر ثانی کی (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ قراردادِ لاہور کا لفظ ''ریاستیں''، جو کہ جمع کا صیغہ تھا، نواپریل 1946ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں درست کر دیا گیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

اوپر درج چاروں بیانات غلط ہیں۔ (1) وہ منتخب شدہ ''مسلمان ممبر'' نہیں، بلکہ مسلم لیگ

کے ٹکٹ پر منتخب شدہ مسلمان ممبر تھے۔ (2) سال 1946ء نہیں بلکہ 1949ء تھا۔ درست تاریخ 9-7 اپریل 1949 تھی۔ یہ ایک روزہ اجلاس نہیں تھا۔ (3) یہی غلطی پہلے بیان میں ہے۔ (4) یہ مسلم لیگ کا اجلاس نہیں، بلکہ مسلم لیگ اراکین اسمبلی کا کنونشن تھا۔

بیانات 3 اور 4 اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ کنونشن نے قراردادِ لاہور میں ترمیم کر کے خلافِ ضابطہ کام کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے مطابق کسی اجلاس کے فیصلوں اور منظور شدہ قراردادوں میں کوئی اور اجلاس ہی ترمیم کرنے کا مجاز تھا۔ کوئی اور ادارہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ دہلی کنونشن کے پاس قراردادِ لاہور کو تبدیل کرنے کوئی حق نہ تھا۔

چونکہ کنونشن کی قراردادِ لاہور میں ترمیم کرنے کی حقیقت زیادہ جانی پہچانی نہیں، اس لیے میں اس کا تمہیدی پیراگراف اور تحریر کا افتتاحی پیراگراف یہاں نقل کر رہا ہوں:

''جیسا کہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ انہیں ہندوؤں کی بالادستی سے بچانے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بنگال اور آسام پر مشتمل ایک آزاد ریاست شمال مشرقی علاقے میں، اور پنجاب، سندھ، بلوچستان اور این ڈبلیو ایف پی پر مشتمل شمال مغربی علاقے میں قائم کی جائے''۔

''یہ کہ شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل زون، اور شمال مغرب میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور این ڈبلیو ایف پی پر مشتمل زون ایک آزاد اور خود مختار ریاست تشکیل دیں گے، اور اس واضح پیش رفت کے نتیجے میں پاکستان بلا تاخیر قائم کیا جائے گا۔''

جواہر لال نہرو کا 1946ء کا بیان

جواہر لال نہرو نے 1946ء میں کہا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں ہندوؤں کی حکومت ہوگی (مغربی پنجاب، کلاس دوم)

نہرو نے 1946ء میں، یا کسی اور سال ایسی بات کبھی نہیں کہی۔ غالباً درسی کتاب اُن کے کیبنٹ مشن پلان پر دیے گئے بیان کا حوالہ دے رہی ہے۔ پنڈت نہرو نے دراصل جو کچھ کہا تھا، وہ تھا۔ جیسے جولائی 1946ء کو انڈین نیشنل کانگرس کی بمبئی میں کارروائی سمیٹتے ہوئے اُنھوں نے کہا،

'یہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں، سوال ہمارے کسی چھوٹے یا بڑے پلان کو قبول کرنے کا نہیں، سوال صرف ہمارے دستور ساز اسمبلی میں جانے پر راضی ہونے کا ہے۔ یہی ساری بات ہے۔ جب ہم سمجھیں کہ ایسا کرنا انڈیا کے لیے سود مند ہے، ہم اسمبلی میں رہیں گے، اور جب ہم دیکھیں گے ایسا کرنے سے ہمارے مقصد کو نقصان پہنچ رہا ہے تو ہم باہر آ کر لڑائی کریں گے۔ دستور ساز اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کرتے وقت ہم کسی چیز کے پابند نہیں ہوں گے۔''

دوبارہ دس جولائی ایک پریس کانفرنس میں نہرو نے اپنی چھے جولائی کی تقریر کو دہراتے ہوئے کہا کہ کانگرس دستور ساز اسمبلی میں جانے پر رضا مند ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ انھوں نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا: ''ہم وہاں کیا کریں گے، ہم اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہیں'' (دونوں بیانات ''دی انڈین اینول رجسٹر، 1946، والیم دوم سے لیے گئے ہیں)۔

اُس دور کے اخبارات اور دیگر ریکارڈ، اور بعد میں لیے جانے والے جائزوں میں نہرو کا ایسا کوئی بیان دکھائی نہیں دیتا ہے کہ 1947ء کے بعد انڈیا پر ہندو حکومت کریں گے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ جھوٹ جماعت دوم سے بولا جا رہا ہے۔

این ڈبلیو ایف پی ریفرنڈم

این ڈبلیو ایف پی کے تمام لوگوں نے 1946ء میں پاکستان کے حق میں متفقہ طور پر ووٹ دیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت چہارم)۔

یہ دعویٰ مبہم ہونے کے علاوہ انتہائی غلط بھی ہے، چاہے مصنف 1946ء میں پیش آنے والے کسی بھی واقعے سے مراد لے رہا ہو۔ اگر یہ بیان 46-1945ء کے انتخابات کے حوالے سے ہے، تو حقائق اس طرح ہیں: مرکزی دستور ساز اسمبلی میں نمائندگی کے لیے صوبے سے ایک ممبر کے چناؤ کے لیے ہونے والے انتخابات سے مسلم لیگ نے اس بہانے گریز کی راہ اختیار کی کہ یہ مخلوط انتخابی نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ کانگرس کے امیدوار، عبدالغنی خان کو 8,159 ووٹ ملے؛ جبکہ خاکسار کے امیدوار، محمد اکبر قریشی نے 5,386 ووٹ لیے۔ مسلم لیگیوں نے یقیناً خاکسار امیدوار کو ووٹ دیے

ہوں گے کیونکہ صوبے میں خاکسار تحریک کے اتنے پیروکار نہیں تھے جتنے اُس کا نمائندہ ووٹ لے گیا تھا۔ صوبائی انتخابات میں کانگرس پچاس میں سے تیس نشستیں جیت گئی، جبکہ مسلم لیگ کے حصے میں سترہ، اور جمعیت علمائے ہند کے حصے میں دو نشستیں آئیں۔ کل مسلم نشستوں کی تعداد اڑتیس تھی؛ کانگرس نے انیس جبکہ مسلم لیگ نے سترہ جیتیں۔ اڑتیس مسلم حلقوں میں ڈالے گئے کل ووٹ 355,246 تھے؛ ان میں سے مسلم لیگ کو 147,940 (41.65٪) ملے؛ کانگرس نے 136,201 (38.34٪) حاصل کیے۔ اب درسی کتاب کہتی ہے کہ ''تمام لوگوں نے''۔ تو کیا 41.65٪ کو ''تمام لوگ'' کہا جا سکتا ہے؟

اگر 6 تا 16 جولائی 1947ء کے ریفرنڈم کے حوالے سے بات کہی گئی ہے تو اس کے اعداد و شمار اس طرح ہیں:

سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھی جائے کہ کانگرس اور سرخ قمیص تحریک نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اس ریفرنڈم میں ڈالے گئے ووٹوں کی کل تعداد 292,118 تھی، جس میں سے 289,244 پاکستان کے حق میں تھے۔ اُن حلقوں میں کل رجسٹرڈ ووٹ 572,798 تھے۔ اس طرح ووٹ ڈالنے کی شرح 51٪ رہی۔ اگر پاکستان کے حق میں پڑنے والے ووٹ کی اوسط نکالی جائے تو یہ 58.28٪ بنتی ہے۔ یہاں دوبارہ درسی کتاب کے ''تمام لوگ'' دکھائی نہیں دیتے۔

جھوٹ بولنا بری بات ہے: چوتھی جماعت کے طلبہ سے غلط بیانی کرنا بدتر ہے؛ ایک درسی کتاب میں غلط بیانی کرنا ناقابل معافی ہے۔

قیام پاکستان کی تاریخ

پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا (مغربی پنجاب، جماعت دوم)۔ برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ 14 اگست 1947ء کو کیا گیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہشتم)۔ پاکستان کی بنیاد 14 اگست 1947ء (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، کلاس اوّل)۔ پاکستان کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناح نے 14 اگست 1947ء کو رکھی (پرائیویٹ، کراچی، انگلش، جماعت اوّل، دوم)۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر 27 جون 1947ء کو ابھرا؛ دو آزاد ریاستیں، انڈیا اور پاکستان

19 جولائی 1947ء کو وجود میں آئیں (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

27 جون اور 19 جولائی کی تاریخیں تو یقیناً مصنف کے نسیان کا نتیجہ ہیں، اور ایک شہرت یافتہ کالج کے پروفیسر ہمدردی کے لائق ہیں۔ لیکن عمومی تاثر، جسے یوم آزادی کی تقریبات تقویت دیتی ہیں، کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا، درست نہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ میں 4 جولائی کو پیش کیا گیا انڈیا کا آزادی بل جو 15 جولائی کو قانون بنا، کے مطابق ریاستیں، پاکستان اور انڈیا، 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات کو آزاد ہونی تھیں۔ برطانوی بادشاہ کے واحد نمائندے وائسرائے نے اپنے اختیارات ذاتی طور پر ان ریاستوں کو منتقل کرنے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ذاتی طور پر کراچی اور نئی دہلی میں بیک وقت موجود نہیں ہو سکتے تھے، اور نہ ہی وہ انڈیا کو اختیارات سونپ کر 15 اگست کی صبح بھاگم بھاگ کراچی آ کر پاکستان کو اختیارات سونپ سکتے تھے، کیونکہ ایسا کرتے ہوئے وہ انڈین ریاست کے گورنر جنرل ہوتے۔ چنانچہ واحد قابل عمل راستہ یہ تھا کہ وہ پاکستان کو 14 اگست کو اختیارات سونپیں جبکہ وہ انڈیا کے وائسرائے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوا۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی اکثریت پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانا چاہتی تھی؛ قیام پاکستان کے بعد بدقسمتی سے پاکستان ایسے عناصر اور قوتوں سے بھر گیا جو پاکستان کو ایک اسلامی معاشرہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انتہائی بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ یہ عناصر ملک کی دستور ساز اسمبلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے، جہاں اُنھوں نے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کی پوری کوشش کی (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی 1947ء سے لے کر 1954ء تک موجود رہی۔ اس کے اراکین کی تعداد 76 تھی، جن میں 62 اراکین مسلم لیگ کے، 10 پاکستان نیشنل کانگرس کے، تین آزاد پاکستان پارٹی کے تھے، جبکہ ایک رکن آزاد تھا۔ لیگ کے 62 اراکین میں محمد علی جناح، لیاقت علی خان، عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر، راجہ غضنفر علی خان، خواجہ شہاب الدین، ڈاکٹر محمد مالک، خواجہ

ناظم الدین، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر آئی ایچ قریشی، شعیب قریشی، اے کے بروہی، چوہدری محمد علی اور خان عبدالقیوم خان شامل تھے۔ ان میں سے زیادہ تر قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھی، اور تحریک پاکستان کے رہنما تھے۔ مارچ 1949ء میں اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی۔ دسمبر 1952ء میں اس نے بنیادی اصولوں پر مبنی کمیٹی رپورٹ شائع کی۔ 1956ء کا آئین اگرچہ دوسری دستور ساز اسمبلی نے بنایا، لیکن اس کی بنیاد یہی دو دستاویزات تھیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی نے بھی اسے اسلامی آئین قرار دیا تھا۔

درسی کتاب کی جسارت دیکھیں: اس نے بانیان پاکستان کو منفی انداز میں پیش کرتے ہوئے اُنہیں اسلام کے دشمن قرار دیا ہے کہ اُن کے کوئی ''مذموم مقاصد'' تھے، اور اُن کی دستور ساز اسمبلی میں موجودگی پاکستان کی ''انتہائی بدقسمتی'' تھی۔ یہ سب کچھ حکمران جنرل، ضیاالحق کی قیادت میں ہوا۔ یہ ہے وہ ہرزہ سرائی جو بی اے کے طلبہ کے ذہن میں اتاری جارہی ہے۔

1956ء کا آئین

یہ ابھی نافذ نہیں ہوا تھا کہ اسے ساقط کر دیا گیا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت پنجم)۔ یہ کبھی نافذ نہ ہوسکا، اور جنرل ایوب خان نے حکومت پر قبضہ کرلیا (سندھ، جماعت پنجم)۔ یہ ابھی نافذ ہوا ہی تھا جب ملک کی سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ اُس موقع پر، اکتوبر 1958ء کو ایوب خان نے مارشل لا لگا دیا اور انتظامیہ کو مکمل تباہی سے بچالیا (وفاقی حکومت، بی اے)۔ چوہدری محمد علی کے وزارتِ اعظمیٰ سے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے 1956ء کا آئین نافذ نہ ہوسکا (پرائیویٹ، کراچی، بی اے)۔

1956ء کے آئین کے بل کا مسودہ 9 جنوری کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس پر آخری بحث 29 فروری کو ہوئی۔ دستور 23 مارچ کو نافذ ہوگیا، جبکہ چوہدری محمد علی نے 12 ستمبر 1956ء کو استعفا دیا۔ اُن کے جانشین وزرائے اعظم کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حسین شہید سہروردی (12 ستمبر 1956ء سے 11 اکتوبر 1957ء)

آئی آئی چندریگر (18 اکتوبر سے 11 دسمبر 1957ء)

سر فیروز خان نون (16 دسمبر 1957ء سے 17 اکتوبر 1958ء)

اس کے بعد جنرل محمد ایوب خان نے 17 اکتوبر 1958ء کو صدر، اسکندر مرزا کو آئین معطل کرنے پر مجبور کیا۔ دو ہفتوں کے بعد ایوب خان اسکندر مرزا کو منصب سے ہٹا کر ملک کے حکمران بن گئے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ 1956ء کا آئین نافذ نہیں ہو سکا تھا۔ یہ ڈھائی سال (23 مارچ 1956ء سے لے کر 17 اکتوبر 1958ء) تک ملک کا آئین رہا تھا۔

جنرل ایوب خان کا شب خون

اُنھوں نے انتظامیہ کو بدنظمی سے بچانے کے لیے ملک کا کنٹرول سنبھالا (وفاقی حکومت، بی اے)۔ نام نہاد سیاسی رہنماؤں کی غلط پالیسیوں اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا، اور ایک مضبوط حکومت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اُن حالات میں جنرل محمد ایوب خان (مرحوم) نے مارشل لا لگایا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)

یہ جنرل ایوب خان کا خصوصی وکالت نامہ اور فوج کے شب خون کا جواز ہے۔ یقیناً کچھ بدنظمی تھی؛ جمہوری اقدار پر عمل نہیں کیا جا رہا تھا؛ خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں مسلم لیگ واشگاف انداز میں انتخابات کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اسمبلیوں میں اراکین کا رویہ ناروا تھا۔ بااختیار افراد ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ سیاسی حالات دگرگوں تھے (یہ سب کچھ پاکستانی سیاست کا ایک معمول رہا ہے)۔ لیکن ملک یقیناً تباہی کے دھانے پر ہرگز نہ تھا۔ نہ تو اسکندر مرزا اور نہ ہی ایوب خان کے پاس ''ملک کے دفاع'' کے لیے قدم آگے بڑھانے کا کوئی جواز تھا۔ ایوب خان نے خود تحریری طور پر بیان کیا ہے کہ وہ 1954ء سے ہی مارشل لا لگانے کا سوچ رہے تھے۔

جنرل ایوب خان کی حکومت

پاکستانی عوام صدر ایوب کے ساتھ بہت خوش تھے۔ اُنھوں نے ایوب خان کو اعلیٰ ترین فوجی عہدہ دیا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جماعت سوئم)۔

غریب عوام کو اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اظہار کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔ ایوب خان عوام

پر اتنا عدم اعتماد کرتے تھے کہ انھوں نے براہ راست منتخب ہونے والی اسمبلیاں معطل کر کے ان کی جگہ ''بنیادی جمہوریتیں'' متعارف کرائیں۔ لارڈ ریپون کے پرانے دور کے برطانیہ میں ان کا تجربہ کیا گیا تھا۔ ایوب خان کو جنرل سے فیلڈ مارشل کے عہدے پر عوام نے نہیں، اُن کی اپنی چنی ہوئی کابینہ، جس میں کچھ جنرل بھی شامل تھے، نے فائز کیا تھا۔

1962ء کا آئین

اس کی بہت سی دفعات مقدس شریعت کے خلاف تھیں، جیسا کہ طلاق، خلع، پوتے کو وراثت اور زیادہ شادیوں کے معاملات (پرائیویٹ، کراچی، بی اے)

میرے پاس موجودہ 1962ء کے آئین کی سرکاری شائع شدہ کاپی میں ''شریعت کے ان مقدس عناصر'' کا کوئی ذکر نہیں۔ ان معاملات کا تعلق فیملی لاز آرڈیننس سے ہے جو ایوب خان نے جاری کیا، اور بعد میں اسے قومی اسمبلی نے آئین کا حصہ بنا دیا۔ اگر یہ قوانین 1962ء کے آئین کا حصہ ہوتے تو یہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے۔ لیکن یہ قوانین ابھی تک، جبکہ ملک میں 1973ء کا آئین نافذ ہے، ملک میں نافذ ہیں۔

1965ء کی جنگ

پاک فوج اور پاکستانی عوام سے خوفزدہ ہو کر انڈیا نے امن کی درخواست کی (پنجاب، جماعت چہارم)۔ جب انڈیا شکست کے قریب تھا، اُس نے اقوامِ متحدہ سے فائر بندی کرانے کی درخواست کی (پنجاب، جماعت پنجم)۔

ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ انڈیا پاکستان سے شکست کھانے کے قریب ہو، یا اس نے امن کی بھیک مانگی ہو، یا اقوام متحدہ سے فائر بندی کرانے کی درخواست کی ہو۔ جنگ بڑی طاقتوں کی مداخلت سے بند ہوئی تھی۔

ایوب خان کا یحییٰ کو انتقال اقتدار

1969ء میں مختلف سیاسی گروہ کئی ایک مطالبات کر رہے تھے جس سے بدنظمی پیدا ہو رہی

یحییٰ ہوا ہے دیا گیا حق
ایوب خان نے کمانڈر انچیف، جنرل یحییٰ خان سے انتظامی معاملات کا
نہیں اس کے نتیجے میں صدر ایوب خان نے کمانڈر انچیف، جنرل یحییٰ خان سے انتظامی معاملات کا
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بی اے، وائیم ون)۔
خیال رکھنے کو کہا (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بی اے، وائیم ون)۔
ایسی مبہم وضاحتیں ایوب خان کے خلاف وسیع پیمانے پر چلنے والی طویل عوامی مہم پر پردہ نہیں
ڈال سکتیں۔ ان کے دور کی کمزوریوں کی فہرست مرتب کرنے اور اُن کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔
ایوب خان نے اقتدار سپیکر قومی اسمبلی کے سپرد کرنے کی بجائے ایک آرمی چیف کے سپرد کر کے خلاف
قانون کام کیا تھا۔ اس حقیقت کا درسی کتابوں میں کوئی ذکر موجود نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ایوب خان اور
یحییٰ کی میٹنگ کے دوران کیا ہوا؟ عمومی تاثر یہ ہے کہ جنرل نے فیلڈ مارشل کے سر پر پستول رکھ کر اقتدار
لیا تھا۔

”یحییٰ کا آئین“

مارچ 1969ء میں جنرل یحییٰ خان نے ملک میں ایک اور آئین نافذ کیا (پرائیویٹ،
لاہور، بی اے)۔
ایسا کوئی آئین نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے ایک آئینی مسودے کا ڈرافٹ تیار کرایا
تھا (جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، سابق چیف جسٹس کارنیلیس اس کام میں شریک تھے)؛ اسے سرکاری
پریس پر شائع کیا گیا، لیکن اسے عوام کے سامنے پیش کرنے یا نافذ کرنے کی نوبت نہ آئی۔

1971ء میں پاکستان کا دولخت ہونا

پاکستان ٹوٹنے کا غلط اور من گھڑت، لیکن پانچویں جماعت سے لے کر بی اے تک ہر
جماعت کی درسی کتاب میں تواتر سے دہرایا جانے والا ایک ہی معیاری بیانیہ ہے۔ اس کے لیے طویل
اقتباسات نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں پڑھ کر جو مجموعی تصویر ابھرتی ہے، اس کے خدوخال کچھ
یوں ہیں: اردو کی بطور قومی زبان مخالفت کرنا مشرقی پاکستان کے لوگوں کی ناسمجھی اور شرپسندی تھی؛
مشرقی پاکستان کی ہندو آبادی غدار تھی؛ ملک کے خلاف سازش کرنے والے کچھ اندرونی دشمن تھے؛
انڈیا نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مشرقی پاکستان میں فسادات برپا کرائے، جب حالات اس کے لیے

موزوں ہو گئے تو اس نے مشرقی پاکستان پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا، اور پاک فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے، اور یوں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگالیوں کے خلاف الزامات کی دو ٹوک فہرست اور مغربی پاکستان کے حق میں گھڑے گئے جواز حقائق کے ساتھ کھلواڑ ہے۔ یہ اتنی طویل کہانی ہے کہ یہ مختصر تبصرے، بلکہ ایک یا دو ابواب میں بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ لیکن ملک کے دولخت ہونے کے کسی بھی متوازن بیانیے کے لیے مندرجہ حقائق بیان کرنا ضروری ہے (یہ فہرست طویل ہے):

(1) 1947ء میں دو بازوؤں پر مشتمل ایک ریاست تخلیق کرنا کوتاہ بینی تھی۔ یہ واقعی ساتھ ایک مذاق تھا، جبکہ دونوں بازوؤں کے درمیان واقع دشمن ملک، انڈیا کی وجہ سے مشرقی پاکستان کا دفاع ناممکن تھا۔ جغرافیائی حقائق مستقل ہوتے ہیں۔ تاریخی ضرورت عارضی ہوتی ہے۔ اور یہاں کوئی تاریخی ضرورت بھی موجود نہیں تھی۔

(2) دونوں حصوں کے درمیان ثقافتی اختلافات اُن کے ایک قوم بننے کی راہ میں حائل تھے۔

(3) ایک ملک جس کی آبادی کی اکثریت بنگالی زبان بولتی تھی، پر اردو (جو مغربی پاکستان میں بھی اقلیت کی زبان تھی) مسلط کر دینا دانشمندی نہیں تھی، خاص طور پر اُس وقت جب بنگالی اپنی زبان سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔۔۔ اور یہ ایک فطری جذبہ ہے، جیسا کہ ہم عربوں اور فرانسیسیوں، اور اپنے قریب اردو بولنے والی مہاجر کمیونٹی میں دیکھتے ہیں)۔

(4) اگست 1947ء کے بعد سے بنگالی سیاسی طاقت سے محروم تھے۔ انہیں وزارتوں، آئینی حساب کتاب اور فیصلہ سازی میں نظر انداز کیا جاتا تھا۔ مرکز سے دوری نے محرومی کے جذبات کو مزید بھڑکا دیا۔ گورنر جنرل/صدر اور وزیراعظم کے درمیان اختیارات کا توازن صاحب منصب کے عہدے کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کی نسلی وابستگی سے تھا (جیسا کہ غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین)۔

(5) مشرقی پاکستان کو واجب فنڈز فراہم نہیں کیے گئے۔ اس کی ترقی کے لیے بہت کم رقم خرچ کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی پٹ سن سے ہونے والی آمدنی بھی مغربی پاکستان پر خرچ ہوتی تھی۔

(6) وفاقی دارالحکومت مغربی پاکستان میں واقع تھا، اور اس کی جغرافیائی موجودگی کا فائدہ بھی مغربی پاکستان کو ہو رہا تھا۔ اسلام آباد کے دارالحکومت بننے کے بعد مغربی پاکستان کو حاصل

صورت مزید بڑھ گئی۔

(7) بنگالیوں کو ملک کی سول انتظامیہ میں بہت کم حصہ دیا جاتا تھا۔ اعلیٰ افسران میں بنگالیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ وفاقی سیکریٹریٹ کے اعلیٰ حلقوں میں کسی بنگالی کے دکھائی دینے پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ تمام اہم فیصلے جو مشرقی پاکستان کو متاثر کرتے تھے، اور پھر اُن کا مغربی پاکستان پر بھی اثر ہوتا، بنگالیوں کی شرکت یا مشاورت کے بغیر کیے جاتے۔

(8) بنگالیوں کا عملی طور پر فوج میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ نیوی اور فضائیہ میں اُن کی کچھ نمائندگی تھی، لیکن یہ بری فوج ہے جو حکومتوں کا تختہ الٹ کر ملک پر حکومت کرتی ہے۔ بنگالی یہ بات جانتے تھے، اور ایوب خان کے اقتدار سنبھالنے پر اُن کے پاس تاسف کے سوا کچھ نہ تھا۔

(9) جغرافیائی فاصلہ اور فوج میں بنگالیوں کی معدوم شمولیت سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ کسی غیر ملکی جارحیت کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کو اپنے دفاع کے لیے مکمل طور پر مغربی پاکستان کی خوشنودی اور توجہ پر انحصار کرنا پڑے گا (جیسا کہ 1965ء کی جنگ میں یہ بات ثابت ہوگئی)۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا وہ واقعی آزاد اور خود مختار ہیں؟ اس سوال کا فوری جواب 1971ء میں مل گیا، جب اُن کی ''اپنی فوج'' نے اُنہیں فتح کرنے کی کوشش کی۔

(10) مشرقی پاکستان میں تعینات مغربی پاکستان کے افسران اور وہاں کام کرنے والے کاروباری افراد کا رویہ انتہائی پر رعونت، توہین آمیز اور جارحانہ ہوتا۔ وہ بنگالیوں کو یقین دلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے کہ وہ ابھی بھی نو آبادیاتی نظام میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ بھول گئے کہ ایک دن آئے گا جب پرانا حساب خون کے ساتھ چکانا پڑے گا۔ اور اس میں بنگالیوں کا خون بھی شامل ہوگا۔

(11) آزادی کے پچیس سال بعد بھی پاکستان کوئی ایسا پارٹی سسٹم بنانے میں ناکام رہا جس کی موجودگی ملک کے دوسرے بازو میں بھی ہو۔ تیزی سے کمزور ہوتی ہوئی مسلم لیگ 1954ء میں مشرقی پاکستان میں دم توڑ گئی۔ اس کے بعد ہر پارٹی یا مشرقی بازو میں اپنی موجودگی، رکنیت، قیادت اور عوامی حمایت رکھتی تھی یا مغربی بازو میں۔ ایک ایسے وفاق جس کے دونوں دھڑے ایک ہزار میل کی مسافت پر ہوں، اور جس میں ایک بھی قومی سیاسی جماعت نہ ہو، پر حکومتی نظم و نسق قائم کرنا ارسطو

کی عقل سے بھی بعید ہوگا۔

(12) یحییٰ خان نے صورت حال سے بہت برے طریقے سے نمٹنے کی کوشش کی، لیکن ان پر فوج کی طرف سے شدید دباؤ تھا۔ مشرقی پاکستان میں کی گئی کارروائی کے نتیجے میں پاکستان کا خون ہوگیا۔

(13) پاک فوج کسی طور جنگ لڑنے کی تیاری نہیں رکھتی تھی۔ اب جبکہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ امریکہ میں شائع ہوچکی ہے، اور اس کی تحقیقات اور سفارشات اور خلاصہ پاکستانی اخبارات میں چھپ چکے ہیں تو سچ بولنے میں کوئی شرمندگی یا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔

(14) بھارتی مداخلت کوئی یک لخت آنے والا بھونچال نہیں تھا؛ ہر کسی کو اس کی توقع تھی۔ اس نے پیشگی نوٹس دے دیا تھا۔ لیکن اگر بھارت ایسی کارروائی نہ کرتا تو کیا پاک فوج بنگالیوں کو شکست دے سکتی تھی؟ کیا وہ صوبے پر قبضہ کرکے اسے مسلسل محاصرے میں رکھ سکتی تھی؟ اور اگر کر سکتی تھی تو کب تک؟

(15) اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ووٹنگ کے باوجود عالمی رائے عامہ پاکستان کے خلاف تھی۔ یورپ اور امریکہ تو ایک طرف، کسی اسلامی ملک نے بھی نئی دہلی سے اپنے سفیر کو واپس نہ بلایا۔ یہ ہماری خارجہ پالیسی کی مکمل ناکامی تھی۔

(16) مشرقی پاکستان کی علیحدگی ناگزیر دکھائی دیتی تھی۔ مندرجہ بالا عوامل کے علاوہ مغربی پاکستانیوں نے بنگالیوں کے دل میں ایسی نفرت پیدا کردی تھی کہ اس کا کوئی اور حل ممکن ہی نہیں تھا۔

جنرل ضیاالحق کا شب خون

درسی کتب میں جنرل ضیاالحق کے جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کا مارشل لا لگانے کا بیان اتنا ہی سادہ، یک طرفہ اور گمراہ کن ہے جتنا 1971ء کے واقعات کا۔ ہر عمر کے طالب علموں کے کانوں میں یہ تصورات انڈیلے جاتے ہیں: (1) حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو پا رہی تھی؛ (2) کسی وجہ سے ملک سیاسی بدنظمی کا شکار تھا؛ (3) امن و امان کو کنٹرول کرنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا؛ (4) ذوالفقار علی بھٹو بہرحال ایک آمر تھے، اور انھوں نے عوام کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے کچھ

ہیں کیا گیا تھا؛ (5) نظام مصطفیٰ تحریک ایک عوامی تحریک تھی؛ اور (6) حکومت مخالف احتجاج سے عوام کی اس عزم کی جھلک ملتی تھی کہ وہ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ ان حالات میں مسلح افواج کے پاس کوئی آپشن نہ تھا؛ شب خون ناگزیر تھا، اور یہی مسئلے کا درست حل تھا۔

مندرجہ بالا ہر بیان پر سوالات اٹھتے ہیں۔ میں ان پر یکے بعد دیگرے، ترتیب کے ساتھ بحث کرتا ہوں۔

(1) مذاکرات میں شریک کئی سیاست دانوں نے بعد میں اپنا نکتہ نظر شائع کیا۔ اکثر کا کہنا ہے کہ کوئی معاہدہ طے پا گیا تھا، لیکن اصغر خان نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر پھر سے مذاکرات کا منصوبہ بنا۔ ہر کوئی بات چیت کے لیے تیار تھا، لیکن فوج نے جنرل ضیاالحق کی صورت وار کر کے سب کچھ تہ و بالا کر دیا۔ ایسی واقعاتی شہادت موجود ہے کہ حکومت مخالف احتجاج ضیاالحق کی شہ پر ہو رہا تھا، یا کم از کم اُن کی در پردہ حمایت موجود تھی۔ شب خون کے بعد اُن کے متعدد بیانات ریکارڈ پر ہیں جن میں انھوں نے نام نہاد نظام مصطفیٰ تحریک کے محرکات، تصورات اور اس دوران دی گئی قربانیوں کو سراہا۔ بعد میں اُنھوں نے پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) کے تمام اہم رہنماؤں کو اپنی کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اُن میں سے اکثر نے یہ دعوت قبول کر لی۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیا نے سب سے کہا کہ وہ حکومت سے نکل جائیں تو سب نے بلا چون و چراں حکم مان لیا۔ تابعداری کے اس مظاہرے کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ فرماں روا کون تھا، اور فرماں بردار کون تھے۔ اگر وہ انتخابی دھاندلی کے خلاف احتجاج کرنے والے جمہوریت پسند رہنما ہوتے تو وہ ایک فوجی آمر کو کسی طور برداشت نہ کرتے، چہ جائیکہ اُس کے ہاتھوں فوجی اقتدار کے مہرے بن جاتے جبکہ جنرل ضیا انتخابات کا وعدہ توڑتے رہتے۔

(2) سیاسی بدنظمی حکومت اور اپوزیشن کے مذاکرات کی ناکامی کی وجہ سے نہیں تھی۔ گلی محلے کی سیاست میں مظاہرے اور احتجاج ہوتا رہتا ہے۔ جب پی این اے نے تحریک شروع کی تو ہی ملک میں احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔

(3) امن و امان کی صورتِ حال کسی مرحلے پر بھی ہاتھ سے نہیں نکلی تھی۔ ریاست کی عملداری قائم کرنا ناممکن نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے کہ جلسے ہنگامہ خیز ہوتے جا رہے تھے؛ زندگی پریشانی کا

شکار تھی؛ کچھ مقامات پر مارشل لا لگایا گیا تھا۔ لیکن ایسے ہی حالات 1953ء میں احمدی مخالف تحریک کے دوران بھی تھے، لیکن اُس وقت کسی جنرل نے حکومت کا تختہ نہیں الٹا تھا۔ ضیا کا یہ دعویٰ کہ ملک خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا، مارشل لا لگانے کا ایک بہانہ تھا۔

(4) اس الزام کے پلڑے میں وزن رکھنا بہت مشکل ہے کہ بھٹو ایک آمر تھے، اور اُن کی حکومت نے عوام کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ پارلیمنٹ میں ملک کی ایک اکثریتی پارٹی کے منتخب شدہ رہنما تھے۔ مسٹر جناح کے بعد وہ سیاسی منظرنامے پر ابھرنے والے سب سے پرکشش رہنما تھے۔ ٹھیک ہے کہ اُن میں کچھ خامیاں تھیں؛ وہ من مانی کرنے کے عادی تھے؛ تنقید برداشت نہیں کرتے تھے؛ [illegible] ''ساکھ'' پر شک میں پڑ جاتے؛ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد؛ بسا اوقات خودسر؛ اور اپنے حریفوں کے ساتھ دوستی کرنے سے گریزاں رہتے تھے۔ اُن کی کچھ پالیسیاں یا تو غلط تھیں، یا برے طریقے سے نافذ کی گئیں۔ لیکن اُنھوں نے اپنے عوام کے لیے بہت کچھ کیا، گو اتنا نہیں جتنی عوام کو توقع تھی۔ بایں ہمہ وہ ملک کے سب سے مقبول رہنما تھے، اور اُن کے وفادار حامیوں نے اُن کے اقتدار سے الگ ہونے، اور حتیٰ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ لیکن فرض کریں وہ ایک اچھے وزیر اعظم نہیں تھے، اور اُن کی پالیسیاں اچھی نہیں تھیں، تو کیا فوج کے پاس اُن کی حکومت کا تختہ الٹنے اور مارشل لا لگانے کا یہ جواز کافی تھا؟

(5) نظامِ مصطفیٰ تحریک ایک مسلک، اور پھر اس کے بھی بہت کم لوگوں کی تحریک تھی۔ بہت سے شہری علاقے پرسکون تھے۔ دیہاتی علاقوں میں اس کا کسی کو علم تک نہ تھا۔ اگر یہ وسیع پیمانے پر چلنے والے عوامی تحریک ہوتی تو کابینہ میں عارضی بنیادوں پر ملنے والی چند سیٹوں پر خود کو فروخت کردینے کی بجائے یہ ضیا کو انتخابات کرانے پر مجبور کردیتی۔

(6) وہ احتجاج مبینہ انتخابی دھاندلی کے خلاف تھا؛ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اسلامی نظام کا مطالبہ بعد میں سوچا گیا تھا، اور اس کا مقصد ناخواندہ افراد کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ ایسے لوگ انتخابات کی باریکیوں کو تو نہیں سمجھتے لیکن اسلام کے نام پر بلند کیے گئے نعروں پر جوش میں آجاتے ہیں۔ وہ احتجاج قوم کے دل کی آواز نہیں تھا؛ بلکہ اس کے ذریعے قوم کے مذہبی جذبات کو اپنے مقاصد کے لیے بھڑکایا گیا تھا۔

جنرل ضیا الحق بطور پاکستان کے حکمران

نویں جماعت سے لے کر بی اے تک کی درسی کتابیں طلبہ کو جنرل ضیا کی فوجی حکومت کی پانچ شاندار خوبیوں سے آشنا کرتی ہیں: (1) ناگزیر وجوہات کی بنا پر انتخابات کو مسلسل ملتوی کرنے کا فیصلہ بالکل درست تھا؛ (2) اُنھوں نے ایمانداری سے اسلامی نظام، جس کا قائداعظم نے قوم سے وعدہ کیا تھا، نافذ کرنے کی کوشش کی؛ (3) اُن کے جاری کردہ اسلامی آرڈیننس نے پاکستان کی تخلیق کا حقیقی مقصد پورا کر دیا؛ (4) اُنھیں ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے تقدیر نے چن لیا تھا؛ اور (5) وہ ہمارے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

1988ء میں ضیا کی طیارہ حادثہ میں ہلاکت کے بعد سے پاکستانی اخبارات اور کتابوں میں اُن کے سیاہ دور کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ زیادہ تر نے اُن پر کڑی تنقید کی ہے کہ اُنھوں نے ملک کا حشر نشر کر دیا۔ میں اپنے تبصرے مندرجہ بالا توصیفی جملوں تک محدود رکھوں گا۔

(1) اُنھوں نے بار بار انتخابات کرانے کا وعدہ کیا، لیکن توڑ دیا۔ وعدوں کا لحاظ نہ رکھنے والے حکمرانوں کو عوام مسترد کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اُنھیں عہدے سے ہٹایا نہیں جا سکتا، کیونکہ اُن کا ہاتھ عوام کی نبض پر نہیں بندوق پر تھا۔ قرآن پاک ہر مسلمان پر وعدے کی پاسداری فرض قرار دیتا ہے، لیکن یہ مردِ مومن مذہبی ذمہ داری پر سیاسی مفاد کو ترجیح دیتا رہا۔ انتخابات نہ کرانے کی واحد ''ناگزیر وجہ'' یہ خوف تھا کہ وہ اقتدار، اور ممکنہ طور پر عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ غاصب حکمران احتساب سے خائف رہتے ہیں۔

(2) (a) ضیاالحق کے نزدیک اسلامی نظام اُن کے آرڈیننسز کا ہی نام تھا۔ اُنھوں نے وہ آرڈیننسز انتہائی شدت کے ساتھ نافذ کیے۔ لیکن قرآن پاک کے دیگر بہت سے احکامات جو ایک مہذب معاشرہ، مہربان ریاست، استحصال سے پاک معیشت اور ایک انصاف پسند قومیت، تشکیل دیتے ہیں، اُن کے نظام اسلام کا حصہ نہ تھے۔ اسے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوشش ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(b) قائداعظم نے قوم سے یہ وعدہ کبھی نہیں کیا تھا کہ ملک کو مسلح افواج چلائیں گی؛ نیز لوگ دن رات خوف کے سائے میں زندگی بسر کریں گے؛ اور یہ کہ حکمران پر تنقید کرنے یا محض ایک نعرہ

لگانے کی پاداش میں شہریوں کو جیل میں ڈال دیا جائے گا؛ پولیس خواتین پر تشدد کرے گی؛ پبلک کو خوفزدہ رکھا جائے گا؛ کتابوں پر پابندی لگا دی جائے گی؛ عوام کو آزادیٔ اظہار سے محروم رکھا جائے گا وغیرہ۔ مسٹر جناح ایک جمہوریت پسند لبرل تھے۔ اگر درسی کتاب کا مصنف جنرل صاحب کی یادیں جلائے رکھنے پر مصر ہے تو خیر، اُسے کم از کم بابائے قوم کو تو معاف کر دینا چاہیے۔

(3) پاکستان کی تخلیق کا حقیقی مقصد عوام کو قرون وسطیٰ کے نظام حکومت، اور حقیقی سے کی من پسند تشریح سے تراشی گئی راہوں پر لے جانا نہیں تھا۔ میں نے اس بات کی مندرجہ بالا پیراگراف میں وضاحت کر دی ہے۔

(4) جنرل ضیا الحق کو درسی کتب کے مصنفین مبارک باد دیتے ہوئے اُن کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ اوہ خدایا! میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

جمال الدین افغانی

اُن کا تعلق افغانستان سے تھا (این ڈبلیو ایف پی، جماعت پنجم، سندھ)۔ وہ افغانستان میں پیدا ہوئے (سندھ، جماعت ہفتم)۔ کئی ایک کتابیں جمال الدین افغانی کا تعلق نظریۂ پاکستان سے جوڑتی ہیں؛ اسلام کے عالمگیر تصور کا عظیم رہنما مانتی ہیں؛ اُن کی انڈین مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کو نمایاں کرتی ہیں؛ اور اُن کے کردار میں استعمار، خاص طور پر برطانوی سلطنت کے بے باک اور نڈر ناقد کا رنگ بھرتی ہیں۔

ایران اور مغرب میں کی گئی جدید تحقیق جمال الدین افغانی کی جائے پیدائش کے بارے میں پھیلی ہوئی فرضی کہانیوں کا پردہ چاک کرتی ہے۔ اب ہمیں علم ہوا کہ وہ افغانی سنی نہیں، ایرانی شیعہ تھے، اور وہ ایران کے شہر اسد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ مندرجہ کتابیں حوالے کے طور پر دیکھی جا سکتی ہیں:

Iraj Afshar and Asghar Mahdavi(eds),Documents inedit concernant Sayyed Jamal-al-Din Afghani, Tehran, 1963; H. Pakdaman, DJamal-Ed-Din Assad Abadi dit Afghani, Paris, 1969, and Nikki R.Keddie, An Islamic Response to Imperialism,

Berkeley and Los Angles, 1968, and Syyid Jamal al-Din "Al-Afghani": A Political Biography, Berkele and Los Angeles, 1972

اگر درسی کتب کے لیے جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا انتہائی ضروری ہے تو وہ ضرور کریں، لیکن پھر مندرجہ ذیل حقائق بھی طلبہ کو بتائیں۔

جمال الدین افغانی 1854ء سے 1857ء کے درمیان انڈیا میں تھے۔ اس کے بعد وہ 1869ء میں یہاں آئے، اور پھر 1880-81ء میں۔ ان سفروں کے دوران انھوں نے کئی تقاریر کیں، کئی مضامین لکھے۔ ان میں سے کچھ 1884ء میں ''مقالاتِ جمالیہ'' کے نام سے کلکتہ میں شائع ہوئے۔ یہ مکالمات اُن کے انڈیا کے بارے میں تصورات کا حقیقی ریکارڈ ہیں۔ ان مقالوں میں وہ اسلام کی کسی عالمگیر تحریک، یا جغرافیائی حدود سے ماورا تمام مسلمانوں کو کسی ایک رہنما کی قیادت میں، یا کسی ایک ریاست، یا دولتِ مشترکہ میں اکٹھا کرنے کی بات نہیں کرتے۔ وہ اسلام کا ذکر صرف سرسید احمد خان پر تنقیدی حملوں کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے تین موضوعات سامنے آتے ہیں: (1) لسانی اور علاقائی بنیاد پر ایک قومیت کی وکالت۔ اس کا مطلب ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دینا ہے (جو جمال الدین افغانی کے نزدیک ایک ہی زبان بولتے تھے)۔ وہ انڈیا کے مسلمانوں اور دنیا کے دیگر ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے اتحاد کی کوئی بات نہیں کرتے۔ (2) فلسفہ اور جدید سائنسی علوم حاصل کرنے پر زور۔ (3) سرسید احمد خان کی شدید الفاظ میں مذمت۔ جمال الدین اُنھیں انگریز کا قابلِ نفرت پٹھو سمجھتے تھے۔

انڈین مسلمانوں کے اتحاد، یا اُن کی قومی وحدت کی بات کرتے ہوئے وہ مذہب کا حوالہ نہیں دیتے۔ ایک مقام پر وہ کہتے ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان کا تعلق مذہب کے تعلق سے کہیں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہے کیونکہ مذہب تبدیل ہو جاتا ہے، زبان نہیں۔'' وہ کسی مقام پر بھی مسلمانوں کے معاملات کی بات نہیں کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ انڈیا کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ 8 نومبر 1882ء کو کلکتہ میں دیے گئے ایک لیکچر میں وہ کہتے ہیں: ''یقیناً میں انڈیا کے بیٹوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں؛ یہ انڈیا کے فرزند ہیں، انڈیا، جس نے انسانیت کو اپنی آغوش میں پالا ہے۔ انسانی اقدار انڈیا سے تمام دنیا میں پھیلی ہیں... یہ نوجوان انڈیا کے بیٹے ہیں۔ یہ

وہ سرزمین ہے جس نے دنیا بھر کو قوانین اور اصول دیے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ''رومن لا''، جو تمام مغربی ضابطوں کا بابا آدم ہے، ویداور شاستروں سے اخذ کیا گیا تھا۔''

پیرس سے شائع ہونے والے اپنے ایک رسالے ''al-Urwa al-wuthqa'' میں اُنھوں نے لکھا: ''مذہبی تعلق قومی روابط کی نفی نہیں کرتا۔ ایک قوم میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہو سکتے ہیں۔ مصر اور انڈیا جیسے ممالک میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور قومی مفاد کے معاملات میں مسلمانوں اور اُن کے دیگر ہم وطنوں، اور مختلف مذہب رکھنے والے ہمسایوں کے درمیان اچھے تعلقات ہونے چاہییں۔''

پیرس کے ایک رسالے ''L' Intransigeant'' میں 24 اپریل 1883ء کو شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون ''Lettre sur Hindoustan'' میں اُنھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی بات کی۔ اُنھوں نے انڈیا میں مذہب اور قومیت کے عمومی تصورات کی تبلیغ کی۔ وہ زبان کی طاقت پر یقین رکھتے تھے کہ یہ کسی قوم کو اکٹھا کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی قومیت بھی اس وقت توانا ہوگی جب اُن کی زبان ایک ہوگی۔ اُن کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ قومیت مذہب پر بالا دستی حاصل کر لیتی ہے۔ مزید حوالہ جات کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں دیکھیے:

Muhammad al-Makhzumi, Khatirat Jamal al-Din, Beirut, 1931; Mehdi Hendessi, 'Pages peu connues di Djamal al-Din al-Afghani', Orient, no.6(1958); Sati al Husri, Mahiya al-qawmiyya, Beirut, 1959; and Rashid Rida, Tarikh al-ustad al-imam al-shaikh Muhammad Abduh, Cairo,Vol.1, 1931

جمال الدین افغانی کے استعماریت پر تصورات تضادات سے بھرے ہوئے ہیں۔ 1878ء میں اُنھوں نے برطانیہ پر ایک سخت تنقیدی مضمون لکھا، جو اسکندریہ کے رسالے ''مصر'' میں شائع ہوا۔ اس میں اُنھوں نے تیز و تند جملے لکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ 1885ء میں ''La Correspondance Parisienne'' کے ایڈیٹر کے ساتھ انٹرویو میں اُنھوں نے برطانوی سلطنت کے لیے ''ظلم''، ''بربریت''، اور ''غداری''، جیسی اصلاحات استعمال کیں۔ لیکن اُسی برس

جمال الدین نے انڈیا کے سیکرٹری آف اسٹیٹ، رانڈ ولف چرچل کو ایک تجویز پیش کی کہ برطانیہ، افغانوں، ایرانیوں، ترکوں، مصریوں اور عربوں کو ایک الائنس قائم کر کے روسیوں کو مرو (سلک روٹ پر واقع ایک اہم ایرانی شہر) سے مار بھگانا چاہیے۔ دس سال بعد استنبول سے برطانوی حکومت کو خط لکھ کر انہیں ترک سلطان سے بچانے کی درخواست کر رہے تھے (برطانوی آرکائیوز)۔

جمال الدین افغانی کا انڈیا کے شمال مغرب میں کسی قسم کا پاکستان قائم کرنے کا افسانہ آئی ایچ قریشی، شریف المجاہد اور سید شریف الدین پیرزادہ کا تراشا ہوا ہے۔ اس تصور کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ جب تک ہمارے سامنے کوئی نئی دستاویزات نہیں آ جاتیں، جمال الدین افغانی کے تصورِ پاکستان کو اس تخیل کا شاخسانہ سمجھنا چاہیے جو پاکستان کی بنیاد انتہائی انوکھی اور غیر معمولی مقامات پر تلاش کرنے کی کوشش سے باز آنے والا نہیں۔

عبدالحلیم شرر

1890ء میں اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ انڈیا کو ہندو صوبوں اور مسلم صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے (وفاقی حکومت، بی اے)۔

عبدالحلیم شرر نے یہ مطالبہ اپنے اردو ہفت روزہ میگزین ''مہذب'' کے 23 اگست 1890ء کے اداریے میں کیا تھا۔ اُنھوں نے لفظ ''اضلاع''، نہ کہ صوبے استعمال کیا تھا۔ ڈاکٹر اے ایس خورشید نے پہلی مرتبہ شرر کا یہ بیان دریافت کیا تھا، لیکن اُن سے ترجمے کی غلطی ہوگئی، اور اُنھوں نے ضلع کا ترجمہ Prvince کر دیا۔ یہ غلطی درست ہونی چاہیے۔

سر تھیوڈور موریسن

ان کی کتاب (جس کا حوالہ دیا جاتا ہے لیکن نام نہیں بتایا جاتا) 1818ء میں شائع ہوئی؛ ان کے نام موریسن کو مسلسل مارلین لکھا گیا ہے (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بی اے)

سر تھیوڈور موریسن (1863-1936) ایم اے او کالج علیگڑھ کے پرنسپل تھے (1899-1905)۔ وہ وائسرائے کی دستور ساز کونسل کے 1903-04، اور کونسل آف انڈیا

کے 16-1906 تک ممبر رہے۔ جس کتاب کا ہماری درسی کتب میں نام لیے بغیر حوالہ دیا جاتا ہے، وہ Imperial Rule in India ہے۔ یہ کتاب لندن میں 1899ء میں شائع ہوئی تھی۔

سر محمد اقبال

اُنھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی (این ڈبلیو ایف پی، جماعت پنجم، ہفتم)۔ اُنھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کیمبرج اور لندن یونیورسٹیوں سے حاصل کی (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جماعت سوئم)۔ اُنھوں نے بیرسٹری کی ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی (این ڈبلیو ایف پی، جماعت پنجم، سندھ، جماعت پنجم، این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہفتم)۔ اُنھوں نے قانون کی ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

مندرجہ بالا بیانات کی ترتیب کے مطابق تصحیح:

(1) اُنھوں نے فلاسفی کی ڈگری میونخ یونیورسٹی، جرمنی سے حاصل کی۔

(2) کیمبرج یونیورسٹی نے اُنہیں ریسرچ سرٹیفکیٹ دیا، جو کہ ڈگری نہیں تھا۔

(3) وہ بار ایٹ لا تھے، جو کہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں۔ ایک بیرسٹر نہ تو گریجویٹ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کوئی اور سند رکھتا ہے۔

(4) اُنھوں نے کسی ملک سے قانون کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔

چوہدری رحمت علی

اُنھوں نے اقبال کی 1930ء میں تجویز کردہ ریاست کو پاکستان کا نام دیا (پنجاب، جماعت ہشتم)۔ اُنھوں نے قراردادِ لاہور کے تحت قائم کی جانے والی ریاست کا نام پاکستان تجویز کیا (وفاقی حکومت، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ اُن کی 'پاکستان نیشنل موومنٹ' اقبال کے مشورے سے شروع ہوئی (وفاقی حکومت، بی اے)۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب اور صحافی تھے (وفاقی حکومت، بی اے)۔ اپنے ''اب یا کبھی نہیں'' میں اُنھوں نے انڈیا کے مسلم اکثریتی علاقوں کی علیحدگی کا مطالبہ کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ اُن کی سکیم کو گول میز کانفرنس کے وفد نے مسترد کر دیا تھا (پرائیویٹ،

وہ تعلیم حاصل کرنے 1927ء میں انگلینڈ چلے گئے (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ انھوں نے ڈبلن یونیورسٹی سے بار ایٹ لا کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ انھوں نے اپنا آرٹیکل "اب یا کبھی نہیں" جنوری 1933ء میں شائع کیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ آپ کا انتقال 12 جنوری 1951ء کو یورپ میں ہوا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔ انہیں ووکنگ میں دفن کیا گیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ رحمت علی نے اقبال کی تجویز کردہ ریاست نام پاکستان رکھا تھا، یا قرارداد لاہور کے مطالبے کو پاکستان کہا تھا (انھوں نے نام 1933ء میں نکسال کیا تھا، جبکہ قرارداد 1940ء میں منظور ہوئی)۔ انھوں نے اپنی تحریک اپنے طور پر شروع کی تھی، نہ کہ اقبال کے مشورے سے۔ وہ نہ تو ادیب تھے اور نہ ہی صحافی؛ وہ ایک سیاسی مفکر اور پمفلٹ نویس تھے۔ اُن کی 1933ء کی تجویز تمام مسلم اکثریتی علاقوں کا نہیں، صرف انڈیا کے شمال مغربی علاقوں کا ذکر کرتی ہے۔ اُن کے منصوبے کو گول میز کانفرنس کے وفد نے نہیں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی برائے انڈین آئینی اصلاحات کے سامنے پیش ہونے والے گواہوں نے مسترد کیا تھا۔ وہ تیس یا اکتیس اکتوبر 1930 کو انگلینڈ گئے، نہ کہ 1927ء کو۔ انھوں نے بار ایٹ لا کی نہیں، ایل ایل بی کی ڈگری ڈبلن یونیورسٹی سے حاصل کی۔ "اب، یا کبھی نہیں" ایک پمفلٹ تھا، نہ کہ ایک مضمون۔ وہ یورپ میں نہیں، کیمبرج، انگلینڈ میں تین فروری، نہ کہ بارہ فروری کو فوت ہوئے۔ اُن کی تدفین ووکنگ میں نہیں، نیو مارکیٹ روڈ سمٹری، کیمبرج میں ہوئی۔

ثبوت اور درست معلومات کے ذرائع کے لیے میری کتاب "رحمت علی: سوانح عمری" شائع شدہ وین گارڈ، لاہور، 1987ء پڑھیں۔

محمد علی جناح

انھوں نے انگلینڈ سے قانون کی ڈگری حاصل کی (مغربی پنجاب، جماعت دوم، این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہفتم، پرائیویٹ، لاہور، انگلش، بی اے)۔ انھوں نے انگلینڈ سے قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی (این ڈبلیو ایف پی، جماعت چہارم، سندھ، جماعت چہارم)۔ انھوں نے انگلینڈ

سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی (پرائیویٹ، کراچی، جماعت دوم)۔ اگست 1947ء کو مشکور و ممنون قوم نے انہیں پاکستان کا گورنر جنرل بنایا (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جماعت ہفتم)۔

(1) محمد علی جناح نے انگلینڈ یا کہیں سے بھی قانون کی کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔

(2) ''قانون کی اعلیٰ ترین ڈگری'' صرف درسی کتابیں لکھنے والوں کے تخیل کی طباعت ہے۔

(3) مسٹر جناح نے انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ لنکنز ان میں 1896ء میں بیرسٹر بنے تھے۔ پاکستانی پروفیسرز یہ سمجھنے سے قاصر کیوں ہیں کہ بیرسٹر بننا کوئی تعلیمی ڈگری نہیں ہے؟

(4) قوم جتنی بھی مشکور و ممنون سہی، اس نے انہیں پاکستان کا گورنر جنرل نہیں بنایا تھا۔ قوم نے نہ تو انہیں نامزد کیا تھا اور نہ ہی منتخب۔ مسٹر جناح نے خود کو اس منصب کے لیے پیش کیا، اور برطانوی بادشاہ نے اُن کی تقرری کی۔

لیاقت علی خان

انہیں پاکستانی قوم نے ''قائدِ ملت'' کا لقب دیا (پرائیویٹ، کراچی، جماعت اول)۔ انہیں قوم نے ''قائدِ ملت'' اور ''شہیدِ ملت'' کے القاب سے نوازا (پرائیویٹ، کراچی، جماعت دوم)۔

یہ دونوں بیانات غلط ہیں۔ قوم نے انہیں کسی لقب سے نہیں نوازا تھا۔ کچھ اخبارات اور یوپی سے تعلق رکھنے والے چند ایک مسلم لیگیوں نے انہیں ان القاب سے پکارنا شروع کیا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

وہ 1946ء میں انڈیا کے گورنر جنرل بن کر آئے (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ہشتم)۔

ماؤنٹ بیٹن کی تقرری برطانوی وزیر اعظم نے اپنے مشہور بیان میں 20 فروری 1947ء میں کی۔ وہ وائسرائے کے طور پر 22 مارچ 1947ء کو انڈیا پہنچے۔

کلیمنٹ رچرڈ اٹلے

1947ء میں لارڈ اٹلے برطانیہ کے وزیر اعظم تھے (پنجاب، جماعت نہم و دہم)۔ 1945-

میں برطانیہ میں لیبر پارٹی سے تعلق رکھنے والے وزیر اعظم، لارڈ اٹلے اقتدار میں آئے (ایف ڈبلیو ایف بی، انٹرمیڈیٹ)۔

سی آر اٹلے 26 جولائی 1945ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم بنے تھے۔ وہ لارڈ نہیں تھے۔ انہیں مسٹر اٹلے کہا جاتا رہا۔ کئی سالوں کے بعد وہ ارل بن گئے، جیسا کہ تمام سابق برطانوی وزرائے اعظم ارل کہلاتے ہیں۔

''ایک پنجابی''

Confederacy of India-1939 نواب آف ممدوٹ کی تخلیق ہے (پرائیویٹ، بی اے، لاہور)

میاں کفایت علی نے کتاب ''کنفیڈریسی آف انڈیا'' تحریر کی تھی جبکہ اس کی اشاعت کے تمام اخراجات نواب سر شاہنواز خان آف ممدوٹ نے ادا کیے تھے۔ میاں کفایت علی پنجاب دستور ساز اسمبلی کے سیکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ ملازمت کے قواعد کے مطابق ایک سرکاری ملازم کے طور پر وہ کتاب شائع نہیں کر سکتے تھے، اس لیے اُنھوں نے قلمی نام ''ایک پنجابی'' اختیار کیا۔ نواب آف ممدوٹ نے کتاب نہیں لکھی تھی۔

انڈیا میں کوئی مسلمان نہیں

بھارت غیر مسلموں کا ملک ہے (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جماعت سوئم)۔

بوقت تحریر میرے پاس درست اعداد شمار نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد پاکستان کی کل آبادی سے زیادہ ہے؛ اس کا مطلب ہے کہ انڈیا پاکستان سے بڑا ''مسلم ملک'' ہے۔ لیکن جماعت سوئم کے طلبہ کو یہ بات بتانے کی منطق یا ضرورت میری سمجھ سے باہر ہے۔ انڈیا کو ایک دشمن ملک ثابت کرنے کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں۔

این ڈبلیو ایف پی کا غلط نام

نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پروونس کو نارتھ ویسٹرن پروونس لکھا گیا ہے (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

دونوں صوبے مکمل طور پر دو مختلف یونٹس ہیں، اور اس وقت یہ دو مختلف ممالک میں موجود ہیں۔ چونکہ پاکستان کی مروجہ دانائی میں یہ غلطی غیر معمولی نہیں، اس لیے مجھے شمال مغربی صوبوں کی وضاحت کرنی پڑے گی۔

جب انگریزوں نے شمالی انڈیا کو فتح کیا تو یکم جون 1836ء کو شمال مغربی صوبوں کے یونٹس تخلیق کیے گئے۔ انہیں ایک لیفٹیننٹ گورنر کنٹرول کرتا تھا۔ 15 فروری 1877ء کو اودھ بھی ان میں شامل ہوگیا۔ 22 مارچ 1902ء کو صوبے کا نام تبدیل کر کے شمال مغربی صوبے آف آگرہ اور اودھ رکھا گیا۔ 3 جنوری 1921ء کو ان کا نام دوبارہ تبدیل کر کے 'یونائیٹڈ پروونس آف آگرہ اینڈ اودھ'' رکھا گیا (انہیں اختصار سے یوپی U.P کہا جاتا ہے)۔ ان صوبوں کو ایک گورنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ یہ معاہدہ 1947ء تک برقرار رہا۔

مورخین کو علم ہونا چاہیے کہ این ڈبلیو ایف پی میں ''ویسٹ'' ہے، جبکہ پرانے یوپی میں ''ویسٹرن'' ہے۔ نیز این ڈبلیو ایف پی واحد ہے، جبکہ نارتھ ویسٹرن صوبے ہیں (جمع کا صیغہ)۔

دیوبند اور تحریکِ پاکستان

تحریکِ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات ناقابل فراموش ہیں (پرائیویٹ، پشاور، بی اے)۔

اسٹاف، اساتذہ، طلبہ اور دارالعلوم دیوبند کے علما اسلام کے انتہائی دقیانوسی اور رجعت پسندانہ تصور پر یقین رکھتے تھے، اور اُنہیں اسی کی تعلیم دی جاتی تھی؛ یہی تصورات اُن کو ذہن نشین کرائے جاتے اور اگلی نسل کو منتقل کیے جاتے تھے۔ اُنھوں نے علیگڑھ سکول، یونیورسٹی اور تحریک کے خلاف کھلی جنگ کی۔ وہ اُن بنگالی معتدل مزاج رجحانات کے خلاف تھے جن کا اظہار کلکتہ محمڈن ادبی سوسائٹی، نواب عبدالطیف خان اور سید امیر علی کرتے تھے۔ دیوبند بدترین قسم کی مسلکی منافرت کی

...دوسرے ادا کرنا تھا۔ یہ منافرت اس قدر شدید تھی کہ ایک دیوبندی کسی بریلوی امام کے پیچھے نماز تک ...ا کرتا تھا۔ دیوبند انڈین اسلام کی پہلی شاخ تھی جو مخصوص مسلکی گروہ بندی پر یقین رکھتے تھے۔ ...غیر مسالک اور فرقے ابھرے تو اُنھوں نے بھی یہی راہ اختیار کی۔ اس کے نتیجے میں خونخوار فرقہ ...وجود میں آئی، اور جو ابھی تک تکفیری نظریات کی ترویج کرتے ہوئے اختلاف رائے، روشن ...اور آزاد سوچ کو دبانے کے درپے ہے۔

...سیاست میں تحریک دیوبند متحدہ انڈین قوم پرستی پر یقین رکھتی تھی۔ اس نے مسلم لیگ کے خلاف ...گریس کا ساتھ دیا؛ جداگانہ انتخابات کے مطالبے کی مخالفت کی؛ جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی جو کانگرس ...کا دارتھی؛ اور آخری برسوں میں تحریکِ پاکستان کے راستے میں ہر ممکن مزاحمت کی۔ (تفصیل کے ...لیے ضیاالحسن فاروقی کی ''دیوبند مکتبہ فکر اور تحریکِ پاکستان''، لندن اور بمبئی، 1963ء پڑھیں۔ یہ ...کتاب دیوبند تحریک کی مسلم لیگ کے موقف کی مخالفت کا بھرپور جواز پیش کرتی ہے)۔

دیوبند نے ہندوستان کی اسلامی سوچ میں گہری دقیانوسیت بھر دی۔ اس کی تعلیمات کی وجہ ...سے روایت نے عقل کا؛ حرف نے روح کا؛ اور سند نے اجتہاد کا گلا گھونٹ دیا۔ جدید جمہوریت کی ...جگہ ملائیت؛ اور لبرل ازم جگہ تنگ نظری نے لے لی۔ ظاہری دکھاوے نے علم کا گلا گھونٹ دیا؛ کلاسیکل ...قوانین کو ہمیشہ کے لیے اٹل سمجھ لیا گیا؛ رسومات کی ادائیگی کو مذہب کا حتمی مقصد قرار دے دیا گیا۔ ...فتوے کا بے دریغ استعمال کیا جانے لگا؛ تعصب کو علم کا درجہ مل گیا۔ جب اس مکتبہ فکر کے سرخیل ہجرت ...کرکے پاکستان آئے تو متعصبانہ نظریات اور مذہبی شدت پسندی بھی اپنے ساتھ لائے اور ملک کے ...سیاسی ماحول کو ہمیشہ کے لیے مکدر کر دیا۔

...درسی کتاب کہتی ہے کہ دیوبند کی تحریکِ پاکستان کے لیے ناقابل فراموش خدمات ہیں۔ یقیناً ...! بھلائے نہیں بھولتیں۔

نظریۂ پاکستان کے بانی

مولانا محمود الحسن اور مولانا مودودی کا شمار نظریۂ پاکستان کے بانیوں میں ہوتا ہے (وفاقی ...حکومت، بی اے)۔

محمود الحسن (1851-1920) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہونے والے پہلے طالب علم تھے۔ انھوں نے 1867ء میں دارالعلوم میں داخلہ لیا، جہاں سے انھوں نے 1873ء میں گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی۔ پھر انھوں نے اسی ادارے میں تدریسی فرائض سرانجام دینا شروع کر دیے۔ 1906ء میں رشید احمد گنگوہی کی جگہ اس کے پرنسپل بن گئے، اور 1916ء تک اسی منصب پر موجود رہے۔ انھوں نے 1920ء میں مسلمانوں سے کہا کہ وہ کانگرس میں شامل ہو کر سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیں۔ اسی سال انھوں نے جمعیت علمائے ہند کے دہلی میں منعقد ہونے والے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ انھوں نے جامعہ ملیہ کے افتتاحی اجلاس کی بھی صدارت کی تھی۔ محمود الحسن دیوبند مکتبہ فکر کی مخصوص پیداوار تھے، جس کے اوصاف میں نے گزشتہ پیراگراف میں بیان کیے ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی (1903-80) نے سکول کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی؛ بجنور سے شائع ہونے والے ایک قوم پرست مذہبی رسالے "مدینہ" کے سٹاف میں کچھ دیر تک کام کیا؛ جبل پور کے "تاج" کے مدیر رہے؛ دہلی کے "الجمعیت" (جو جمعیت علمائے ہند کا ترجمان رسالہ تھا) کے سٹاف میں شامل رہے؛ اور پھر 1928ء میں حیدر آباد گئے جہاں سے اپنا رسالہ "ترجمان القرآن" جاری کیا۔ اُنھوں نے 1938-39ء میں لاہور کے اسلامیہ کالج میں دینی تعلیم دی۔ اس کے بعد وہ دارالسلام، ضلع گورداسپور میں چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے 1941ء میں جماعت اسلامی قائم کی۔ مولانا مودودی 1947ء میں پاکستان چلے آئے، اور اپنی وفات تک یہیں قیام کیا۔

حیدر آباد میں مولانا مودودی نے نظام کی توجہ حاصل کر لی۔ اُنھوں نے زور دیا کہ ایک ہندو ریاست میں حکمرانی کرنے والے مسلم، جو اقلیت میں ہیں، کا کیا حق ہے۔ وہ یورپ میں فسطائی اور نازی تحریکوں کے فروغ سے بہت متاثر تھے۔ اُنھوں نے انڈین سیاست پر تبصرہ کرنے کے لیے فسطائی اور نازی تحریروں سے استفادہ کیا (جیسا کہ ترجمان القرآن کا دسمبر 1934 کا شمارہ)۔ وہ اس تصور کے قائل نہیں تھے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں، وہاں اُنہیں عوام کی مرضی سے حکومت بنانے کا حق حاصل ہوسکتا ہے۔ اُن کے نزدیک اگر پاکستان ایک ریاست بننے جارہا ہے جہاں جمہوریت رائج ہوگی تو پھر "یہ اتنی گندی جگہ (ناپاکستان) ہوگی جتنے برصغیر کے دیگر مقامات۔ اُن کا موقف تھا کہ "مسلم

تو پھر بھی خدا کی نظر میں اتنی معتوب ہے جتنی لادینی قومیت''۔ انھوں نے الزام لگایا کہ مسٹر جناح اسلام کی ابجد بھی نہیں جانتے ، اور وہ لادین مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ''قومیت کا اسلام کے ساتھ کوئی سروکار نہیں'' (Process of Islamic Revolution)۔ چنانچہ وہ صرف تحریک پاکستان سے دور رہے بلکہ اس کے خلاف بیان بازی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ کے رہنما ''اخلاقی طور پر مردہ'' ہیں، چنانچہ ان کے پاس اپنی تحریک کو اسلامی قرار دینے کا کوئی حق نہیں (''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، والیم تھری)۔ یہ 1947ء سے پہلے کی بات ہے۔

ان کے اسلامی نظام اور ریاست پاکستان کے متعلق نظریات کا خلاصہ اس طرح ہے:
سرکاری ملازمین کے لیے ریاست کا حلف اٹھانا ممنوع ہوگا تاوقتیکہ حکومتی نظام مکمل طور پر اسلامی بن جائے (نوائے وقت، 12 ستمبر 1948)۔ کشمیر میں جنگ جہاد نہیں (ایم سرور، مولانا مودودی کی تحریک اسلامی، لاہور، 1956، صفحات 332-331)۔ اسلام مسلمان پر رقبہ ملکیت میں رکھنے کی کوئی حد نہیں لگایا (مسلہ ملکیت زمین)، چنانچہ پاکستان میں زرعی اصلاحات نہیں ہوسکتیں۔ پیداواری ذرائع قومی ملکیت میں لینا ''بنیادی طور پر اسلامی تصورات کے منافی ہے'' (ایضاً)۔ لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کے زرعی اصلاحات کے پروگرامز غیر اسلامی ہیں (ڈان، سات جون، پچیس، انتیس، انتیس اور تیس جولائی، اور نو اگست 1950)۔ ایگزیکٹو، عدلیہ اور دستور ساز ادارے سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کر سکتے۔ خواتین کا سیاست اور ریاست کے انتظامی امور سے کوئی سروکار نہیں۔ مرد و زن کا اختلاط اور مخلوط تعلیم گناہ ہیں۔ اسلامی قانون کے چار ذرائع ہیں: قرآن پاک، سنت رسول ﷺ، خلفائے راشدین کی روایت اور اماموں کی وضع کردہ فقہ۔ اسلام میں سیاسی جماعتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ریاست کے سربراہ کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ صرف مسلمان ہی مکمل شہری ہوسکتے ہیں۔ کوئی عورت قومی اسمبلی کی ممبر منتخب نہیں ہوسکتی (اسلامی قانون اور آئین: اسلامی ریاست کا پہلا اصول)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی ریاست آمرانہ ہوتی ہے (اسلام کی سیاسی تھیوری)۔ کسی مسلمان کے لیے ایسی اسمبلی اور پارلیمنٹ کا ممبر بننا حرام ہے جو جدید دور کے جمہوری اصولوں کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو۔ ایسی اسمبلیوں کے لیے ہونے والے الیکشنز میں ووٹ

ڈالنا حرام ہے (رسائل و مسائل، جلد اوّل)۔

صرف علما ہی قرآن پاک کی تشریح کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان مذہب چھوڑنا چاہتا ہو تو ضروری ہے کہ وہ اسلامی ریاست سے نکل جائے۔ اگر وہ اس میں موجود رہتا ہے تو سزائے موت کا حقدار ہوگا (فری لینڈ ایبٹ سے انٹرویو، اسلامی دنیا)۔ قرآن پاک زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ شوہر تمام بیویوں کے ساتھ ''انصاف'' کر سکے، اور انصاف سے مراد ''حقوق کی فراہمی میں انصاف''، نہ کہ ''مساوی حقوق''۔

اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ یہ آراء وہ نظریہ پاکستان تشکیل دیتی ہیں جو جناح صاحب اور دیگر بانیان پاکستان رکھتے تھے تو اُسے اپنے دماغ کا معائنہ کرانا چاہیے۔

پاکستان کا قومی لباس

قومی لباس شلوار قمیص یا کرتہ اور شیروانی اور جناح ٹوپی ہے (این ڈبلیو ایف پی، جماعت نہم و دہم، سندھ، جماعت نہم و دہم، این ڈبلیو ایف پی، انٹرمیڈیٹ)۔ خواتین عام طور پر شلوار، قمیص اور دوپٹہ پہنتی ہیں (سندھ، جماعت نہم و دہم، این ڈبلیو ایف پی، انٹرمیڈیٹ)۔

اگر قومی لباس سے مراد ایسا خصوصی لباس ہے جو پر تکلف، سرکاری تقریبات اور رسومات کے مواقع پر پہنا جاتا ہے تو آدمیوں کے حوالے سے بیان کا پہلا حصہ ٹھیک ہے۔ اگر اس سے مراد روز مرہ معمول کے مطابق پہننے والا لباس ہے تو پھر یہ گمراہ کن ہے۔ جس کسی کو بھی سندھ، پنجاب اور پنجابی بولنے والے ہزارہ علاقے (این ڈبلیو ایف پی) سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو، وہ جانتا ہے کہ آدمیوں کی اکثریت تہ بند یا دھوتی باندھتی ہے، جبکہ جسم کے اوپری حصے پر کرتہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ زمیندار اور وڈیرے بھی یہی لباس استعمال کرتے ہیں۔ وہ شلوار قمیص اُس وقت پہنتا ہے جب وہ شہر، یا کسی تقریب میں جاتا ہے۔ شیروانی وہ بہت کم پہنتا ہے، اور وہ بھی سرد موسم میں۔ جناح کیپ کا ذکر تو بہت کیا جاتا ہے، لیکن ہر طرف پگ یا پگڑی دکھائی دیتی ہے۔

دیہاتی خواتین عام طور پر لہنگا، یا لاچہ یا تہ بند پہنتی ہیں، جس کے ساتھ کرتہ ہوتا ہے یا قمیص۔ کراچی یا دیگر کچھ شہروں میں ساڑھی بھی باندھی جاتی ہے۔

بہر حال درسی کتاب میں قومی لباس پر بحث سے ریاست کے عوام پر سخت کنٹرول کا تاثر ملتا ہے۔ اس کا اور کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا۔

اردو زبان

وہ درسی کتابیں جو ایسے موضوعات کو چھیڑتی ہیں، اُنہیں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ زبان کے نام پر بڑے بڑے بے بنیاد دعوے کیے جاتے ہیں۔ ان دعووں کے تین گروہ نمایاں ہیں:

(1) وسیع پیمانے پر استعمال: اردو پورے جنوبی ایشیا میں بولی جانے والی زبان تھی (این ڈبلیو ایف پی، جماعت ششم)۔ 1947ء سے پہلے یہ جنوبی ایشیا کے شمالی حصوں کی زبان تھی، اور ابھی بھی ہے (این ڈبلیو ایف پی، جماعت نہم و دہم)۔ یہ برِصغیر میں عام بولی جانے والی زبان تھی (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، جماعت سوئم)۔ یہ واحد زبان ہے جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ آج بھی پشاور (پاکستان) سے لے کر راس کماری (انڈیا) تک برِصغیر کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے (پنجاب، انگلش، جماعت نہم و دہم)۔ یہ ملک کے تمام حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے (وفاقی حکومت، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ یہ برِصغیر کی زبان تھی (پرائیویٹ، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

یہ تمام بیانات انتہائی خود پسندی، جہالت اور ناسمجھی کا نتیجہ، اور حقائق کی بجائے غیر محتاط مفروضوں پر مبنی ہیں۔ سرکاری حب الوطنی کے جذبات ایسے بیانات کی اساس ہوتے ہیں۔ ہر دعوے سے مصنف کی اپنی لاعلمی جھلکتی ہے۔ ممکن ہے کہ طلبہ کم فہم اور سادہ لوح ہوں، لیکن اُن کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کے دماغ میں جھوٹ بھر دینے سے استاد کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن پوری قوم ژولیدہ فکری کا شکار ہو جائے گی۔

اردو کسی موقع پر بھی پورے جنوبی ایشیا میں بولی جانے والی زبان نہیں تھی۔ نہ یہ شمالی انڈیا کے باشندوں کی کبھی زبان رہی تھی، اور نہ ہی اب ہے۔ برِصغیر کے عام باشندے، جن کے بارے کہا گیا ہے کہ وہ بول چال کے لیے اردو زبان استعمال کرتے تھے، مدراسی، بنگالی، سندھی، پٹھان اور پنجابی تھے، یا پھر ان کا تعلق مہاراشٹرا اور مالابار سے تھا۔ حتیٰ کہ یہ پاکستان میں بھی ہر جگہ نہیں بولی جاتی۔ یہ صرف اُن جگہوں (جن کی تعداد بہت کم ہے) پر بولی جاتی ہے جہاں مہاجر طبقات مقیم ہیں۔

(2) قوتِ جاذبہ: اردو ایسی زبان ہے جس میں دنیا کی ہر زبان کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ اس زبان کی خوبی ہے کہ جب یہ کسی اور زبان کا کوئی لفظ قبول کرتی ہے تو اُسے اپنا بنا لیتی ہے (سندھ، جماعت نہم و دہم)۔ یہ ایک زبان کی نمایاں خوبی ہے کہ یہ دیگر زبانوں کے الفاظ کو نہایت عمدگی سے اپنے اندر سمو لیتی ہے (پنجاب، جماعت نہم و دہم)۔ اس کے جملوں کی ساخت اس طرح کی ہے کہ اس میں شامل دیگر زبانوں کے الفاظ اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ اس کی بجائے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ اسی کے ہوں (پنجاب، انگلش، جماعت نہم و دہم)۔

(i) میں نے نہیں دیکھا کہ اردو نے اپنے دامن میں سویڈش، سنہالی، تھائی یا فلپینو زبانوں کے الفاظ سمو رکھے ہوں۔

(ii) دیگر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر شامل کر لینے کی اردو کی منفرد خوبی کا تذکرہ ایک بچگانہ، بلکہ احمقانہ بات ہے۔ دنیا کی ہر زبان ایسا کر سکتی ہے، اور کرتی ہے۔ صرف انگریزی میں ہی عربی، فارسی، ہندی اور دیگر مشرقی زبانوں کے بے شمار الفاظ مل جائیں گے، جیسا کہ الکوحل، دیوان، ماربل، ٹیولپ، سواستیکا وغیرہ۔

(iii) میری سمجھ سے باہر کہ جملے کی ساخت (گرائمر) کس طرح غیر ملکی الفاظ کو مقامی الفاظ جیسا بناتی ہے؟ جملے کی ساخت جو بھی ہو، کیا مندرجہ ذیل الفاظ مقامی معلوم ہوتے ہیں: انجینئر، ریفریجریٹر، کرکٹ، کالج، کالونی، ٹاؤن شپ، فلیٹ، کوٹ، بورڈ، کمیٹی، کونسل، اسمبلی، بجٹ، بوٹ، نب، کیک (حالانکہ یہ روزمرہ بولے جانے والے عام الفاظ ہیں)۔

(3) قومی جدوجہد کی بنیاد: ہندو چاہتے تھے کہ اردو زبان برِصغیر سے ختم ہو جائے، لیکن اردو کے خاتمے کا مطلب پوری مسلم قوم کا خاتمہ تھا۔ انڈین مسلمانوں نے یہ بات بہت اچھی طرح محسوس کر لی۔ چنانچہ اُن کا ایک مقصد اردو کا تحفظ بھی تھا۔ اس حوالے سے پاکستان کا قیام اُن کے مطالبے کے طور پر سامنے آیا (پرائیویٹ، لاہور، بی اے)۔

برِصغیر کے مسلمان زندگی کے کئی ایک شعبوں میں کمزور تھے۔ وہ سیاست میں تمام عوامی اداروں مخصوص نشستیں، جداگانہ انتخابات، سرکاری ملازمتوں میں زیادہ نمائندگی، فیصلہ ساز مراکز میں زیادہ کوٹے کی صورت تحفظ چاہتے تھے۔ مذہب کے حوالے سے وہ چاہتے تھے کہ انہیں مذہبی رسومات

کی ادائیگی اور تبلیغ کی اجازت ہو؛ مساجد کے سامنے موسیقی نہ بجائی جائے؛ سکول کے نصاب میں مذہب کی بنیادی تعلیمات شامل ہوں؛ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ پڑھائی جائے، وغیرہ۔ ثقافت میں وہ سماجی رسومات، روزمرہ کی زندگی، مساوی شہریت اور اردو بطور مسلمانوں کی زبان کا تحفظ چاہتے تھے۔

اس مسخ شدہ مبالغہ آرائی کہ اردو کے خاتمے کا مطلب مسلمان قوم کا خاتمہ ہوتا، کے علاوہ مصنف نے اردو کے تحفظ کو قیام پاکستان کے مطالبے کی بنیادی اینٹ قرار دینے کی ایک اور غیر منطقی اور احمقانہ کوشش کی ہے۔ بنگالی، سندھی اور پٹھان اردو کی کوئی پروا نہ کرتے۔ اردو کے دفاع میں صرف پنجابی ہی یوپی والوں کا ساتھ دیتے۔ مسلمانوں اور انگریزوں، اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے دوران میز پر رکھے جانے والے بہت سے موضوعات میں اردو بھی شامل تھی، لیکن اس کا نمبر اس فہرست میں بہت نیچے تھا۔ مسلم لیگ نے اردو کے تحفظ کا مطالبہ کرنے کی کئی ایک قراردادیں پیش کیں، لیکن اردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دینے کے لیے کوئی قراردسامنے لانے سے گریز کیا۔

پاکستان زبانوں کے ماخذ

اردو کی مدح سرائی کے عمومی رجحان کے علاوہ انگلش میں تحریر کردہ دو کتابیں (انٹرمیڈیٹ کی) ہمیں تاریخ اور پاکستانی زبانوں کے ارتقائی مدارج پر اپنی تحقیق سے مستفید کرتی ہیں۔ وفاقی حکومت پوری اتھارٹی سے اعلان کرتی ہے کہ پاکستانی زبانوں کے ماخذ ''مذہبی موضوعات'' میں تلاش کیے جاسکتے ہیں (وفاقی حکومت، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔ عربی کے ایک پروفیسر صاحب چاہتے ہیں کہ ہم یقین کرلیں کہ پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی اُسی ثقافتی عوامل اور نظریات کی پیداوار ہیں جو اردو کو معرضِ وجود میں لانے کا باعث بنے (پرائیویٹ، لاہور، انگلش، انٹرمیڈیٹ)۔

تحقیقات چھوڑیں، اس کتاب کے مندرجات ہمیں باور کراتے ہیں کہ وفاقی حکومت نہ انگلش جانتی ہے اور نہ اسے پاکستانی زبانوں کا کچھ علم ہے۔ ''زبانوں کے ماخذ کا مذہبی موضوعات میں کھوج لگانا'' بذاتِ خود الفاظ کا ایک ناقابلِ فہم گورکھ دھندہ ہے۔ عربی کے پروفیسر صاحب یہ وضاحت نہ

کر سکے کہ اردو نے ایک مذہبی تصور سے کس طرح جنم لیا تھا؟ اردو مسلمان فاتحین کی زبانوں (فارسی اور ترکش) اور شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کے ناگزیر ادغام سے وجود میں آئی تھی۔ مثال کے طور پر پنجابی اس سے کہیں پرانی زبان ہے۔ اس کے ابتدائی ماخذ کے بارے میں مورخین اور ماہر لسانیات بھی پورے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اسلام کا پنجابی کے ابتدائی ماخذ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلوچی اور پشتو کی بھی یہی صورت حال ہے۔ کیا پروفیسر صاحب وضاحت کر سکتے ہیں کہ عربی کا ماخذ کون سا مذہبی تصور تھا؟ زبانیں تاریخ، جغرافیہ، ہجرت، دو یا زیادہ قوموں کے ملنے، عوام کی ضروریات، ماضی، ثقافتی ضروریات اور ان جیسے بہت سے مشکل اور تکلیف دہ عوامل کے دباؤ کے تحت آہستہ آہستہ ارتقاء پذیر ہوتی ہیں۔ انہیں کسی مذہبی ماخذ سے کشید نہیں کیا جاتا۔ لیکن کیا کیا جائے، یہ ماخذ ہمارے درسی کتب کے مصنفین کے ذہنوں کا ہر آن احاطہ کیے ہوئے ہیں۔
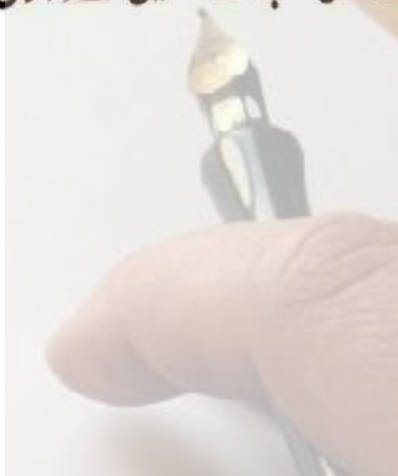
3

تباہی کا راستہ

اب تک تاریخ کی درسی کتب کی جانچ کے دو مراحل طے کیے گئے ہیں: غلطیوں کی نشاندہی ،اوران کی تصحیح؛ جسے ایک منفرد کاوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک ہمہ گیر اور جنرل نوعیت کا جائزہ بھی درکار ہے کہ ایک درسی کتاب دیکھنے میں کیسی لگتی ہے۔

اگر ہم مواد کی جانچ سے ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے ان کتابوں کی جلد بندی، اشاعت، طباعت اور مواد پیش کرنے کے انداز کا طائرانہ جائزہ لیں اور تاریخ نویسی، بچوں کی نفسیات، عوامی قبولیت اور کتابوں کے وسیع تر اثرات کو مدِ نظر رکھیں تو ذہن عجیب سی کوفت محسوس کرتا ہے۔ ایک کتاب دیکھ کر ذہن میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

1۔ کتاب کی ظاہری ساخت پر اتنی کم توجہ کیوں دی جاتی ہے، اور اس کا طالب علم کے ذہن پر کیا اثر پڑتا ہے؟

2۔ کتاب، چاہے انگریزی میں لکھی گئی ہو یا اردو میں، کا معیار اتنا پست کیوں ہوتا ہے؟

3۔ کتاب کا مواد قوم کو کیا نصیحت کرتا ہے؟

4۔ جب کتاب کسی چیز سے صرفِ نظر کرتی، یا لا پرواہی برتتی ہے تو ہمارے لیے اس میں کیا سبق ہوتا ہے؟

5۔ کتاب میں موجود تمام غلطیوں اور ناکامیوں کا بارِ ذمہ داری کس پر آتا ہے؟

6۔ ہمارے تعلیمی نظام میں زہریلے مواد کی آمیزش پر کیوں کسی نے احتجاج کرنے کی

زحمت نہیں کی؟

7۔ایسی کتاب کا استعمال طالب علم کی اخلاقی اور ذہنی رسائی کو کس طرح خطرے میں ڈالتا ہے؟

8۔کتاب کے ذریعے دیا گیا علم کس طرح مجموعی طور پر عوامی شعور میں اضافے کا باعث بنتا ہے؟

میں نے موجودہ، اور آنے والے اسباق میں ان اٹھ سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

گیٹ اپ

بچوں کی نفسیات سمجھنے میں کتابیں تیار کرنے والوں کی ناکامی دو خامیوں کی صورت سامنے آتی ہے:

گیٹ اپ، اور سٹائل

وزیر تعلیم سے لے کر ٹیکسٹ بک بورڈ کے سپروائزر تک، کسی کو بھی احساس نہیں کہ بچے کا زرخیز ذہن ایک خالی برتن کی طرح ہے۔ کسی نازک ترین کرسٹل سے بھی زیادہ حساس۔ اس میں معلومات اور پھر علم مرحلہ وار مقدار میں داخل کیے جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے بچے کے دل میں کتاب کی محبت پیدا جائے۔ خوبصورتی، چاہے کی عورت کی ہو یا پھول کی یا تصویر کی، محبت کے جذبات ابھارتی ہے۔ اگر بچے کی زندگی میں آنے والی پہلی کتاب آف وائٹ صفحات کا پلندہ ہو جسے بے ہنگم فولادی پن لگا کر جوڑا گیا ہو، اور وہ پن اُس کی انگلیوں کو زخمی کر دے، یا صفحات کو گوند لگا کر اس طرح جوڑا گیا ہو کہ ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد صفحے بکھر جائیں، تو وہ زندگی بھر کتابوں سے نفرت کرنے لگے گا۔ وہ کتابوں کو عارضی استعمال کی، جز وقتی چیز سمجھے گا۔ لیکن اگر کتاب پر کشش طریقے سے بہترین ملائم سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہو؛ رنگین تصاویر سے سجایا گیا ہو؛ مضبوط جلد بندی اور دیدہ زیب سرورق ہو تو وہ اسے بہت انہماک اور چاہت سے اپنے پاس رکھے گا؛ اسے دیکھے گا؛ اسے اپنا دوست سمجھے گا؛ اور ایک خزانہ سمجھ کر محفوظ کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے کہ وہ باقی زندگی کتابوں سے محبت کرنے والا انسان بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی سکول کی تعلیم میں کتاب کا گیٹ اپ بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن ہمارے ہاں وزیر تعلیم سے لے کر نیچے تک، کسی کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہیں، حالانکہ سب کے بچے سکول جاتے ہوں گے۔

ہماری درسی کتابوں کی چھپائی اور کاغذ کا معیار اتنا ناقص ہوتا ہے کہ مہذب ممالک کا کوئی گھٹیا سا اخبار بھی اس شکل میں شائع ہونے پر شرمندگی محسوس کرے گا۔ کاغذ یا تو اردو اخبارات میں استعمال ہونے والا "نیوز پرنٹ" ہوتا ہے (جس کی زندگی اخبار کی تازگی جتنی ہوتی ہے)، یا بہتر دکھائی دینے والا سفید کاغذ ہوتا ہے جو دیکھنے میں عمدہ لگتا ہے لیکن آسانی سے تہہ ہو کر خستہ ہو جاتا ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ بچہ اس کتاب کو ہر روز استعمال کرتا ہے (ہر ممکن طریقے سے)۔ وہ اسے اٹھا کر لاتا ہے؛ کھولتا ہے، بند کرتا ہے، گھما کر پھینک بھی دیتا ہے، فراش پر گراتا ہے، بائنڈنگ کی برداشت کی حد تک اسے کھولتا ہے، صفحات کے کونے مروڑتا ہے، دستیاب ہر جگہ اپنا نام، یا کچھ اور لکھتا ہے، اور جب اُسے غصہ آ جائے تو اسے پھاڑ کر پھینک بھی دیتا ہے۔ اس جنگلی بلے (پیار بھرا نام) کے ہاتھ پاکستانی کتاب ایک ہفتہ بھی نہیں چلتی۔ میرے پاس 1960ء کی دہائی میں معاشرتی علوم (اردو میڈیم) کی مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ کی شائع کی ہوئی چار کتابیں تھیں۔ ایک ایک مرتبہ پڑھنے پر اکھڑ گئیں۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا ہر والد کی جیب پر یہ اضافی بوجھ نہیں کہ وہ ایک تعلیمی سال کے لیے ہر مضمون کی متعدد کتابیں خریدے؟ یا پھر وہ آئے روز اپنے بچوں کو سمجھاتا رہے کہ شاخِ نازک پر بنے آشیانے (ناقص کتاب) کو کیسے محفوظ رکھنا ہے۔

لیکن اس افسوس ناک داستان کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ ممکن ہے کہ والدین تواتر سے نئی کتابیں خریدنے کی سکت رکھتے ہوں؛ یا ایک کتاب کی باقاعدہ وقفوں سے نئی جلد کراتے ہوں؛ یا اپنے پیارے بچوں کے ساتھ ہمہ وقت سر کھپائی کرتے ہوئے اُنہیں کسی طور کتاب کو محفوظ رکھنے کی تلقین کرتے ہوں؛ یا پھر اُن کا بچہ چمن میں ہر طرف بکھرے ہوئے اوراق سے ہی اکتسابِ علم کی کوشش کرے، یا پھر والدین آنکھیں بند رکھیں، اور مطلق پروا نہ کریں کہ ایک مرتبہ کتاب خریدنے کے بعد اس کا انجام کیا ہوا؟ اس سے بھی اہم اور سنگین نتائج بچے کی کتاب کے بارے میں سوچ کی بابت ہیں۔ بچہ کتاب کو پرکشش معلومات کی ان جانی دنیا، بہترین کھلونا اور خوشی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھنے کی بجائے اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہے جتنی اُس کے والدین صبح خریدے گئے اخبار کو۔ وہ اس کتاب سے نہ محبت کرتا ہے اور نہ اسے احترام دیتا ہے۔ بچوں کی عادتیں اور رویے عام طور پر زندگی بھر تبدیل نہیں ہوتے۔

بچے کی درسی کتاب سے مایوسی مندرجہ ذیل نتائج کا باعث بنتی ہے۔ پہلا، کتابوں سے محبت نہ ہو تو مطالعے کا شوق بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مشکل کے بغیر امتحان پاس کر لے، اور پھر

کوئی پیشہ اختیار کر لے، یا سرکاری افسر بن جائے، لیکن وہ کبھی بھی خوشی کے لیے کتاب نہیں پڑھے گا۔ وہ ایک ڈگری یافتہ ان پڑھ انسان کے طور پر اس دنیا سے رخصت ہوگا۔

دوسرا، چونکہ وہ خود مطالعے کا عادی نہیں، اس لیے وہ ایک اچھا والد نہیں ثابت ہوگا۔ وہ اپنے بچوں کے دل میں اُس چیز کی محبت کس طرح پیدا کرے گا جس سے وہ خود اجنبی رہا تھا؟ اس طرح ایک جاہل نسل دوسری جاہل نسل کو جنم دے گی۔ دو عشروں کے دوران بہت سے مرد و خواتین ڈگریاں رکھتے ہوں گے لیکن اُن کا شمار حقیقی معنوں میں خواندہ افراد میں نہیں ہوگا۔

تیسرا، وہ اپنے پیشے میں تنگ نظر ہوگا۔ وہ یہ بھی نہیں پڑھے گا کہ اس متعلقہ شعبے میں اُس کے فرائض کیا ہیں، یا وہ منصب اُس سے کیا تقاضا کرتا ہے؟ بطور سرکاری افسر اُسے اپنے دفتر کی فائلوں اور دستاویزات کے علاوہ ملک کو درپیش مسائل کا کچھ علم نہ ہوگا۔ اگر وہ کوئی وکیل بنا تو وہ بیرونی دنیا سے بے خبر، محدود فہم رکھنے کا والا وکیل ہوگا۔ اگر وہ کوئی جج بن گیا تو بھی کج فہمی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اگر وہ کسی کالج یا یونیورسٹی کا استاد بن گیا تو وہ محض اتنی ہی کتابیں پڑھے گا جن کے بغیر وہ لیکچر نہیں دے سکتا۔ ان سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

چوتھا، چونکہ اُسے پڑھنے کا شوق نہیں، اس لیے اُسے لائبریری بھی نہیں چاہیے ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں پبلک لائبریریاں ختم ہوتی جا رہی ہیں (کالج اور یونیورسٹی کا وہ طالب علم جو محض اپنی امتحانی ضرورت پوری کرنے کے لیے لائبریری کی کتاب کے صفحے نکال کر اُسے مسخ کر دیتا ہے، وہ وہی بچہ ہے جس کی کتاب پڑھتے وقت بکھر جاتی تھی، اور وہ کچھ صفحے پڑھ کر سکول کا کام کر لیتا تھا۔ اب بھی اسے کچھ صفحے ہی چاہییں)۔

خراب گیٹ اپ میں ایک درسی کتاب سے ایک بدتہذیب قوم کا تاثر ابھرتا ہے۔ ایک ایسی قوم جس کے طالبِ علم دہشت گرد، اساتذہ جہالت کے پیکر، تعلیمی ادارے بداخلاقی کے گڑھ گھاٹ؛ اور جس کے تعلیم یافتہ طبقے کے فکری معیار کا یہ عالم کہ وہ شاعری پر ٹی وی، نثر پر کرکٹ، اور تمیز پر آتش بازی کو ترجیح دے؛ جس کی جہالت ایک ایسی ملگجی شام ہے جو نہ رات میں ڈھلتی ہے، نہ دن میں بدلتی ہے، نہ روشنی، نہ اندھیرا، بس ناخواندگی کی سلگتی آگ جو تاڑ جیسا بدبودار سیاہ دھواں پیدا کرتی ہے؛ جس کی اشرافیہ تھالی کا بینگن، موقعہ پرستی میں طاق؛ ادیب اور لکھاری آمروں کی مدح سرائی کے

ہنر بہ بازاں، چڑھتے سورج کو سلام کرنے میں یکتا، کیونکہ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ادنیٰ
درجات کے دسترخوان پر سیر ہونا، یا کسی سرکاری رسالے یا اخبار کی ادارت، یا کسی تعلیمی یا تحقیقاتی
ادارے کا سربراہ بننا ہوتا ہے؛ جس کے دانشوروں کی عقل اور رائے ہمیشہ ''برائے فروخت'' رہتی ہے،
اور دام کے مطابق دام کھرے کرنے اور طمع کو اطاعت کے ترازو میں تولنے کے لیے خود سپردگی کی حد
تک آمادہ، کیونکہ اُن کے نزدیک تھیوری تو بس بے جان کاغذ کا پلندہ ہے، اصل حقیقت زندگی ہے جسے
مال کی ضرورت ہے؛ جس کے علما کا ایمان ہے کہ خدا حکمران کی عبادت گاہ میں ہی دعا قبول کرتا ہے؛
اور جس کے عدم برداشت کے پیکر میں ڈھلے مفکرین اختلاف رائے کو ایک ایسی رکاوٹ سمجھتے ہیں جسے
گرا کر ہی اُن کی دال گلے گی، اور جن کے لیے نتائج حقائق سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں؛ اور جس کے
متمول طبقے نے دولت حاصل نہیں کی، دولت نے اُسے حاصل کر لیا ہے۔

سٹائل

کتاب کا گیٹ اپ بچے کو تاؤ دلاتا ہے؛ تو اس کا اندرونی مواد اُسے متنفر کر دیتا ہے۔ یقیناً
ننھے طالب علم عبارت کی جانچ نہیں کر سکتے۔ لیکن اُن کا اچھائی اور برائی کا ایک اپنا فطری پیمانہ ہوتا ہے
۔اُن کے نزدیک معیار کسی مواد کا واضح اور قابل فہم ہونا ہے۔ اگر وہ آسانی سے سمجھ جائیں کہ کتاب کیا
کہہ رہی ہے تو وہ طمانیت سے پڑھنا چاہیں گے۔ اگر وہ نہ سمجھ پائیں کہ کتاب آخر کہہ کیا رہی ہے تو ذہنی
تناؤ کا شکار ہو کر اسے پڑھنے سے انکار کریں گے۔ سینئر طالب علموں کو تصورات اور نظریات کی ضرورت
ہوتی ہے۔ اگر اُن کے سامنے چیزیں وضاحت سے نہ رکھی جائیں تو وہ سال گزرنے پر بھی نفس مضمون
سے آگاہ نہیں ہوں گے، اور امتحان میں ناکام ہو جائیں گے، جس میں اُن کا قصور نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ
جہاں کسی واقعے کا دوٹوک بیان، یا کسی تاریخی شخصیت کی کردار نگاری ہو، تو بھی انداز بیان اتنا موثر ہونا
چاہیے کہ تحریر اُن کے ذہن میں واقعے کا منظر یا کردار کی تصویر اجاگر کر دے۔ وہ کردار کو اپنی چشم تصور
سے، نہ کہ کسی اور کی آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

تفہیم کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں۔ لیکن یہ طرز تحریر ہے جو کسی شائع شدہ صفحے کو ادب پارہ
بناتی ہے۔ تمام عمرانی علوم میں تاریخ ہی ہے جو ادب کی دنیا میں جگہ پا سکتی ہے۔ اس کی وجہ اس کا بیانیہ

انداز اور دل کو چھو لینے والے واقعات ہیں۔ معاشیات اور جغرافیے پر بہترین کتابیں بھی ادب کی صنف میں جگہ نہیں پاتیں، کیونکہ یہ موضوعات ذہن کو متاثر کرتے ہیں، نہ کہ دل کو۔ تاریخ ہماری زندگی، اور اُن چیزوں کے قریب ہے جو ہمیں عزیز تر ہیں۔ یہ بتاتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کون تھے؟ ہمارا ماضی کیا تھا؟ وہ کون سے اتار چڑھاؤ، انجانے موڑ، قسمت کا تازیانہ، اتفاقات کا اسپ تازی، حادثات اور انسانیت کی کہانی، ہیروز کا کردار، ہمارے آباؤ اجداد سے سرزد ہونے والی غلطیاں یا محض خوش قسمتی تھی جس نے کچھ کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا، کچھ تباہ کر دیا۔ انسان وقت کے دوش پر سفر کرنا پسند کرتا ہے۔ یہ فطری امر ہے۔ تاریخ اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے ماضی کے نشانات دکھاتی ہے۔ تاریخ کتنی اچھی گائیڈ ہے اس کا دارومدار اُن مورخین پر ہے جو زندگی کے اسرار اُس کے سامنے بے نقاب کرتے جاتے ہیں۔

تمام مہذب ممالک میں ادب کے بعد تاریخ سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مضمون ہے۔ حتیٰ کہ معمولی تعلیم حاصل کرنے والے افراد، جو عالم فاضل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے، وہ بھی ملکی اور غیر ملکی، قدیم اور جدید تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تاریخی سوانح عمری بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ پورے عہد کی تاریخ ایک شخص کی زندگی میں سمٹ آتی ہے۔ یہ قاری کو ذاتی طور پر متاثر کرتی ہے؛ اس کے صفحات میں انسان، انسانوں کا مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں؛ زندہ افراد مرحومین کے بارے میں جانتے ہیں؛ حال ماضی کی کھڑکی میں جھانکتا، اور زندگی کے بیتے ہوئے باب اور پلٹے ہوئے صفحے کو موجود کی عینک سے پڑھتا ہے۔

مغرب میں تاریخ کی کتابیں بہت زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ اس کی اہم وجہ اُن کتابوں کا قابل مطالعہ ہونا ہے۔ عام طور پر تاریخ کی کتابیں جس پر شکوہ انداز میں لکھی جاتی ہیں، وہ دیگر اصناف میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موضوع خود مصنف کے بہترین ہنر کو اجاگر کر رہا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ایک اچھے مورخ کو قلم اٹھاتے وقت یاد رکھنا چاہیے وہ دنیا کو جیسے چاہے پیش کر سکتا ہے۔ اچھا لب ولہجہ ذہنوں کو مسخر اور دلوں پر راج کرتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو اپنے ساتھ وقت کے دوش پر گئے زمانوں کے سفر پر آمادہ کر سکا تو اُسے پڑھا جائے گا۔ اگر وہ زبان پر مکمل عبور رکھتا ہے، تو وہ بہت عرصہ

پہلے پیش آئے واقعات کو جاندار اور زندگی کے جذبے سے بھرپور نثر پارے میں تبدیل کر سکتا ہے۔ الفاظ ایسے ہوں جیسے نقرئی جام سے اٹھنے والے بے ساختہ بلبلے۔ ہر لفظ بیان کے مطابق جملے میں ایسے جڑا ہو جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ یہ الفاظ کا چناؤ، استعمال اور ترتیب ہے جو معروضی حقائق، انقلاب کے ہنگامے، عوامی اشتعال، بیرونی یلغار، یا اندورنی شورش کی منظر کشی، یا کسی مرکزی شخصیت کی کردار نگاری کرتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع اور متنوع ہوتا ہے۔ موزوں الفاظ، خاص طور پر اسم صفت اور دیگر معاونین کا استعمال تخلیقی مہارت کا متقاضی ہوتا ہے۔ عبارت کی بندش مضبوط اور برمحل ہو، کہانی کسی رکاوٹ کے بغیر اپنا راستہ بناتی اور دریا کی سی روانی سے آگے بڑھتی محسوس ہو۔ جملے کی معنی خیزی اس طرح ہو کہ تہہ در تہہ واقعات کا اسرار خود کو بے نقاب کرتا چلا جائے۔ جملے طویل ہوں تو ان میں فطری بہاؤ ہو، ایک بندش دوسری بندش کے ساتھ جوہری پیوستگی رکھتی ہو۔ سلجھا ہوا نثری محاورہ دلیل کو شعری نکھار دیتا ہے۔ ہر چیز واضح، ابہام سے پاک، معروضی اور بامعنی ہو۔ یہ سفر طویل ہے۔ مناظر کے تبدیل ہونے کے باوجود مفصل بیان کا پرسکون بہاؤ، متاثر کن منظر نگاری، محرکات کا گہرا اور متوازن تجزیہ پہاڑی ڈھلوانوں پر بہتی ہوئی ندی کی طرح تیز، شفاف اور چمکدار انداز، جو نہ کچھ چھپاتا ہے اور نہ کچھ مسخ کرتا ہے، تاریخ کو موسیقی کی لے میں ڈھال دیتا ہے۔

میری خواہش تھی کہ میں کہوں کہ پاکستانی مصنفین نے بھی تاریخ پر چند ایک کتابیں ایسی لکھی ہیں جن کا مطالعہ لطف دیتا ہے، اور ان کی علمی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ لیکن حقیقت پسندی سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ پاکستانی کام کو یورپی اور امریکی تصنیفات کے مقابلے پر رکھنا وقت کا زیاں ہے۔ ہمارے ہاں تاریخی نویسی کا علمی اور ادبی معیار نہ ہے، نہ کبھی تھا۔ اور یہ ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ ''مورخین کی موجودہ نسل'' انہی درسی کتب سے فیض یافتہ ہے جن کا میں ان سے کتاب میں جائزہ لیا ہے۔ ہم تاریخی نویسی کا درخشاں ماضی بھی نہیں رکھتے، کیونکہ ان درسی کتابوں میں سے کچھ ''سینئر مورخین'' کی تحریر کردہ ہیں۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

میں سٹائل کی بات بھی کر رہا ہوں۔ اس ضمن میں درسی کتب افسوس ناک ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اگر ایک مورخ خراب لکھتا ہے تو ٹھیک ہے، کوئی بھی اُسے نہیں پڑھے گا؛ اُس کی کتاب لائبریری میں پڑی گرد آلود ہوتی، اور کیڑوں کا نشانہ بنتی رہے گی۔ اس کا یہی انجام ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر

وہی مورخ، یا اس قبیل کا کوئی اور، درسی کتاب لکھتا ہے، جسے پڑھنا مشکل، لیکن طلبہ کی مجبوری ہوتی ہے۔ ایک پوری نسل کو ذہنی اور نفسیاتی عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسے پڑھ کر پروان چڑھنے والی نسل اذیت پسندی اسی راہ پر چلتے ہوئے ایسے ہی گل کھلاتی رہے گی۔ اس کرب کا اندازہ کریں کہ عام قاری کو تو ایک خراب لکھی ہوئی کتاب پڑھنے کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی، لیکن نوخیز ذہن رکھنے والے طلبہ کس اذیت ناک مشقت سے گزرتے ہیں کہ انہیں اگلی جماعتوں میں ترقی پانے کے لیے نہ صرف ان کتابوں کو روزانہ پڑھنا، بلکہ یاد بھی کرنا ہوتا ہے۔ لیکن امتحان پاس کر لینے سے جان کی خلاصی نہیں ہوتی۔ اگلی جماعت میں ایسی ہی، یا اس سے بھی خراب کتاب اُن کی منتظر ہوتی ہے۔ کلاس در کلاس، بعد ازاں، نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی انداز میں ڈھلی ذہنیت لیکچرار بن کر اسی قسم کی کتابیں لکھنے لگتی ہے۔ تاریخ ہر لحاظ سے خود کو دہراتی ہے؛ برائی کو زندگی کی نئی سند ملتی ہے؛ گھٹیا انداز تحریر نسل در نسل مجہول قارئین کے سینے پر مونگ دلتا رہتا ہے۔

باب اول میں، میں نے گھٹیا معیار کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں سے کچھ مثالیں دی ہیں۔ یہ ان مصنفین کی تحریر کردہ تھیں جن کے خیال میں وہ انگریزی میں بہتر لکھ سکتے ہیں۔ اُن کی ہوشربا خامیوں کی مثالیں آپ نے دیکھیں۔ اگر میں اردو میں لکھ رہا ہوتا تو میں انتہائی ناقص اردو کے کچھ جملے نقل کرتا کہ کس طرح زبان کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں، لیکن ترجمے کا ترازو خرابی کی گہرائیوں کو نہیں ماپ سکتا۔ اتنا ہی کہے دیتا ہوں کہ درسی کتب تصنیف کرنے والے فاضل مصنفین ہوش کو جوش کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ وفور جذبات کے سامنے گرائمر، جملے کی بندش کے اصول اور کمپوزیشن کی کیا اوقات! خیر مصنفین ان لوازمات کو خاطر میں لاتے بھی نہیں۔ الفاظ کا چناؤ ضرور کرتے ہیں، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کوئی مناسب لفظ جملے میں نہ آنے پائے۔ جملے کی ترکیب اور مصنف کے مدعا میں کوئی ربط ہوتا ہے نہ تعلق۔ زبان بکھرے، الجھے، پچے، جکڑے، رگڑے اور ادھر ترچھے متعلقات کا ایسا جھنکار ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ جملے جلد ہی ذیلی شاخوں کے صحرا میں گم ہو جاتے ہیں؛ فعل واحد سے جمع اور جمع سے واحد کے درمیان قلابازیاں کھاتے چلے جاتے ہیں؛ پیراگراف کا اختتام جملوں اور مفہوم کی دلدل میں اتر جاتا ہے۔ بسا اوقات فاعل اور مفعول کے درمیان دو سطروں پر محیط ابہام کا قلزم حائل ہوتا ہے، درمیان میں اندھا دھند الفاظ کی خانہ پری کی گئی ہوتی ہے۔ اب بے چارے قاری کو اس ہم

بدلی صحرائے گزرنا ہوتا ہے۔ لسانی الجھاؤ میں دلائل اور مفہوم کو سر اٹھانے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ تحریر خود کو نہیں سمجھاتی، طلبہ کو استاد اور امدادی کتب اور دیگر کئی معاونین، اور آخر میں اپنے وجدان کو بروئے کار لاتے ہوئے سمجھنا پڑتا ہے کہ 'مدعا کیا ہے'۔

درسی کتب اتنے خراب انداز میں کیوں لکھی جاتی ہیں؟ کتاب کسی نہ کسی زبان میں لکھی جاتی ہوتی ہے (گونگے اور بہرے افراد کے سوا باقی کے لیے الفاظ ہی ابلاغ کا ذریعہ ہیں)، اور اس ملک نے ابھی قومی سطح پر ابلاغ کی کوئی زبان تلاش کرنی ہے، یا کسی زبان کو ترقی دے کر اس مقام پر لانا ہے۔ زبان بطور ذریعۂ تعلیم کی بحث کئی ایک بندگلیوں میں گم ہوتی ہوئی مبہم دلائل کی نذر ہو جاتی ہے۔ آپ اردو میں کیوں لکھتے ہیں اگر آپ اس زبان میں صاف اور واضح اظہار پر قادر نہیں؟ صرف اس لیے کہ یہ ''قومی زبان'' ہے، اور حکومت نے اسے بنیادی ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اگر یہ ''قومی زبان''، اور بنیادی ذریعۂ تعلیم ہے تو پھر پروفیسر حضرات اسے درست کیوں نہیں لکھ سکتے؟ اس الجھن کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ سب سے پہلے بندگلی کی بات کر لیتے ہیں۔

کئی سال پہلے حکومت نے دو وجوہات کی بنا پر انگریزی کو بطور ذریعۂ تعلیم ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا: یہ کسی آزاد ملک کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے بچوں کو کسی غیر ملکی زبان میں تعلیم دے... خاص طور پر وہ زبان جو اُن کے سابق آقاؤں کی ہو جن سے وہ نفرت کرتے ہیں؛ اور پھر ملک کی اپنی قومی زبان، اردو ہو۔

پہلی وجہ ٹھوس اور معقول ہونی چاہیے، لیکن ہمارے ماحول میں یہ نری منافقت اور نامعقولیت ہے۔ منافقت اس لیے کہ جس حکومت نے یہ فیصلہ کیا، وہ نہ صرف خود اپنا زیادہ تر کام انگریزی میں چلاتی ہے، بلکہ فوج، عدلیہ، سائنس، میڈیسن، انجینئرنگ، ٹیکنالوجی کی جامعات، زراعت اور کاروباری طبقے اور ملک کے دیگر شعبوں کو انگریزی کے استعمال کی اجازت دیتی ہے۔ مزید یہ کہ سکولوں اور کالجوں میں اردو رائج کرنے کا مطالبہ کرنے والے افراد کی اپنی زندگی نوآبادیاتی دور کا نمونہ ہوتی ہے۔ اُنھوں نے یورپی لباس پہنا ہوتا ہے؛ دوستوں، ساتھیوں اور اپنے بچوں کے ساتھ انگریزی بولتے ہیں؛ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں؛ چھٹیوں پر ہمسایہ مسلمان ممالک کی بجائے یورپ اور امریکہ کی سیر کو جاتے ہیں؛ اُن کی بیویوں کا ہیئر سٹائل ''انگلش'' ہوتا ہے، اور وہ (کم از کم اپنی طرف

سے)انگلش ہی بولنے کی کوشش کرتی ہیں ؛اور انگریزی بولنے والے غیر ملکی مہمانوں سے ملنا باعث فخر سمجھتی ہیں۔ یہ سب افراد قابل نفرت انگریزوں کے انداز واطوار سے محبت کرتے ہیں۔اس جملے کو فعل ماضی میں پڑھا جاسکتا ہے اور فعل حال میں بھی۔

یہ وجہ تھیوری اور پریکٹس کے اعتبار سے نامعقول دکھائی دیتی ہے۔کسی زبان کی جانچ اسے بولنے والے افراد کے آپ کے ساتھ تعلق سے نہیں ہوتی۔ انگریزی بری ہے کیونکہ انگریزی بولنے والے انگریزوں نے ہم پر حکومت کی تھی۔ درست۔ فارسی اچھی ہے کیونکہ یہ مغلوں کی زبان تھی، اور مغلوں نے بھی ہم پر حکومت کی تھی۔ کچھ معقولیت دکھائی دی؟ جب طلبہ کو سکولوں میں پڑھائی جائے تو انگریزی بری ہے۔ جب فوجی افسران میس میں انگریزی بولیں تو یہ اچھی ہے۔کیا منطق ہے؟قوم پرستی اور حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ ہم انگریزی زبان سے نفرت کریں؛لیکن قومی مفاد تقاضا کرتا ہے کہ ہم برطانیہ اور امریکہ سے فوجی امداد لیں۔ مت بھولیں، امریکی گندم ہماری قومی ضرورت ہے۔ عجیب منطق ہے!دلیل میں منطق نہ ہو تو اسے جگت کہتے ہیں۔

عملی ضروریات حب الوطنی پر غالب آجاتی ہیں۔ پاکستانی زندگی کی دو حقیقتیں اس کی وضاحت کرتی ہیں۔کراچی میں روانی سے اردو بولنے اور قوم کے لسانی اور ثقافتی ضمیر کے خودساختہ نگہبان اردو کے نفاذ کے بلند آہنگ حامی وہی ہیں جنھوں نے بنگالی کو ملک کی دوسری قومی زبان کا درجہ دینے پر پرزور احتجاج کیا تھا۔ یہ سب خاندان اپنے بچوں کو انگلش میڈیم سکولوں میں بھیجتے ہیں۔جب اُن سے اس رویے کی بابت سوال کیا جائے تو بہت ڈھٹائی سے جواب دیں گے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بچے دنیا میں ترقی کریں، اپنی زندگی بنائیں، اور اردو میڈیم سکولوں میں جانے سے زندگی نہیں بنتی ۔اُن کے سامنے چناؤ اپنی رائے اور روپے کے درمیان ہے۔اور اپنے چناؤ پر کوئی شرمندگی نہیں۔دیگر صوبوں سے تعلق رکھنے والی اشرافیہ، جو اردو سپیکنگ کمیونٹی نہیں، کا طرزِ عمل بھی یہی ہے۔مزید برآں، اسلامیات، عربی اور فارسی میں غیر ملکی ڈگری لے کر اپنا کیریئر بنانے کے متمنی نوجوان تہران، بغداد، قاہرہ اور استنبول جانے کی بجائے برطانوی اور امریکی جامعات کا رخ کرتے ہیں (اور وہ ٹھیک کرتے ہیں۔آج کی پاکستانی جامعات کی بات کرنا وقت کا زیاں ہے۔اگلے سو برسوں تک بھی کوئی پاکستانی یونیورسٹی مغرب کی کسی گمنام یونیورسٹی کے مقابلے کی ڈگری بھی نہیں دے سکتی)۔

یہاں ذہن میں ایک دلچسپ سوچ پیدا ہوتی ہے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سیاست دان اور سیاسی کارکنان اپنے سابق مالکان کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ایوب خان اور جنرل ضیا الحق کے ادوار میں جب انھوں نے اپنی زندگی اور آزادی خطرے میں پائی تو وہ ملک سے باہر چلے گئے اور بیرونی ممالک میں پناہ لے لی۔ وہ کہاں گئے؟ کیا وہ سوویت یونین یا مشرقی بلاک، یا ماسکو کے زیر اثر کسی عرب یا افریقی ملک گئے؟ کیا اُن کا اشتراکی قطب نما مشرق کی سرخی کی طرف نہ مڑا؟ نہیں، وہ امریکہ، مغربی جرمنی اور برطانیہ گئے۔ حتیٰ کہ عظیم اشتراکی مفکر، شاعر اور لینن امن انعام حاصل کرنے والے فیض احمد فیض نے بھی اپنی خودساختہ جلاوطنی کے لیے ماسکو پر لندن اور بیروت کو ترجیح دی تھی۔ بند گلی نمبر دو۔

انگریزی کے خلاف کیس محض اس زبان کے استعمار کے ساتھ تعلق اور اس کی سرپرستی کا جواز نہیں جیتا جا سکتا۔ قابل نفرت نو آبادیاتی ماسٹرز سے جتنی محبت ہم کرتے ہیں شاید سابق برطانوی سلطنت میں شامل کوئی قوم اتنی نہیں کرتی۔ اس ثقافتی وفاداری کی مثال ہمیں شاید شمالی افریقہ کی فرانس کے ساتھ قربت میں ملے۔ آزادی کے چند سال بعد الجیریا کے وزیر خارجہ نے ایک عرب سمٹ کانفرنس میں شرکت کی۔ اُن کے ہمراہ عرب مترجم تھا، گویا وہ خود عربی بولنے اور سمجھنے کے قابل نہ تھے۔ اس کے بعد حالات تبدیل نہیں ہوئے ہیں۔ جولائی 1992ء میں الجریا میں ہونے والے حکومت مخالف مظاہروں کی اخبارات میں شائع ہونے والی تصاویر سے پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کرنے والی خواتین اور لڑکیوں نے فرانسیسی زبان میں لکھے ہوئے پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔

اردو کی حمایت کی دوسری بنیاد، جس پر یہ تمام عمارت کھڑی ہے، یہ ہے کہ اردو ملک کی قومی زبان ہے۔ لیکن یہ کھوکھلی بنیاد ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی ملک کی قومی زبان اس کے صرف 7.60 فیصد باشندے نہیں بولتے۔ یہ اعداد و شمار 1981ء کے ہیں۔ جب اردو کو 1948ء میں قومی زبان قرار دیا گیا تو اسے بولنے والوں کی تعداد صرف 2 فیصد تھی۔

ہماری تاریخ عجائبات سے لبریز ہے۔ برطانوی ہند میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی رہنماؤں کا تعلق یوپی سے تھا۔ یہ چھوٹا سا گروہ ہی اس کا فیصلہ ساز تھا۔ بلوچستان، سندھ، این ڈبلیو ایف پی اور پنجاب میں لیگ کی صوبائی شاخیں نہ ہونے کے برابر تھیں، یا اگر آزادی سے پہلے موجود

تھیں تو بہت کمزور تھیں۔ 1916ء کے لکھنو پیکٹ نے پنجاب اور بنگال میں مسلم حکومتوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے ظاہر کرتا ہے کہ مسلم لیگ پر یو پی کے اردو بولنے والے گروہ کا کس قدر اثر تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کے سالوں میں تقریباً پانچ لاکھ افراد نے یو پی سے کراچی، اتنے ہی افراد نے اندرون سندھ، اور قدرے کم تعداد نے پنجاب کی طرف ہجرت کی (چونکہ یہ ہجرت 1980ء کی دہائی بھی جاری تھی، گو مہاجرین کی تعداد میں کمی آ رہی تھی، مقامی سندھی اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہونے کے خطرے سے دوچار ہو گیا)۔ یہ مہاجرین اپنے ساتھ دو ذہنی رویے لائے: اُنہیں پاکستان کے فیصلے کرنے کا اختیار ہے، کیونکہ پاکستان مسلم لیگ نے بنایا تھا جو ''اُن کی'' پارٹی تھی۔ دوسرا یہ کہ اُنہیں پاکستان کے عوام پر اپنی زبان اور ثقافت مسلط کرنے کا حق ہے کیونکہ وہ ملک کے مقامی باشندوں سے ہر لحاظ میں برتر ہیں۔ اپنے ان عزائم کی تکمیل میں اُنہیں کچھ عوامل نے مدد دی: پہلا یہ کہ ملک کے پہلے وزیر اعظم اردو بولنے والے صاحب تھے، جو پوری توانائی، اور ہر قسم کی اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی کمیونٹی کے مفادات کو آگے بڑھانے میں اپنا فائدہ دیکھتے تھے کیونکہ پورے ملک میں یہی کمیونٹی اُن کا حلقۂ انتخاب تھی۔ دوسرا یہ کہ پنجاب کے زیادہ تر سیاست دانوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے مہاجرین کا ساتھ دیا تا کہ وہ چھوٹے صوبوں پر غلبہ قائم کر سکیں اور مشرقی پاکستان کو فیصلہ سازی کے مساوی حق سے محروم کر سکیں۔

اس طریقے سے پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر وہ افراد غالب آ گئے جو یا تو اردو بولتے تھے (مہاجرین)، یا نامعلوم وجوہات کی بنا پر اردو کو گلے سے لگانے کے لیے تیار تھے (پنجابی)۔

اس طرح تاریخی عدم توازن، ثقافتی ابہام، نسلی عزائم، احساسِ کمتری، گمراہ کن حب الوطنی، سرکاری احکامات اور عقل سے تہی دامن منصوبہ بندی نے مل کر اردو کو درسی کتب کی زبان تو بنا دیا لیکن ان کتابوں کو بہتر بنانے کی سعی ناکام رہی۔ انگریزی کی بجائے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے ہمارے پروفیسرز کی قلمی مہارت نکھر کر سامنے نہیں آئی، بلکہ خامیوں پر انگریزی میں پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا ہے۔ وہ ایسے ناخواندہ افراد کی طرح لکھتے ہیں جیسے کسی غیر ملکی زبان میں لکھ رہے ہوں (اور حقیقت بھی یہی ہے)۔ اگر استاد جس زبان میں پڑھاتے یا لکھتے ہیں، کا ناقص علم رکھتے ہوں تو اُن کی شہرت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن خاطر جمع رکھیں، ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ جب ہر کوئی ہی خراب لکھتا ہو تو

آپ موازنہ کس سے کریں گے؟ تو اردفہم وادراک کا خون کر دیتا ہے۔

ان کتابوں کا طلبہ پر کیا اثر ہوتا ہے؟ نوخیز اور حساس ذہن، جو بیدار، زندہ، توانا اور چوکس ہوتا ہے، ایک ایسی زبان میں ایک نیا مضمون پڑھنے کی مشقت سے دوچار ہوتا ہے جو غیر واضح اور مبہم ہونے کے علاوہ دہرائے جانے والے بیانات سے اٹی ہوتی ہے۔ لکھا گیا لفظ کچھ نہیں سمجھا پاتا ہے۔ استاد کا بولا گیا لفظ لکھے گئے صفحے کی صوتی نقل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد کا علم درسی کتاب تک ہی محدود ہوتا ہے۔ خراب زبان میں کی گئی وضاحت، یا پیش کیا گیا بنیادی تصور طلبہ کو فکری جمود کا شکار کر دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ محسوس کرتا ہے کہ اس علمی مشق میں سوچ سمجھ کا کوئی گزر نہیں، بس کچھ اسباق کو دہرانا اور یاد کرنا ہے۔ حساس اور نوخیز ذہن رکھنے والے طلبہ کو اس احساس کا شکار کرنا تعلیم کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ یہ مشق تجسس کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ علم کی جستجو دم توڑ جاتی ہے۔ علم کی جگہ رٹا لگانا لے لیتا ہے۔

بے حسی، بلکہ لاعلمی کا معاشرے میں جاری ایک اور روایت سے بھی تعلق بنتا ہے۔ کم و بیش ہر بچے یا بچی کو پانچ یا چھ سال کی عمر سے قرآن پاک پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے لیے یا تو کسی مولوی صاحب کی نجی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، اور وہ آدھے گھنٹے کے لیے گھر پر آکر قرآن مجید پڑھاتے ہیں، یا بچے قریبی مسجد میں کسی وقت جاتے ہیں۔ وہاں اجتماعی کلاس کی صورت انہیں تلاوت سکھائی جاتی ہے۔ حال ہی حکومت نے حکم دیا ہے کہ تمام سکولوں میں قرآن پاک ناظرہ کی تعلیم دی جائے۔

یہ تعلیم اصل عربی متن ممکنہ حد تک درست لہجے میں پڑھنے تک محدود ہے۔ پڑھنے والے کو ایک لفظ کی بھی سمجھ نہیں کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اس مشق کا "علمی" نام ناظرہ ہے، گویا تحریر کو نظر سے، نہ کہ ذہن سے پڑھنا۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ عربی ایک غیر ملکی زبان ہے۔ اسے پڑھنے کا مطلب یہ سیکھنا ہے کہ کچھ حروف مل کر کس طرح ایک لفظ، اور الفاظ ایک مخصوص ترتیب سے مل کر ایک جملہ بناتے ہیں۔ یہ کام ایک پختہ ذہن رکھنے والے انسان کے لیے بھی آسان نہیں۔ لیکن ایک بچے کو ایسا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ عقیدے کا تقاضا ہے۔ صرف یہی نہیں، بچہ بتدریج آیات اور سورتیں پڑھتا ہے، جو کہ جملوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اسے کچھ سورتیں، جو عام طور پر قرآن پاک کے آخری پارے میں ہیں، زبانی یاد کرائی جاتی ہیں۔ وہ انہیں سمجھے بغیر یاد کر لیتا ہے۔ بچے کو الفاظ کے مطالب

سے آگاہ کرنے میں زیادہ محنت نہیں لگتی، لیکن اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

یہ رسم زندگی بھر کا معمول بن جاتی ہے۔ کم از کم دو مذہبی فرائض سمجھے بغیر ادا کیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر پاکستانی دن میں کسی وقت، علی الصبح یا سہ پہر کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ قرآن کے بیشتر نسخوں میں سطروں کے درمیان ترجمہ ہوتا ہے لیکن وہ اسے پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے انہیں مطلق سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان دن میں پانچ مرتبہ پابندی اور باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں، لیکن یہاں ایک مرتبہ پھر وہ نہیں جانتے وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس طرح وہ بنیادی مذہبی فرائض سمجھے بغیر ادا کیے جاتے ہیں۔ قدیم محاورے، ''عقیدہ اندھا ہوتا ہے'' کو ہم عملی طور پر ثابت کرنے پر تکے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جو قرآن پاک کی تلاوت یا پانچ وقت کی نماز ادا نہیں کرتے، وہ بھی ہفتے میں ایک مرتبہ نماز جمعہ کے لیے مسجد جاتے ہیں۔ امام صاحب خطبہ عربی میں دیتے ہیں، اور یہ عبادت کا حصہ ہے۔ بہت کم افراد خطبوں کے الفاظ سمجھ پاتے ہیں۔ یہی کچھ نماز جنازہ، نکاح کے دعائیہ خطبے، چہلم کی فاتحہ اور دیگر مختلف مواقع پر ختم دلانے کے لیے عربی پڑھی جاتی ہے تاکہ خدا خوش ہو جائے اور حاضرین پر اپنی رحمت و برکات کا نزول فرمائے۔

برصغیر میں اسلام کی آمد کے بعد سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اہل ایمان نے ابھی تک عربی نہیں سیکھی؛ کم از کم اتنی بھی نہیں جتنی اس مواد کی سمجھ کے لیے کافی ہو کہ وہ کیا پڑھ، بول اور سن رہے ہیں۔ نہ ہی وہ کوئی انقلابی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہیں کہ کم از کم دعائیہ کلمات تو اپنی زبان میں ادا کریں۔ اسے بھی کفر سمجھا جاتا ہے۔

اب اردو درسی کتب، اور اُن کے نوجوان قارئین پر واپس چلتے ہیں۔ طلبہ کی اردو کے ساتھ مشکلات، اور اُن کے والدین کی عربی عبارت کی ناسمجھی ایک جیسے مسائل نہیں۔ بچے کو اردو کی اُس سے زیادہ سمجھ ہے جتنی اُس کے والدین کو عربی کی۔ لیکن دونوں میں ایک ہی اصول کارفرما ہے۔ چاہے مذہب ہو یا تعلیم، بیرونی اور سطحی رسومات کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے؛ حقیقی فہم کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ بس رسم کی ادائیگی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔

ہم اداکاری کی اس سٹیج پر اپنے مکالمے سمجھے بغیر بول رہے ہیں۔ اس ڈرامے کا کوئی مقصد یا

وں نہیں۔ ہم بنیادی تعلیمی سچائی بھول چکے ہیں کہ بچے کو کم از کم اس کے ابتدائی برسوں میں مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہیے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا امکان معدوم ہے۔ پاکستانی بچے خراب اردو میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ اس وقت نہ انہیں کسی زبان پر عبور ہے؛ نہ اُن کا علم معیاری ہے؛ اور نہ ہی وہ اپنی سوچ کے اظہار پر قادر ہیں۔ علم، اظہار اور ابلاغ: تعلیم کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ لیکن قومی ضرورت کا قانون کسی قومی زبان کی اہمیت مسلط کرتے ہوئے ان تینوں کو پامال کر دیتا ہے۔ پالیسی اولویت کا قانون کہتا ہے کہ ہمیں ایک اچھے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے، لیکن ہم اس پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ حب الوطنی کے نام پر ہم کیا جرم کر بیٹھے ہیں!

مواد

درسی کتب لکھنے اور ان کی پلاننگ کرنے والے افراد دو طریقوں سے تعلیمی نظام کو تباہ کر دیتے ہیں: فطری لاعلمی، اور منظم پالیسی ہیں۔ کم فہمی، علم کی کمی، حقائق کا کھوج لگانے سے انکار، صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کرنے میں ناکامی، اور خوش گمانی۔۔۔ بس یہی ہمارا تعلم ہے۔ اگر یہ خالص لاعلمی ہو جیسا کہ بچگانہ لاعلمی، تو اس کا علاج مطالعہ کرنے سے ہو سکتا ہے (یہ کہنا کہ پروفیسر حضرات کو بنیادی علم حاصل کرنے کے لیے کسی پرائمری سکول میں داخل کرا دیں، ایک مذاق لگتا ہے، لیکن کچھ حقائق ہماری سادہ لوح طبیعت کو یقیناً چیلنج کرتے ہیں)۔ لیکن یہاں معاملہ سادگی، کم علمی، کند ذہنی اور غبی پن سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو حکومت ان کے علاوہ دیگر پروفیسرز سے کتابیں لکھوا لیتی، یا کسی شعبے کے مصنفین تجویز کردہ مواد لکھ دیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

ایسا اس لیے نہیں کیونکہ جہالت کو خصوصی طور پر پروان چڑھایا جاتا ہے: اس کے لیے زمین تیار کی جاتی ہے؛ نوخیز ذہنوں میں اس کے بیج بوئے جاتے ہیں؛ اس کی آبیاری کی جاتی ہے، اور یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کاوش کا ہدف ایسی نسل تیار کرنا ہے جو فرماں بردار؛ سوال پوچھنے سے قاصر؛ خوش نما اقتباسات میں گم، تنگ نظری پر نازاں؛ رہنمائی قبول کرنے کے لیے تیار؛ حکم ملنے پر چیزوں کو پسند یا ناپسند قرار دینے پر مائل، اپنے علم کی کوتاہی سے لاعلم اور کھوکھلے عقیدے کی خوش فہمی پر نازاں ہے۔ اس یک طرفہ سوچ کو پختگی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

مجھے اپنے الزام کی سنگینی کا احساس ہے؛ لہذا میں ان مصنفین کے اغراض و مقاصد کا کھوج لگانے کی بجائے ٹھوس ثبوت کے ساتھ بات کروں گا، اور قارئین کے سامنے ایک فہرست رکھوں گا۔ اس کے علاوہ میں اُن رویوں پر بھی روشنی ڈالوں گا جو ان کتابوں کے ذریعے پروان چڑھتے ہیں، نیز اُن چیزوں کی فہرست بھی پیش کروں گا جو اس کتاب میں ہونی چاہیے تھیں لیکن بوجوہ شامل نہیں کی گئیں۔

اس حصے میں، میں اس بات کا جائزہ لوں گا کہ کتاب میں کیا ہے، اور یہ کیا تبلیغ کرتی ہے، اور ان کا مثبت کردار کیا ہے؟ اس سے اگلے حصے میں قارئین کے علم میں لاؤں گا کہ ان کتابوں میں کون سے ضروری حقائق حذف کر دیے جاتے ہیں، نیز ترویج کردہ سوچ کن منفی رویوں کا باعث بنتی ہے۔

درسی کتب طلبہ، اور اُن کے ذریعے قوم، کو مندرجہ پیغام دیتی ہیں:

1۔ حکومت وقت کی پیروی کرنا

درسی کتب کا مواد حکومتِ وقت کی پالیسیوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا ریاست کے ستونوں (افسر شاہی اور سیاسی اور فوجی حکمران) کے ساتھ قریبی تعلق ہونا ناگزیر ہے کیونکہ حکومت کے اہل کار اور ملازمین ہی درسی کتب کی منصوبہ بندی کرتے، انہیں لکھتے اور ایڈٹ کرتے ہیں۔ وفاقی وزارتِ تعلیم ان کی منظوری دیتی ہے، اور ایک سرکاری ادارہ، ٹیکسٹ بک بورڈ انہیں شائع اور تقسیم کرتا ہے۔

لیکن کمرشل پبلشرز کی شائع کردہ کتب کے ساتھ کیا مسلہ ہے؟ وہ بھی عام طور پر انہی خطوط کی پیروی کرتی ہیں۔ کیوں؟ اس کی چار وجوہات ہیں:

1۔ ان کتابوں کے مصنفین کالجوں اور جامعات کے پروفیسرز ہونے کے ناتے سرکاری کنٹرول میں ہوتے ہیں؛ لہذا حکومت کے موقف کی پیروی کرتے ہیں۔

2۔ حکومت جماعت اوّل سے لے کر بارویں تک کا نصاب، جبکہ جامعات بی اے (تیرویں اور چودویں) کا نصاب تیار کرتی ہیں۔ یہ مواد مطالعاتی موضوع سے بڑھ کر طریقہ تدریس بھی تجویز کرتا ہے کہ اس کے لیے کن اہداف اور حدود کا خیال رکھنا ہے۔ ان اہداف کا تعین کرنے والی

بات ''نظریہ'' ہے۔ان حدود و اہداف کے ہوتے ہوئے اگر کوئی پرائیویٹ مصنف بھی کتاب لکھتا ہے تو وہ بھی سرکاری درسی کتاب سے مختلف نہیں ہوتی۔اگر وہ تجویز کردہ ہدایات کو نظرانداز کرتے ہوئے سچ لکھے تو کوئی سکول یا کالج اس کے استعمال کی اجازت نہیں دے گا (میں نے چیئرمین ٹیکسٹ بک بورڈ کی تنبیہ نقل کی ہے کہ صوبے کے ٹیکسٹ بک بورڈ کی تجویز کردہ کتابوں کے علاوہ کوئی اور کتاب خریدنے کی اجازت نہیں ہوگی)۔

3۔ اگر کوئی سکول معجزانہ طور پر ایسی کوئی کتاب تجویز کر دے تو امتحان میں تمام جماعت فیل ہو جائے گی، کیونکہ اُن کا تحریر کردہ مواد سرکاری نصاب سے مطابقت نہیں رکھتا ہوگا (یہ بات مجھے ایک سکول ٹیچر نے بتائی تھی جب میں نے آٹھویں جماعت کی کتاب، جو میری بھتیجی پڑھ رہی تھی، میں ایک غلطی کی نشاندہی کی۔اگر امتحان میں طالبہ یہ لکھ دے کہ شملہ وفد کی قیادت آغا خان، نہ کہ نواز محسن الملک نے کی تھی تو ممتحن اُسے فیل کر دے گا، کیونکہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے کتاب میں لکھا ہے کہ شملہ وفد کی قیادت نواب محسن الملک نے کی تھی، چنانچہ اس پر بحث کی گنجائش نہیں۔)اس سے ظاہر ہوتا کہ سرکاری تعلیم کس طرح تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کرتی ہے۔

4۔ کوئی بھی آزادی سے درسی کتاب نہیں لکھ سکتا، کیونکہ (a) وہ حکومت سے خائف ہے۔جب حکمران حکومت اور ریاست کو باہم ملا دیتے ہیں، تو اختلافِ رائے کو بغاوت، یا کم از کم قابل مواخذہ جرم سمجھا جاتا ہے۔خوف ہم سب کو بزدل بنا دیتا ہے۔تاریخ جائے جہنم میں، جان کس کو پیاری نہیں؛ (b) ایسی کتاب کوئی شائع نہیں کرے گا جس کی ایک سو کاپیاں بھی فروخت نہ ہو سکیں۔طلبہ کے سوا ملک میں کوئی بھی تاریخ نہیں پڑھتا۔سرکاری دباؤ کیسے احمقانہ نتائج برآمد کرتا ہے، اس کی ایک مثال جنرل ضیاالحق کے دور میں شائع ہونے والی درسی کتابوں سے ذوالفقار علی بھٹو کے نام کو حذف کرنا تھا۔اس کا مطلب ہے کہ اُن گیارہ برسوں کے دوران جو لوگ سکولوں میں گئے وہ نہیں جانتے کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے لے کر 1977ء میں جنرل ضیا کے مارشل لا تک ملک میں کیا ہوا؟

حکومت کی منشا سے درسی کتب کے اشاعت کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟ مندرجہ ادھوری فہرست اس پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہوگی:

1۔ طلبہ کو مسخ شدہ تاریخ پڑھا کر مغالطے میں ڈالا جاتا ہے۔

2۔ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ درسی کتب بھی تبدیل کی جاتی ہیں۔ اس سے خزانے کو نقصان بھی پہنچتا ہے اور طلبہ تاریخی حقائق کے بارے میں متذبذب رہتے ہیں۔ لیکن اس سے ٹیکسٹ بک بورڈز کو نئے مصنفین تلاش کرنے، اور بدعنوانی سے جیبیں بھرنے کا ایک اور موقع مل جاتا ہے۔

3۔ حکومت درسی کتب کو تعلیم فراہم کرنے کے ذریعے کی بجائے اپنی پراپیگنڈا مشینری کا ایک پرزہ سمجھ لیتی ہے۔

4۔ اساتذہ کی برادری، جہاں سے مصنفین لیے جاتے ہیں، میں مالیاتی اور فکری بدعنوانی سرائیت کر جاتی ہے۔ وہ ضمیر کو دبا کر لکھنا اور آسانی سے پیسہ کمانا سیکھ لیتے ہیں۔

5۔ طلبہ کی برین واشنگ کی جاتی ہے کہ وہ نصاب میں سراہے جانے والے کسی مخصوص حکمران کو تاریخی ہیرو تسلیم کر لیں۔ لیکن اُن کے زمانۂ طالب علمی میں ایک اور حکومت اقتدار میں آجاتی ہے، اور درسی کتب اُن کے سامنے ایک ہیرو لا کھڑا کرتی ہیں۔ اب اُنہیں اس کی خوبیاں ازبر کرنی پڑتی ہیں۔ اُن کے ذہن میں پیدا ہونے والی کیفیت کے لیے ''ابہام'' ایک کمزور لفظ ہے۔

6۔ پروفیسرز اسلام آباد آنے جانے والے حکمرانوں کی تعریف لکھنے میں اس قدر ''رواں'' ہو جاتے ہیں کہ اُن کا قلم مشینی انداز میں چلنے لگتا ہے۔ وہ تیسرے درجے کے پریس رائٹرز کی طرح نوٹ لکھتے اور مورخین کہلاتے ہیں، لیکن وقت اُن کی حماقتیں آشکار کر دیتا ہے۔

7۔ دنیا ہم پر ہنستی ہے؛ خاص طور پر امریکی ''ماہرین''، عالمی بنک کے مشیر اور عطیات فراہم کرنے والے بہت سے ادارے اور افراد، جنہیں حکومتِ پاکستان اپنے تعلیمی نظام کا جائزہ لینے کے لیے مدعو کرتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مسز تھیچر کا نام برطانیہ میں پڑھائی جانے والی درسی کتب میں نہ اُن کے دور میں آتا ہے اور نہ ہی اُن کی وزارتِ اعظمیٰ کے بعد۔ اسی طرح فرانس کے صدر کا نام بھی درسی کتب کی زینت نہیں بنتا۔ ہمارا نصاب دیکھتے ہی یہ بیرونی ماہرین حکومت اور عوام کی ذہنیت سمجھ جاتے ہیں، گرچہ ملک میں قیام کے دوران اس کا اظہار نہیں کرتے۔

2۔ فوجی حکومت کی حمایت

درسی کتب اور حکومت کا رابطہ محض ساجھے داری تک ہی محدود نہیں؛ اس کے مضمرات بہت گہرے ہیں۔ پاکستان کی 45 سالہ تاریخ میں سے 26 سال فوج نے براہ راست، یا اپنے کٹھ پتلی حکمرانوں کے ذریعے ملک پر حکومت کی ہے۔ چنانچہ درسی کتب کی مسلح افواج کے ساتھ گہری وابستگی تعجب خیز نہیں۔ ''حکومت وقت کی پیروی کرنے'' کا مطلب بھی یہی ہے کہ فوج کی پیروی کرو۔ یہ مقام فکر ہے۔

درسی کتب تصنیف کرنے والے حاکم وقت کے ساتھ ساتھ حاضر سروس جنرل کو بھی خراج تحسین پیش کرنا خود پر فرض کر چکے ہیں۔ کسی بھی کتاب میں ایسی چیزیں پڑھنا خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔ درسی کتب میں ان کی موجودگی نوجوانوں کی ذہنی کوفت کا باعث بنتی ہے۔ تابعدار اور فرماں بردار قسم کے پروفیسروں کا درباری خوشامدیوں کا سا کردار ادا کرنا بہت تکلیف دہ لگتا ہے۔ ایوب خان کے دور میں طلبہ کو بتایا گیا کہ جنرل صاحب نیک اور پرہیزگار تھے۔ لوگ اُن سے محبت کرتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے ایوب خان کو فیلڈ مارشل کے عہدے پر فائز کیا؛ اور اظہارِ تشکر کے طور پر اُنہیں دوبارہ صدر منتخب کیا۔ جنرل ضیا الحق کے دور میں سکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کو باور کرایا گیا کہ جنرل ضیا نیک اور خدا ترس انسان ہیں۔ اُنھوں نے پہلی مرتبہ اس ملک میں اسلام نافذ کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظم کے قوم سے کیے گئے عدے کو پورا کر دیا۔ صرف یہی نہیں، اُنھوں نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنا دیا۔ خدا نے ضیا الحق کا اس مقصد کے لیے خود انتخاب کیا تھا۔ یہ آخری دعویٰ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا چاہیے تھا کہ وہ خود کو انسانوں سے بالاتر کس صف میں شمار کرتے ہیں؟

درسی کتب کے دیگر کئی ایک اسباق یہی طرزِ فکر ظاہر کرتے ہیں:

1۔ سیاسی قیادت ملک پر حکومت کرنے کے لیے اناڑی، ناموزوں اور نالائق ہے۔

2۔ ناکام سیاست دانوں کو منتخب کرنے والے لوگ جمہوریت کے لیے غیر موزوں ہیں۔

3۔ موجودہ جمہوری نظام بذاتِ خود مغرب سے درآمد کیا گیا ایک نظام ہے، جس کی اسلام میں کوئی اجازت نہیں (لیکن اس کا کوئی متبادل نہیں پیش کیا جاتا، اور بیچارہ طالب علم چکرا جاتا ہے)۔

4۔ اگر مسلح افواج دیکھیں کہ سولین حکومت اطمینان بخش کارکردگی نہیں دکھا رہی تو فوج اس

کا تختہ الٹنے کا ماورائے آئین اختیار رکھتی ہے۔ (اور ہر مرتبہ عدلیہ ''نظریہ ضرورت'' سے کشید کردہ مبہم اور غیر واضح وجوہ کی بنیاد پر فوج کے اقتدار پر قبضہ کرنے کا جواز پیش کر دیتی ہے۔ طلبہ اس ''عمل اور اس کے لوازمات'' کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ذرا سکول یا کالج کے بچوں کو کیلسن کی تھیوری سمجھانے کی کوشش کر دیکھیں۔)

5۔ فوج کے پاس برس ہا برس تک حکومت کرنے کا حق ہے، کیونکہ روایتی طور پر بدعنوان سیاست دان ملک تباہ کر دیں گے۔ (ایک مرتبہ پھر اعلیٰ عدلیہ ''ملکی مفاد'' میں اس کا جواز پیش کر دیتی ہے، گو طلبہ اس کی تفہیم سے قاصر رہتے ہیں۔ خیریت یہ گزرتی ہے کہ وہ سوالات نہیں پوچھتے۔)

اس تدریسی عمل کے دوران طالب علم کچھ دیگر اسباق بھی سیکھ رہے ہوتے ہیں:

1۔ حکام بالا کا بلا چون و چراں حکم ماننا اچھی عادت ہے۔ کسی بھی صورتِ حال میں سوال کی جسارت کرنا قابلِ تعریف فعل نہیں۔

2۔ پاکستان کے لیے بطور نظام حکومت آمریت ہی سازگار رہے، اور اس کی وجہ سے اس میں استحکام اور خوشحالی ہے۔

3۔ شہریوں کو اپنے حقوق اور اپنی خواہشات ایک شخص کی خوشنودی کے تابع کرنے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اُس نے شہریوں کو کنٹرول کرنے کا اختیار بزورِ بازو حاصل کیا ہے۔

مختصر یہ کہ درسی کتب جمہوریت کے باب میں خاموش ہیں۔ یہ طلبہ کو عوام کی عوام پر عوام کے لیے حکومت کے بارے میں، یا ووٹ دینے کی دانائی یا جواز کے بارے میں کچھ نہیں بتاتیں۔ نہ ہی یہ کتابیں اُنہیں اچھے شہری بننے کی راہ دکھاتی ہیں۔ دورانِ تعلیم اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ طلبہ کی نوجوان نسل سے سیاسی قیادت ہرگز نہ ابھرنے پائے۔ تعلیمی نظام کے ذریعے لاکھوں ''تعلیم یافتہ غلام''، نہ کہ ذمہ دار شہری پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہ نظام شہری حقوق و فرائض کی بجائے اندھی تابعداری پر یقین رکھتا ہے۔

3۔ جنگوں کی عظمت بیان کرنا

اس طرزِ عمل کی بنیاد بیان کردہ مندرجہ بالا دو عوامل پر ہوتی ہے۔ جب درسی کتابیں حکومت کی ترجمان بن جائیں، اور یہ حکومت اکثر فوج کی ہو، تو ناممکن ہے کہ درسی کتب میں جنگ کے ذکر کو

نمایاں مقام نہ دیا جائے۔ عسکری ذہنیت رکھنے والی قوم عالمی امن کی داعی نہیں ہوسکتی۔ ملک کی لڑی گئی جنگوں کا سرسری ساذکر کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی بجائے مصنفین ایک چھوٹی سی کتاب کے کئی کئی صفحے بلکہ بعض اوقات پورے کا پورا باب مختلف محاذوں پر لڑی گئی جنگوں کی تفصیل کی نذر کر دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں طلبا کے لیے ملکی معیشت، سماجی حالات اور انتظامی امور سمجھنے کی بجائے جنگ و جدل کا بیان زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ نیز یہ بیان بھی من پسند اور یک طرفہ ہے۔ 1948ء کی کشمیر جنگ کا بمشکل ہی کہیں ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اُس وقت لڑی گئی جب ایک سولین حکومت اقتدار میں تھی۔ انڈیا کے ساتھ 1965ء کی جنگ کا بھرپور انداز میں تذکرہ کیا جاتا ہے کیونکہ اُس وقت جنرل ایوب خان ملک کے حکمران تھے۔ مجموعی طور پر طلبا کو ملک کے آئین، سیاست اور معیشت کی بجائے انڈیا کے ساتھ جنگوں کے بارے میں زیادہ بتایا جاتا ہے۔

جنگوں پر خصوصی توجہ کے مضمرات کیا ہیں؟

1۔ مسلح افواج کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے فوجی حکومت کی تصور کو تقویت ملتی ہے۔

2۔ سولین حکومت کی اہمیت کم ہو جاتی ہے کیونکہ 1965ء کی جنگ اُس وقت لڑی گئی جب ایک جنرل کی حکومت تھی۔ 1971ء کی جنگ بھی جنرل یحییٰ کی حکمرانی (اگر اُسے حکمرانی کہا جا سکے) کے دور میں لڑی گئی تھی۔

3۔ جنگوں پر زور دینے سے طلبا کی دلچسپی اور اُن کی توجہ کا ارتکاز سیاسی معاملات کی بجائے عالمی سکیورٹی کی طرف ہو جاتا ہے۔

4۔ بین السطور دیا جانے والا پیغام یہ ہے کہ صرف مسلح افواج ہی عوام کی نجات دہندہ ہو سکتی ہیں۔ اس سے تاثر دیا جانا مقصود ہے کہ جب قوم کو ناگہانی حالات کا سامنا ہو تو سولین حکومتیں اور سیاست دان بے کار ثابت ہوتے ہیں۔

5۔ یہ تدبیر طلبا کے ذہن پر درسی کتب کے مصنفین کی سوچ سے کہیں گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ وہ پہلا اثر یہ لیتے ہیں کہ عالمی مسائل حل کرنے کا واحد طریقہ تشدد اور طاقت کا استعمال ہے۔ درسی کتب سفارت کاری، مذاکرات اور قیامِ امن کی بمشکل ہی بات کرتی ہیں۔ جنگوں کی اہمیت بیان کرنے سے مسلح افواج میں نئی بھرتی میں مدد ملتی ہے۔ دوسرا یہ کہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کو

عسکری فتوحات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ ملمع کاری نوجوان نسل کو غیر ضروری طور پر خوش فہمی کا شکار کر دیتی ہے جو آنے والے دور میں خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

5۔انڈیا سے نفرت

جنگوں کو عظیم کارنامے قرار دینے کے لیے، یا کسی اور وجوہات کی بنا پر درسی کتب طلبا کے ذہن میں تاریخی اور سیاسی طور پر انڈیا اور ہندوؤں سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے عام طور پر یہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں:

1۔ ہندو مذہب اور ثقافت کو منفی انداز میں بیان کرتے ہوئے انہیں ''گندہ'' اور ''گھٹیا'' قرار دینا۔

2۔ مسلم دورِ حکومت کی تعریف کرنا کہ اس نے ہندو مذہب کے تمام ''گندے'' عقائد اور افعال کو ختم کر کے انڈیا سے قدیم ہندوتوا کو جڑ سے اکھاڑ دیا (یہ دونوں دعوے غلط ہیں)

3۔ یہ باور کرانا کہ انڈین نیشنل کانگرس خالصتاً ہندو جماعت تھی، نیز اس کی بنیاد ایک انگریز نے رکھی تھی اور اسے انگریز سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ہندوستانی قوم پرستی برطانیہ کی تخلیق کردہ تھی۔ یہ کھوکھلے جذبات تھے۔ کانگرس میں شمولیت اور اس کے ساتھ وفاداری کے گھٹیا پن کے مقابلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے خلوص اور پاکیزہ قومی جذبے کو رکھا جاتا ہے (اس پر مزید تبصرہ بعد میں)۔

4۔ یہ زور دینا کہ 1947ء میں تقسیم کے وقت ہونے والے گروہی فسادات کی ذمہ داری ہندوؤں اور سکھوں پر عائد ہوتی ہے، اور یہ کہ مسلمان کہیں بھی اور کبھی بھی جارح نہیں بلکہ مظلوم تھے۔

5۔ درسی کتب میں انڈیا کے ساتھ جنگوں کو بلاضرورت زیادہ جگہ دینا۔

اس کاوش کی حماقت اور ضیاع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں میں صرف چار بنیادی نکات بیان کرتا ہوں:

1۔ اگر کسی دشمن کی نشاندہی کرنی ہے تو صرف انڈیا ہی کیوں؟ سوویت یونین کیوں نہیں، جو ہمیشہ سے پاکستان مخالف رہا ہے، اور جس نے پاکستان سے متعلق تمام عالمی مسائل میں انڈیا کا ساتھ

دیا اور 1971ء میں اس کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرتے ہوئے پاکستان کو دولخت کرنے میں کردار ادا کیا؟ افغانستان کیوں نہیں؟ افغانستان کا شمار دنیا کے اُن چند ایک ممالک میں ہوتا ہے جنھوں نے 1947ء میں پاکستان کے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنے کے خلاف ووٹ ڈالا تھا۔ امریکہ کیوں نہیں؟ جب پاکستان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا تو کیا امریکہ نے تمام فوجی رسد نہیں روک لی تھی؟ کیا اس نے پاکستان کو ہمیشہ زرخرید غلام سمجھا ہے؟ مصر کیوں نہیں، جس نے 1971ء کی جنگ میں انڈیا کو فوجی رسد فراہم کی تھی؟

2۔ اگر انڈیا دشمن ملک ہے تو پاکستانی حکومت پاکستانی کھلاڑیوں کی ٹیموں اور فنکاروں کے طائفوں کو انڈیا کا دورہ کرنے، اور انڈین کھلاڑیوں اور فنکاروں کی پاکستان آمد کی حوصلہ افزائی کیوں کرتی ہے؟ بھارتی فلم سٹارز (ہندو) کا ایک معزز مہمان کے طور پر جنرل ضیاالحق نے استقبال کیوں کیا اور ایوان صدر میں کیوں ٹھہرایا؟ دشمن ممالک کے درمیان تو خیر سگالی کے جذبات کا تبادلہ نہیں ہوتا۔ برطانیہ اور جنوبی افریقہ دشمن ممالک نہیں تھے؛ اس کے باوجود برطانیہ نے اپنی کرکٹ ٹیم کے جنوبی افریقہ جانے، یا اس کے خلاف کہیں بھی کھیلنے کی پابندی لگا دی تھی۔

3۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد انڈیا کی آبادی کا حصہ ہے۔ آج انڈیا کی مسلم آبادی کی تعداد پاکستان کی مجموعی آبادی سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ اس مسلم آبادی کا عقیدہ، ثقافت اور تاریخ وہی ہے جو پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں کی۔ کیا اتنی بڑی تعداد میں مسلم آبادی رکھنے والے ملک کو دشمن ملک کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے؟

4۔ 1947 سے لے کر اب تک بھارتی مسلمان متواتر ہجرت کر کے پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ جب تقسیم کے ہنگامے سرد پڑ گئے تو انڈیا میں مسلمانوں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہجرت کا سلسلہ جاری رہا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ جاسوس بھی ہوں (ہمارا تسلسل سے دہرایا جانے والا سرکاری موقف اس تاثر کی تقویت دیتا ہے کہ پاکستان میں ہونے والی تمام بدنظمی، فسادات، حتیٰ کہ فرقہ وارانہ تشدد کسی بیرونی ہاتھ، گویا بھارتی ایجنٹوں کی کارستانی ہے)۔ معمول کے زمانے میں پاکستان میں رہنے والے مہاجروں کو انڈیا میں اپنے رشتے داروں سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے۔ سرحد کے آر پار چند لاکھ خاندان تقسیم ہیں۔ کوئی ملک اپنے

شہریوں کو کسی دشمن ملک میں آزادانہ آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا، اور نہ ہی دشمن ملک کے شہریوں کے لیے اپنی سرحدیں کھولی جاتی ہیں، اور نہ اُنہیں شہریت لینے کی اجازت دی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ پھر درسی کتابوں میں ارزاں کی گئی دانائی اور عملی تجربے کے درمیان اس قدر تفاوت طلبا کو متحیر کر دیتی ہے۔ کلاس روم میں اُنہیں بتایا جاتا ہے کہ انڈیا ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ عملی زندگی میں وہ دیکھتے ہیں کہ پاکستان اور انڈیا کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان میچ دیکھنے کے لیے شہری دیوانہ وار ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے والدین انڈین فلموں کے رسیا ہیں۔ اُن کے گھر میں وی سی آر پر بھارتی فلمیں بہت شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ وہ سنتے ہیں کہ بہت سے پاکستانی فنکار بمبئ میں انڈین فلموں میں کام کر رہے ہیں، نیز مہدی حسن، نور جہاں، ریشماں اور دیگر گلوکار انڈیا جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے جوان ہونے والے طلبا کے دل میں انڈیا کے لیے محبت اور نفرت کے ملے جلے جذبات ہوں گے، جبکہ اُن کے ذہن میں اپنے بڑوں کے لیے لاشعوری ناپسندیدگی پیدا ہو جائے گی کیونکہ اُن کے قول و فعل میں انتہائی تضاد تھا۔ اس طرح اُن کے کردار میں منافقت سرائیت کر جاتی ہے۔ ضروری تھا کہ اُنہیں ہمسایوں کے ساتھ پرامن بقائے باہمی اور اچھے تعلقات کا احساس دلایا جائے تا کہ وہ دیکھ سکیں کہ امن کی راہ میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ کوئی بھی معقول تعلیمی نظام طلبا کے ذہن میں نفرت پروان نہیں چڑھاتا۔ چاہے نفرت کی بنیاد حب الوطنی ہی کیوں نہ ہو، یہ ذہن کو آلودہ اور فکر کو مجروح کر دیتی ہے۔ نوخیز ذہن رکھنے والے طلبا کے لیے ایسی منفی سوچ تو اور بھی تباہ کن ہے۔

5۔ نوآبادیاتی دور کی مخالفت ابھارنا

تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم پر حقیقتِ احوال کھل جاتی ہے کہ درسی کتب لکھنے اور لکھوانے والوں کا مقصد کیا ہے۔ ان کتابوں کے ذریعے جدید ہندوستانی تاریخ اور مسلمانوں کی قوم پرستی کی جدوجہد کو ایسا روپ دیا جاتا ہے جو تاریخی حقائق کی دھوپ میں لمحہ بھر بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ التباس تاریخ میں کچھ رد و بدل، کچھ کانٹ چھانٹ اور کچھ ملمع کاری سے ٹکسال کیا جاتا ہے۔

1- 1957ء کی بغاوت کو جنگِ آزادی کا نام دیا گیا ہے۔ کچھ کتابیں تو ایک قدم آگے

بڑھاتے ہوئے اسے مسلمانوں کا جہاد قرار دیتی ہیں۔ ہر چند یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ غیر مسلموں نے اس میں بعد میں شرکت کی تھی۔

2۔ درسی کتب کے مطابق ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کا اختتام 1857ء کی جنگ میں شکست پر ہوا تھا۔ لیکن ایسا کہتے یہ حقیقت فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے ایک سو پچاس سال پہلے، اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے برِصغیر میں مسلمانوں کی حاکمیت رو بہ زوال تھی۔

3۔ یہ معلومات بھی چھپائی جاتی ہیں کہ شاہ عبدالعزیز کے بعد برِصغیر کے زیادہ تر علما نے انگریز حکومت کے خلاف کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا تھا۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر آزادی تک کے زیادہ تر شاعر اور دانشور انگریز حکومت اور ثقافت کے حامی تھے۔

4۔ طلبا کو نہیں بتایا جاتا کہ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کی علمی اور دینی نشاۃ ثانیہ میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ کلکتہ مدرسہ، کلکتہ محمڈن لٹریری سوسائٹی، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، سر سید احمد خان کی قائم کردہ تمام علمی تنظیمیں اور سوسائٹیز، علی گڑھ کالج، انجمن حمایتِ اسلام، ندوۃ العلما اور بہت سے دیگر ادارے اپنے قیام، تعاون، فنڈنگ، امداد اور سرکاری حوصلہ افزائی کے لیے انگریز سرکاری کے ممنون تھے۔

5۔ یہ بھی ذکر نہیں کیا جاتا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی منشور کے مطابق اس جماعت کے قیام کا مقصد برطانوی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری یقینی بنانی تھی۔

6۔ انگریز سرکار سے مسلمانوں کی وفاداری کی داستانیں درسی کتب سے غائب کر دی جاتی ہیں۔

7۔ درسی کتب میں ہرگز نہیں بتایا جاتا کہ ایک بڑی تعداد میں مسلمان نوجوانوں نے برطانوی ہند کی فوج میں شمولیت اختیار کی اور پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔

8۔ اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا جاتا کہ مسلمانوں کو ملنے والی ہر رعایت اور تحفظ انگریز نے دیا تھا نہ کہ کانگرس نے۔

9۔ طلبا کو یہ بات بھی نہیں بتائی جاتی کہ ایک بڑی تعداد میں اہم مسلمان مسلم لیگ کے حامی نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ فکری اعتبار سے یہ افراد مسلم لیگ کے رہنماؤں سے کہیں بڑھ کر باشعور تھے۔

10۔ طلبا کو بے خبر رکھا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے بہت گرم جوشی، بلکہ بے تابی سے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کو رام کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی سے اس کی شرائط پر معاہدہ کیا تھا۔

11۔ درسی کتب میں بہت زور دے کر بتائی جانے والی یہ بات درست نہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا۔ یہ بات بوجوہ فراموش کر دی جاتی ہے کہ ایک دھڑے نے بائیکاٹ، جبکہ دوسرے نے کمیشن کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔

12۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانانِ برصغیر نے آزادی کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 60-1858 اور پھر 22-1920ء کا عرصہ چھوڑ کر مسلمانوں نے برائے نام مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ 1857ء سے لے کر 1947ء تک اُنھوں نے بہت کم ریاستی جبر برداشت کیا۔ یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ ابتدائی برسوں میں مسلم لیگ کی تحفظ اور امان کی تلاش، اور آخری برسوں میں ایک الگ ملک کے لیے جدوجہد پرامن اور آئین کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے تھی۔ یہ جدوجہد درخواستوں، عرض داشتوں، جلسے جلسوں، مباحث، انتخابات، پارلیمانی مذکرات اور دلائل کی سند کے ساتھ کی گئی تھی۔ یہ کوئی باغیانہ نہیں، سیاسی جدوجہد تھی۔ یہ جنگ سیاست سے لڑی اور ووٹ کی طاقت سے جیتی گئی۔ کوئی مسلمان لیڈر انگریز سرکار کی جیلوں میں قید نہیں تھا؛ نہ مسلم عوام کو انگریز کی گولیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یقیناً 1947ء میں لاتعداد لوگ جاں بحق ہوئے، بہت سوں نے بے پناہ اذیت برداشت کی؛ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ قیامِ پاکستان کے لیے جنگ کر رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں پا کر اپنے گھروں سے ہجرت کر کے پاکستان کی طرف آ رہے تھے۔ وہ ہلاکتیں گروہی فسادات کا نتیجہ تھیں نہ کہ انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کا۔

جدید تاریخ کے بارے میں وسیع پیمانے پر کی جانے والی دروغ گوئی کا اصل مقصد ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ چونکہ کانگرس بجا طور پر انگریز مخالف تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آئی تھی؛ اس کے رہنما انتہائی قوم پرست تھے، اور اُنھوں نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں؛ اس لیے مسلم لیگ کو بھی ایسی ہی پہچان کی ضرورت تھی۔ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی جدوجہد کو بھی اسی رنگ میں پیش کیا جائے۔ مسلمان قوم پرستوں کو بھی انگریز سرکار کے باغی، جوشیلے، انقلابی اور اپنی ذات کو بھول کر دلیرانہ جدوجہد

کرنے اور استعمار کے پاؤں اکھاڑ دینے والے ہیروز کے طور پر پیش کیا جائے۔ مسلم لیگ کو انگریز مخالف تحریک قرار دیا جائے۔ افسوس، اس دکھاوے کے اس مورچے میں ہمیں تاریخ کی کمک حاصل نہیں۔ برصغیر میں ہونے والی تمام جدوجہد ایک آئینی لڑائی تھی جس میں پراپیگنڈا، جلسے، جلوس، بحث و مباحث اور انتخابات اہم ہتھیار، اور مذاکرات حتمی عامل تھے۔ جدوجہد کے دوران کانگرس نے کئی مواقع پر انگریز سرکار کے سامنے جسمانی مزاحمت کی، اور زخم کھائے، لیکن مسلم لیگ اس راہ پر کبھی نہ چلی۔

6۔ تحریک کی تمام کامیابی کو علی گڑھ اور یوپی سے منسوب کرنا

ہر درسی کتاب میں پائی جانے والی ایک مشترکہ خامی یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اٹھنے والی سیاسی، سماجی، فکری، مذہبی اور علمی تحریک کا سرا علی گڑھ تحریک سے ضرور ملایا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کو "پاکستان کا عظیم ترین مفکر" قرار دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خوشحال بنا دیا۔ پہلی کلاس سے لے کر چودویں کلاس تک کی ہر کتاب میں علی گڑھ پر کئی صفحات ہیں۔ کچھ میں تو پورا پورا باب اس کے لیے مختص ہے۔ یہ دعویٰ محض کراچی کے اردو بولنے والے مصنفین تک ہی محدود نہیں، بلکہ پنجابی اور پٹھان مصنفین بھی اپنے صوبوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں انہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

یقیناً ہماری تاریخ میں علی گڑھ کا کردار فراموش کرنا ناممکن ہے۔ ہر مورخ اس سے آگاہ ہے؛ اور اسلامی نشاۃ ثانیہ میں اس کے کردار کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن مسلم انڈیا میں ہونے والی ہر ترقی اور مفید پیش رفت کا کریڈٹ علی گڑھ کے نام کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ علی گڑھ کو مسلمانوں کی بیداری اور آزادی کی جدوجہد کی بنیاد قرار دینے والوں کے سامنے یہ سوالات رکھنے ضروری ہیں:

1۔ سرسید احمد خان نے 1857ء کی شورش میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا یا مقامی گروہوں کا؟ اگر انھوں نے مقامی گروہوں کے خلاف استعماری قوت کا ساتھ دیا تھا تو کیا انہیں مسلم قوم پرستی یا پاکستان کا ہیرو قرار دینا درست ہے؟

2۔ کیا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ انگریز حکومت کی سرپرستی اور تعاون سے تعمیر کیا گیا تھا یا نہیں؟ کیا ایک طویل عرصے تک اسے انگریز پرنسپل نہیں چلاتے رہے تھے؟ اور کیا اُن میں سے

زیادہ تر کو مقامی انگریز حکومت کی سفارش پر نہیں رکھا گیا تھا؟

3۔ کیا علی گڑھ تحریک کی انتظامیہ ایسی اشرافیہ کے ہاتھ نہیں تھی جس نے برطانوی سروس اور نظام حیدر آباد کے دربار سے فائدہ اٹھایا تھا؟ کیا وہ سب انگریز سرکار کے پکے وفادار نہیں تھے؟

4۔ کیا سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو اُس وقت سیاست سے الگ رہنے کا نہیں کہا تھا جب انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی اور ہندوستان میں سیاسی دور اور آئینی جدوجہد کا آغاز ہوا تھا؟ کیا اس نصیحت میں کوئی دانائی تھی جبکہ بنگال میں مسلم سیاسی جماعتیں پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں، اور نواب عبدالطیف خان اور سید امیر علی جیسے افراد سیاسی میدان میں قدم رکھ چکے تھے؟

5۔ کیا جنرل ضیاالحق کے اسلام کے نفاذ کا خیر مقدم کرنے والے پاکستانیوں کے لیے سرسید کی اسلام کی جدید تشریح قابل قبول ہے؟ اگر سید احمد خان ''پاکستان کے سب سے پہلے اور بڑے مفکر'' تھے تو اُن کی اسلام کی تشریح ہماری کتابوں میں کیوں موجود نہیں؟

6۔ کیا آل انڈیا مسلم لیگ میں یو پی کے رہنماؤں کے غلبے کی وجہ سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد نہیں ہوئے؟

(i) مسلم لیگ باقی ہندوستان، بلکہ مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی اپنی جڑیں مضبوط نہ کر سکی کیونکہ دیگر صوبوں کے سیاست دانوں کو پسند نہیں تھا کہ یو پی کے رہنما اُن پر حکم چلائیں؛ (ii) لیگ کو بنگال، پنجاب، این ڈبلیو ایف پی اور دیگر صوبوں میں اپنی شاخیں کھولنے اور عوام سے رابطے کرنے کی اجازت نہ دی؛ (iii) سیاسی توجہ کا تمام تر ارتکاز مسلم اقلیتی صوبوں کی طرف تھا، چنانچہ دیگر صوبوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا گیا؛ (iv) 1916ء میں لکھنو معاہدہ کیا جس کے پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے اثرات آئندہ آنے والے زمانوں میں بھی محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

7۔ کیا یہ بات درست نہیں کہ یو پی کے بڑھتے ہوئے کردار کی وجہ سے یہ تاثر تقویت پا تا گیا کہ صرف اُنہی کی ثقافت ہندوستان میں اسلامی ثقافت کا سرچشمہ ہے؟ پاکستانی ثقافت بھی اسی چشمے سے پھوٹی ہے (مندرجہ ذیل سوالات میں اس نکتے کو مزید اٹھایا گیا ہے)۔

8۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوستانی اسلام میں فرقہ واریت اور دھڑے بندی کی ابتدا یو پی

سے ہوئی؟ کیا دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اہل قرآن اور دیگر مسالک کے سرچشمے یوپی سے نہیں پھوٹے؟

9۔ کیا یوپی کو تمام تر سیاسی بیداری کے مرکز کے طور پر پیش کرنا طلبا کو ہندوستان کے دیگر حصوں میں پیش آنے والے سیاسی واقعات کے بارے میں اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں؟ کیا یہ انتہائی متعصبانہ رویہ نہیں تھا؟ اس تعصب کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے مسلمان دیگر علاقوں کے مسلمانوں سے دور ہوتے گئے، اور یہی رویہ آخر کار بنگلہ دیش کے قیام کا باعث بنا۔ کیا پاکستانیوں پر ایسے نظریات مسلط کرنے کی پالیسی نے پاکستان دولخت نہیں کر دیا؟ (میں نے اگلے حصے میں اس معاملے کو مزید کھنگالا ہے)۔ کیا اس سوچ کی وجہ سے سندھی محسوس نہیں کر رہے کہ انہیں نظرانداز کیا جا رہا ہے، اور کیا ایک بار پھر 1971ء جیسے حالات پیدا نہیں کیے جا رہے؟

7۔ پاکستان پر ایک نئی ثقافت مسلط کرنا

سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جانے والی زیادہ تر کتابیں یہ باور کراتی ہیں کہ یوپی پاکستانی کلچر کا سرچشمہ تھا۔ واضح پیغام یہ ہے کہ پاکستانیوں کو یہ کلچر اپنا لینا چاہیے، لیکن کوئی بھی وضاحت نہیں کرتا کہ یہ اردو زبان کے علاوہ اور کیا تھا؟ عملی طور پر درسی کتب کے ذریعے اس کلچر کو نافذ کیا جا رہا ہے۔

اس کی وجہ سے کچھ سنجیدہ نوعیت کے مسائل پیدا ہوئے ہیں:

1۔ حقیقت یہ تھی کہ یوپی کے صوبے گزرے ہوئے مغل دور کی مدہم، دھندلی بلکہ داغدار جھلک لیے ہوئے تھے۔ وہ کوئی طاقتور، ابھرتا ہوا، صحت مند اور ترقی پسند کلچر نہیں تھا۔ اور پھر معاشرے کے صرف بالائی طبقے نے ہی اسے اپنایا تھا۔ یہ طبقہ عام آدمی، جسے عامیانہ زبان میں ''بھیا'' کہا جاتا، کو حقارت کی نظر سے دیکھتا۔ یہ طبقاتی تہہ بہت سخت تھی لیکن اس کے نیچے کچھ نہیں تھا۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کو اشرافیہ کے اس کھوکھلے کلچر سے کوئی سروکار نہ تھا، اور نہ ہی یہ پاکستانیوں کے لیے قابل قبول تھا، لیکن اسے سرکاری مشینری کے ذریعے ذہنوں میں اتارا جاتا۔

2۔ ایم اے او کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی کے اثرات کے لیے محض مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ دیگر صوبوں کے بہت کم طلبا نے ان اداروں میں داخلہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے

تعلیمی ادارے تھے جو اپنی اپنی جگہ پر طلبا کی تعلیمی ضروریات پوری کر رہے تھے۔

3۔ مذہبی اصطلاح میں اس خطے سے فرقہ واریت نے جنم لیا۔ سرسید احمد خان کو چھوڑ کر دیگر رہنماؤں نے اسلام کی قدامت پسند تشریحات پر تکیہ کیا۔

4۔ اس کلچر میں برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا عنصر بہت طاقتور تھا۔ اس سوچ کے جراثیم بعد میں بھی ہر آقا کو سلام کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ تاہم ہندوستان، اور بعد میں پاکستان، کے دیگر کلچر ایسا خوشامدی رویہ نہیں رکھتے۔

5۔ یو پی کے صوبوں کا سیاسی کلچر مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان مخالف رہنماؤں اور تنظیموں سے لبریز تھا۔ اس نے کانگرس نواز دیوبند مکتبہ فکر اور جمیعت علمائے اسلام اور جامعہ ملیہ جیسے مسلمان قوم پرست پیدا کیے۔ یہ درست ہے کہ این ڈبلیو ایف پی میں سرخ قمیص تحریک، اور پنجاب کے احرار بھی قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ لیکن 1947ء میں مسلم لیگ کی کامیابی نے سرخ قمیص کو کمزور، اور احرار کو عملی طور پر ختم کر دیا۔ لیکن یو پی کا سیاسی کلچر اپنانے سے وہ عناصر بھی پاکستان کے عقائد اور نظریات پر اثرانداز ہونے لگے جن کا پاکستان کی عوامی اور تاریخی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

6۔ یو پی کی اصل، مرکزی اور جاندار قوت اس کی زبان اردو تھی؛ لیکن پاکستان میں عوام کو باہم یکجا کرنے میں ناکامی پر اردو اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔ اس کی چار وجوہات تھیں: اس نے پنجابی کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کرنے کی کوشش کی (اس کی تفصیل اگلے باب میں)؛ بلوچی کو تحریری زبان کے طور پر فروغ پانے سے روکا؛ سندھ میں ناراضگی پیدا کی؛ اور مشرقی پاکستانیوں کو پاکستان سے دور کر دیا۔ کیا اس نام نہاد ''قومی زبان'' کی اہمیت ادا کی جانے والی اس قیمت کے مطابق تھی؟

تین مزید سوال ذہن میں الجھن پیدا کرتے ہیں:

1۔ 1947ء میں یو پی کے رہنما اپنے ساتھیوں کو بے یارومددگار چھوڑ کر پاکستان کیوں چلے آئے؟ کیا تاریخ کے اُس اہم موڑ پر وہاں رہ جانے والے مسلمانوں کو اُن کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا یہی ہے کہ یو پی کلچر؟

2۔ یو پی سے اتنے زیادہ افراد نے پاکستان کی طرف ہجرت کیوں کی؟ وہ ملک میں داخل ہونے والا سب سے بڑا گروہ تھے۔ وہ تقسیم ہونے والے پنجاب کے لٹے پٹے مہاجرین نہیں تھے، اور نہ

نہ انہیں اُن کے گھروں سے نکالا گیا تھا۔ وہ قتل و غارت، لوٹ مار اور تشدد کا بھی نشانہ نہیں بنے تھے۔ انھوں نے اُس قیامت کی جھلک تک نہیں دیکھی جس سے پنجابیوں کو گزرنا پڑا تھا۔ تو پھر اُنھوں نے کسی سیاسی مجبوری کے بغیر ایک نئے ملک میں آباد ہونے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ آج بھی موقعہ ملنے پر لوگ وہاں سے آکر پاکستان میں آباد ہوتے رہتے ہیں۔

3۔ سب سے اہم، یوپی سے آنے والے مہاجرین نے اُس ملک کی ثقافتوں کو اتنی حقارت اور نفرت کی نظر سے کیوں دیکھا جس نے اُنہیں خوش آمدید کہا تھا، ملازمت کے مواقع فراہم کیے تھے، اُنہیں زمین اور جائیداد الاٹ کی تھی، اور تجارت اور معیشت میں اہم مواقع فراہم کیے تھے؟

اس رویے میں ایک دہرا تضاد پایا جاتا ہے۔ اگر پاکستان کو تشکیل دینے والے علاقوں کا کلچر، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یوپی کے کلچر سے نکلا تھا تو پھر ان مہاجرین کے پاس مقامی کلچر کو ناپسند کرنے، مقامی باشندوں کو کمتر، غیر مہذب اور گنوار اور خود کو تہذیب یافتہ سمجھنے، اپنے ماضی پر فخر کرنے اور مقامی زبانیں سیکھنے سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ دوسری طرف اگر یوپی کا کلچر اتنا ہی تہذیب یافتہ اور ارفع تھا کہ وہ گنوار اور غیر مہذب سندھیوں، پٹھانوں اور پنجابیوں کے درمیان رہنے میں دقت محسوس کرتے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ اس ملک کا مقامی کلچر یوپی کے کلچر سے نہیں نکلا تھا۔ دونوں صورتوں میں یہ سوال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ وہ اپنے گھر بار اور اعلیٰ و ارفع کلچر چھوڑ کر غیر مہذب پاکستانیوں کے درمیان کیوں آ گئے؟ یقیناً اس وضاحت کا کلچر سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس نئی سرزمین پر دولت کمانے کے نئے امکانات کی تلاش میں آئے تھے۔ مہاجر قومی موومنٹ کے بارے میں ہونے والے انکشافات سے اُن کے ''سلجھے ہوئے کلچر'' کی کافی آگاہی ملتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی پاکستانی اس کلچر کو اپنانا، یا اپنانا پسند کرے گا کہ اُن کی تہذیب یوپی کلچر سے پھوٹی ہے۔

8۔ دروغ گوئی

ان صفحات میں، میں نے ابواب اور اسباق کے سینکڑوں حوالے دیے ہیں کہ ہماری درسی کتب مسخ شدہ تاریخ سے بھری ہوئی ہیں۔ جن تاریخوں کی بہت آسانی سے تصدیق ہو سکتی تھی، اُنہیں بھی توڑا مروڑا گیا۔ جن حقائق کا ہر تعلیم یافتہ شخص کو علم ہونا چاہیے، انہیں بوجوہ مسخ کیا گیا، اور ان سے صفحات

کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ عام فہم کو ناگوار گزرنے والی تشریحات کی کثرت ہے۔ ان تمام چیزوں کی وضاحت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مصنف لاعلمی یا تعصب کا شکار تھا۔ قومی سطح پر پڑھائی جانے والی درسی کتب میں یہ جواز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم کچھ بیانات ایسے ہیں جو قطعی دروغ گوئی کے زمرے میں آتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اسناد اور طویل تدریسی تجربہ رکھنے والے کئی ایک پروفیسر صاحبان کا اصرار ہے کہ پاکستان نہ صرف ایک اسلامی ریاست ہے بلکہ ''اسلام کا قلعہ'' بھی ہے۔ اُنھوں نے حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ایک پروفیسر صاحب طلبا کو بتاتے ہیں کہ اردو کی عوامی مقبولیت کے سامنے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں ماند پڑ رہی ہیں، اور وہ یہ دیکھ کر نہایت طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ لندن سے ایم اے اور انڈیانا سے پی ایچ ڈی کرنے والے ایک پروفیسر صاحب کا اصرار ہے کبھی انڈیا بھی پاکستان کا حصہ تھا۔ کسی مجسٹریٹ کی طرح وہ بیک جنبش قلم تاریخ اور جغرافیے کو ''سبق'' سکھانے پر خوشی سے نہال دکھائی دیتے ہیں۔

یہ مبالغہ آرائی، لفاظی اور تحریف درگزر کے لائق معمولی غلطی ہرگز نہیں۔ یہ جان بوجھ کر گھڑے گئے جھوٹ ہیں جن کا مقصد طلبا کو حقیقت سے گمراہ کرنا ہے۔ قہر یہ ہے کہ ان طلبا نے سکول میں علم حاصل کرنے اور اپنا کیریئر بنانے کے لیے داخلہ لیا تھا۔ تعلیمی زندگی کے دوران وہ ایسے مسخ شدہ حقائق سنتے، پڑھتے اور ازبر کر لیتے ہیں، لیکن بعد میں جب اُنہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کچھ جھوٹ تھا تو اُن کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟ اُن کے ذہن میں مندرجہ ذیل ردِعمل پیدا ہوتا ہے:

1۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ جھوٹ تو تعلیم کا حصہ ہے تو وہ خود بھی جھوٹ بولنے کی عادت اپنا لیتے ہیں۔ ان درسی کتب سے تعلیمی سرگرمی مسخ شدہ ذہن کے گمراہ افراد پیدا کرتی ہے۔ جب تک بچے جوان ہو کر ''ذمہ دار شہری'' بنتے ہیں، دروغ گوئی اُن کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ بن چکی ہوتی ہے۔

2۔ وہ اپنے اساتذہ اور مصنفین کو جھوٹے انسان سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کا کتاب پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ بعد میں، عمر بھر وہ کسی کتاب پر اعتماد نہیں کرتے؛ وہ انہیں جھوٹ کا پلندہ سمجھتے ہیں۔ کتابوں سے محبت پیدا کرنے کی بجائے ہم اُنہیں کتابوں سے متنفر کر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ جھوٹ اساتذہ پڑھاتے اور سکھاتے ہیں، حقیقت کھلنے پر طلبا کے دل سے اُن کا احترام جاتا رہتا ہے۔ وہ انہیں سچائی کے سرچشمے کی بجائے دروغ گوئی اور غلط بیانی کی علامت سمجھنے لگتے ہیں۔ تاہم سکول کا نظم وضبط

اور امتحان پاس کرنے کی مجبوری اُنہیں استاد کے بارے میں منفی رائے دل میں چھپائے رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وقتی طور پر وہ خوف کے مارے اُن کا احترام کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ ''تجربہ'' اُنہیں منافقت کی راہ سکھا دیتا ہے۔ اپنی بالغ زندگی میں وہ اسے دہراتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے باس، پارٹی لیڈر، سرکاری افسر اور قائد کے سامنے سرنگوں رہتے ہوئے اپنا وقت نکال لیتے ہیں، جبکہ اُس دوران وہ دل سے سمجھتے ہیں کہ وہ غلط ہیں۔

پینتالیس سال پر محیط تعلیمی دور نے کم و بیش ہر پاکستانی کو دروغ گو بنانے کے علاوہ منافقانہ رویے سکھا دیے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی عادت اُن کے دماغ، کردار اور فطرت میں رچ بس گئی ہے۔ یقیناً درسی کتب نے اپنا ''فرض'' خوب ادا کیا ہے۔ معلم، تعلیم اور تعلم کے کیا کہنے!

درسی کتب جھوٹ کیوں بولتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ہمارے اندر پاکستانی کردار اور کلچر کے کچھ مستقل خصائل پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ ایک عام پاکستانی جذباتی انسان ہوتا ہے، اور جذبات کی دنیا میں ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ جذبات اور جذبات کا ہر وقت برملا اظہار اُس کی نجی اور عوامی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ اُس کی روزمرہ کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ وہ گھر پر جھگڑتا ہے؛ ہنستے وقت پرشور قہقہہ لگاتا ہے؛ دوستوں کے ساتھ بلند آواز میں باتیں کرتا ہے؛ پارٹیوں اور دعوتوں میں انتہائی باتونی واقع ہوتا ہے؛ دفتر میں اپنے ساتھیوں پر چلاتا ہے؛ کسی کے انتقال کر جانے پر بین ڈالتا ہے۔ اُس کی سیاسی زندگی اُس کی سماجی زندگی کا عکس ہوتی ہے۔ جلسوں میں ہونے والا بے ہنگم شور، فلک شگاف نعرے بازی، چیخ و پکار، گلیوں میں ہنگامے، پرشور سیاسی بحث و تکرار، تلخ کلامی، گالم گلوچ، اشتعال انگیز الفاظ، حریف سیاسی جماعتوں کے درمیان جھگڑے، فرقہ وارانہ قتل و غارت، سیاسی دہشت گردی، اسمبلیوں میں شور شرابا، ایک دوسرے پر غداری اور آئین سے بغاوت کے الزامات ایک معمول ہے۔

مذہبی زندگی کی طرف دیکھیں۔ مسجد میں ملا حضرات خطبہ دیتے ہوئے پوری قوت سے گرج رہے ہوتے ہیں۔ مسجد کی چھت پر لگے چھے لاؤڈ سپیکرز اُن کی آواز کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔ مذہبی رہنما جلسوں سے اس طرح خطاب کرتے ہیں گویا شیطان جنگ لڑ رہے ہیں؛ گلے کی نسیں پھولی ہوئی، چہرہ سرخ، آنکھوں میں عسکری چمک، جھاگ اُڑاتا ہوا منہ۔ جوش سے وجد میں آئے ہوئے سامعین فلک شگاف نعروں سے تال میں تال ملاتے ہیں تو کہیں جا کر جلسے کا سماں بندھتا ہے۔ کالجوں اور جامعات کی

طرف دیکھیں۔ اساتذہ اپنی رائے پر جامد، غصیلے، طلبا گستاخ، کچھ مسلح، لیکچرز کے دوران مداخلت۔ سیمینار گھٹیا جملے بازی کا میچ۔ امتحانات کے دوران نقل ایک منظم سرگرمی۔ یہاں پیسہ بھی چلتا ہے اور طاقت اور تشدد بھی۔

ادیبوں کو دیکھیں۔ اُن کی باہم آویزش سفلہ پن کی حد تک اتر جاتی ہے۔ ادبی تنقید اس طرح لکھتے جیسے زیرِ نظر مصنف اُن کا ذاتی دشمن ہو۔ اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کی کردارکشی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اُنھوں نے محض اپنی انا کی تسکین کے لیے پرانی اور قابلِ احترام ادبی تنظیموں، جیسا کہ حلقہ اربابِ ذوق کو دھڑے بندی کا شکار کر دیا۔ چنانچہ تیز رفتار، غیر متوازن، غیر محفوظ، جوشیلی، غصیلی، تلون مزاج زندگی برق رفتاری سے آگے بڑھتی رہتی ہے؛ عقل اور معقولیت کی دم بھر سمائی نہیں۔

موجودہ بحث کی مناسبت سے ایک اور قومی صفت کا تذکرہ برمحل ہوگا، جو کہ خودستائی ہے۔ نرگسیت کا شکار ایک عام پاکستانی اپنے بارے میں بہت بلند رائے رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے حصار سے نہیں نکل پاتا۔ خودترحم اور خودستائی اُسے کسی اور کی طرف دیکھنے، سمجھنے اور متوازی سوچ اپنانے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ وہ خود کو ایک مکمل انسان، جبکہ دوسروں کو داغدار اور ادھورے انسان سمجھتا ہے۔ مجھے آج تک کوئی منکسر المزاج پاکستانی دکھائی نہیں دیا۔ بعض کو تو اپنی عاجزی اور انکساری پر بھی ناز ہوتا ہے۔

اس رویے کا فطری نتیجہ عدم برداشت ہے۔ اپنے نظریات کے علاوہ دیگر تمام منفی، ناقص اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ زندگی میں دلیل اور منطق کا کوئی گزر نہیں۔ خود پارسائی عقل و خرد کو تسخیر کر چکی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ دھوکہ دہی کا ارتکاب کرتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ اس نے شرمندہ ہونا سیکھا ہی نہیں۔ اُس کا اصرار ہے کہ وہ درست ہے، اور پیہم اور پرزور اصرار اور تکرار سے وہ خود کو درست ثابت کر سکتا ہے۔

ہماری اجتماعی زندگی پر یہ تبصرہ محض لفاظی نہیں، حقیقت ہے۔ اس کی جوہری ترویج ہماری درسی کتب اور روزمرہ زندگی سے ہوئی ہے۔ خراب ماحول ذہن کو منفی بنا دیتا ہے؛ جبکہ منفی ذہنیت ماحول کو مزید بگاڑ دیتی ہے۔ دوطرفہ بگاڑ کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مندرجہ بالا قومی خصائل درسی کتب کا

شاخسانہ ہیں۔درسی کتب لکھنے والے افراد قومی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں، جبکہ تشکیل پانے والا قومی مزاج ایسے افراد کو سامنے لاتا ہے، اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ غیر نصابی کتب بھی اس کے برعکس معیار کی حامل نہیں ہوتیں، اور نہ ہی ہوسکتی ہیں۔ درسی کتب کا معیار، انداز، تحریف، مواد اور لفاظی کی جھلک علمی، تحقیقی اور ادبی تحریروں میں ملتی ہے۔ تاریخ نویس اور ادیب بھی اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ تمام معلم جانتے ہیں کہ سکول قوم کی نرسری ہوتی ہے۔ پاکستان میں لکھی گئی درسی کتب پاکستانی ہی بنائیں گی، نہ کہ فرانسیسی۔ آپ جو بوئیں گے، وہی کاٹیں گے۔ اپنی نسل کو آپ جو کہانیاں سنائیں گے، ایک دن تاریخ بن جائیں گی۔

ایک مرتبہ فرانسیسی ڈرامہ نویس، بریخت نے کہا تھا کہ ماضی کی تمام الجھنیں رفع کر لینی چاہئیں تاکہ ہم آگے بڑھ سکیں۔ وہ درست کہتے تھے۔ ماضی کو جان کر ہی ہم حال اور مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔ لیکن پاکستانی اپنے ماضی کو دروغ گوئی، غلط بیانی، مصلحت کوشی، اور ابہام کی دھند میں پنہاں رکھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ حقائق کی ہوا اس دھند کو کہیں اُڑا نہ لے جائے۔ اُن کا تاریخی جائزہ اصولی نسیان، من پسند فراموشی اور بامقصد خاموشی پر مبنی ہے۔ جب اُنہیں اپنے ماضی کے بارے میں لکھنا پڑے تو وہ حسبِ معمول اور حسبِ عادت خطیبانہ انداز میں یک طرفہ تصدیق، دوٹوک تنقید، بے بنیاد قطعیت، جذباتی تعریف اور سفلی ہجو کرتا ہے۔ اُن کی تقریر یا تحریر لارڈ بیکر کی تقریر سے مشابہ ہوتی ہے جس پر گریٹن نے بہت خوب تبصرہ کیا تھا: ''جذبات اور اشتعال کی افراط، عقل اور منطق کی تفریط۔''

مخفی رکھا گیا مواد

درسی کتب جو کہتی ہیں، اور جس انداز سے کہتی ہیں، وہ اس کا مواد ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ طالبعلم معلومات پہنچانا چاہتی ہیں۔ جہالت کے سماج میں وہ اس قسم کے علم کی ترویج کر کے اپنا تعمیری کردار ادا کرتی ہیں۔ تاہم وہ طلبا سے کچھ دانائی مخفی بھی رکھتی ہیں۔ اسے ان کا منفی کردار کہہ لیں۔ ہماری تاریخ میں بہت کچھ ہے جو درسی کتب میں نہیں بتایا جاتا۔ میں تحریف اور مسخ شدہ حقائق کی نہیں، چھپائے گئے مواد کی بات کر رہا ہوں۔ ماضی اور حال کے بہت سنجیدہ نوعیت کے معاملات ان کتابوں میں بیان

نہیں کیے جاتے۔اس حصے میں، میں صرف تین اہم موضوعات کا ذکر کر رہا ہوں جنہیں درسی کتب میں شامل نہیں کیا گیا۔

1۔ کلچر اور احساس کمتری

تواتر سے دہرائے جانے والے دعوے کہ یو پی کے لوگ قیام پاکستان کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا ہراول دستہ تھے، اور یہ کہ اُن کا کلچر پاکستانی کلچر کا سرچشمہ ہے، نے مقامی آبادی کے لیے شناخت کا بحران پیدا کر دیا۔موضوع کی وسعت کا ایک کتاب میں احاطہ ناممکن ہے،اس لیے میں صرف اس بحران کے پنجاب پر اثرات کے جائزے تک محدود رہوں گا۔ اور پھر میں اس سے بخوبی واقف بھی ہوں۔

مندرجہ بالا دعوے سے پیدا ہونے والے عوامل نے ملک کے سب سے بڑے صوبے کو ژولیدہ فکری کا شکار کر دیا ہے:

1۔ پنجابی شدید احساس کمتری میں مبتلا ہے۔اُس بتایا جاتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں اُس کا کردار برائے نام تھا۔اُس نے کوئی قابل ذکر سرگرمی نہیں دکھائی۔اُس نے برس ہا برس تک مسلم لیگ کی حریف اور آزادی کے راستے میں اہم رکاوٹ، یونینسٹ پارٹی کی حمایت کی تھی۔اُس نے تقسیم کے لیے صرف 1946ء میں ووٹ دیا تھا، چنانچہ اُس کا شمار حب الوطنوں کی پچھلی صف میں ہوتا ہے۔وہ سست رو ہے،لہٰذا اُسے اس کا احساس دلاتے رہنا چاہیے۔اُس کا مقامی کلچر بھی کمتر ہے۔اس کے اچھے حصے وہ ہیں جو دہلی اور یو پی کے صوبوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔ پنجابی نے قومی زبان کے مسئلے پر بنگالی کو مسترد کرتے ہوئے اردو کے حامیوں کا ساتھ دیا؛ اور جب اس پر قدرے رعایت دی گئی تو اُس نے اردو کے حامیوں کے ساتھ مل کر اس کا سوگ بھی منایا۔ایسا کرتے ہوئے اُس نے مشرقی پاکستان میں اپنے لیے شدید دشمنی پیدا کر لی۔تاہم اُسے اس کی پروا نہیں تھی۔

2۔ اپنے تعلیمی اداروں، ادب، صحافت اور روزمرہ زندگی میں اردو کو قبول کرتے ہوئے اس نے اپنی زبان کو تاریخ کی ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔سندھ میں اردو کی حمایت کرتے ہوئے اُس نے سندھیوں کی ناراضی مول لی۔سندھیوں نے اُسے اپنے صوبے پر قبضہ کرنے ،اور اردو بولنے

والے مہاجرین کا ساتھی قرار دیا۔

3۔ اردو بولنے والے طبقے کے یوپی کلچر کی برتری کے دعوے کو چیلنج کرنے میں ناکامی پر اُس نے تسلیم کرنا شروع کر دیا کہ اُس کا اپنا کوئی کلچر نہیں تھا۔ اس طرح پنجابی نے اپنے ماضی اور اپنے کارناموں سے رابطہ توڑ لیا۔

4۔ سیاست میں اردو بولنے والے طبقے کی بالادستی رکھنے والی وفاقی حکومت میں بخوشی شامل ہو کر (a) مغربی پاکستان میں ون یونٹ قائم کیا، اور ایسا کرتے ہوئے سندھ، بلوچستان اور این ڈبلیو ایف پی کو ناراض کر لیا؛ (b) اپنے صوبے کی شناخت کھو دی؛ (c) مشرقی پاکستان کے خلاف ون یونٹ قائم کرنے کے جواز کی بھرپور حمایت کی۔ اردو بولنے والے طبقے کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے پنجابی نے سنگین غلطیاں کیں: اس نے بنگالیوں کو اپنا دشمن بنا لیا، چنانچہ چھوٹے صوبے ملک کے اس سب سے بڑے صوبے سے برگشتہ ہو گئے۔ مجموعی طور پر اُس نے محض ایک چھوٹے سے گروہ (جو 1950ء کی دہائی میں آبادی کا محض تین فیصد تھا) کی خوشنودی کے لیے خود کو ملک کے تمام حصوں میں غیر مقبول بنا لیا۔

5۔ اردو ادب کی تخلیق میں مشغول ہوتے ہوئے اُس نے پنجابی زبان کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ اس طرح اُس نے اردو بولنے والے طبقے کو یہ پیغام دیا کہ وہ بھی پنجابی کو مسترد کرنے میں اُن کے ساتھ ہے، اور یہ کہ پنجابی ادب کمتر درجے کا ہے۔

کسی قوم کے خود کو مسترد کرنے کے اس واقعے کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن کیا یہ واقعی خود کو مسترد کرنا تھا؟ کیا ایسا کرتے ہوئے پنجابی نے واقعی کوئی قربانی دی تھی؟ کیا اُس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے کلچر اور زبان کو نظرانداز کرنا گوارا کیا تھا؟ نہیں، مجھے اس میں قربانی کا کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا۔ پنجابی نے یہ سب کچھ بہت خوشی، اعتماد اور احساس تفاخر کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے پاکستان کے کسی بھی گروہ سے آگے بڑھتے ہوئے اردو کو اپنی روزمرہ بول چال کا ذریعہ بنایا۔ حتیٰ کہ اس کے گھروں میں بھی بولی جانے لگی۔ اس تبدیلی کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اردو میڈیم سکولوں میں پڑھنے والے پٹھان بچے گھروں میں پشتو بولتے تھے؛ اردو میڈیم سکولوں میں جانے والے سندھی اپنے معاشرے اور گھروں میں اپنی زبان کے ساتھ جڑے رہے۔ پنجابی بھی 1855ء سے اردو میڈیم سکولوں میں پڑھ رہا تھا۔ اس نے اردو کو اپنی روزمرہ کی زبان نہیں بنایا تھا۔ یہ رجحان 1960ء کی

دیہاتی میں کراچی اور اسلام آباد کے دباؤ کی وجہ سے پروان چڑھا۔ اس کی وجہ بنگال مخالف جذبات تھے جن کے خلاف اس نے اردو بولنے والے طبقے کا ساتھ دیا تھا۔ بہر حال یہ فیصلہ بھی پنجابی نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔

اس نے اردو کا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُس کا اپنا کلچر یا تو بہت کم تر ہے یا بالکل ہی موجود نہیں۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی، اور پنجاب میں سکول کا نظام قائم کرنے کے لیے انگریز سرکار کے لائے گئے دیگر افراد کے پراپیگنڈے کا پھل ملنا شروع ہو گیا تھا۔ گزشتہ سو سال کے دوران کی گئی پر فریب کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں۔ اردو بولنے والے طبقے کو خوش کرنے کے لیے پنجابی دانش نے اپنی، اور خطے میں ہزاروں سالوں سے اپنے آباؤ اجداد کی بولی جانے والی زبان کی موت کا سامان کر لیا۔

پنجابی یہ سوچ کر خوش تھا کہ پاکستان میں بالا دستی حاصل کرنے کی کوشش میں اردو اس کے ترکش کا اضافی موثر تیر ثابت ہوگی۔ اُسے ملک میں سب سے بڑی آبادی ہونے کا بھی امتیاز حاصل تھا؛ اس کی فوج اور سول سروس میں اکثریت تھی۔ اردو زبان کا ہتھیار میسر آنے سے اُس کی فتح مکمل ہو جاتی (اگرچہ اس کوشش میں اُس نے اردو بولنے والے طبقے کو خود کو فتح کرنے کا موقع دے دیا)۔ اب وہ ملک کا سب سے بڑا لسانی اور ثقافتی دھڑا بن چکا ہے۔ کیا پنجابی نے کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ اس کی ''فتح'' درحاصل اُس طبقے کی جیت ہے جو اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا اور اپنی نجی گفتگو میں اسے ''پنجابی ڈھگا'' کہتا تھا؟ شاید اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب پنجابی خوش ہے کہ ''قومی زبان'' بولنے کی وجہ سے اُسے بھی ملک کا ایک معزز شہری سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ اُس نے نام نہاد عزت اور شرافت حاصل کرنے کے لیے اپنی تاریخ اور ثقافت کی قربانی دی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ کبھی اس قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرے، چاہے اردو میں ہی کیوں نہ سوچنا پڑے۔

2۔ قومی ضمیر سے بنگال کی بے دخلی

اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں درسی کتب سب سے تباہ کن اور ناقابل معافی غلطی کا انتخاب کروں تو میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ان کتابوں میں مسلم بنگال کی غیر موجودگی کی نشاندہی کروں۔ چاہے

پرتلی ہیں 1971ء سے پہلے شائع ہوئی تھیں یا بعد میں، وہ حقیقتاً طور پر بنگال کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کوئی جگہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ جہاں ناگزیر تھا، وہاں بھی بنگال کا ذکر محض سرسری طور پر کیا گیا ہے۔

میں سب سے پہلے تو قارئین کے سامنے بنگال میں انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے والی پیش رفت کا طائرانہ جائزہ پیش کرتا ہوں تاکہ اُنہیں علم ہو سکے کہ ہماری حالیہ تاریخ میں بنگالی مسلمانوں کا کیا کردار رہا۔ صرف تب ہی اُنہیں پتہ چلے گا کہ ہماری درسی کتابیں لکھنے والوں نے کس درجہ ناانصافی کا مظاہرہ کیا ہے۔

انیسویں صدی میں بنگال میں ہونے والی مذہبی اصلاحات کا مدعا ایک طرف انگریز مخالف تحریک کو تقویت دینا تھا تو دوسری طرف اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کرنا۔ مولوی کرامت علی کا شمار چند گنے چنے خالص اصلاح پسندوں میں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سعودی عرب سے اٹھنے والی وہابی تحریک سے متاثر ہوں، یا سید احمد بریلوی کی نام نہاد تحریک جہاد سے، لیکن اُن کا سیاسی طور پر کسی سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ مقامی سرزمین اور حالات سے ابھرے تھے۔ شمالی ہندوستان کے علما کی منفی سوچ کے برعکس اُنھوں نے انگریز راج میں بنگال کو دارالحرب قرار دیا تھا۔

حاجی شریعت اللہ (1840-1781) نے فرائضی تحریک کے ذریعے کسانوں کو جمع کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ چونکہ بنگال دارالحرب ہے، اس لیے یہاں جمعہ اور عید کی نمازیں ادا نہیں کی جا سکتیں۔ اُنھوں نے اپنے پیروکاروں کو انگریزوں اور ظلم و جبر ڈھانے والے ہندو آقاؤں کے خلاف جہاد کی تلقین کی۔ اس طرح حاجی شریعت اللہ نے سب سے پہلی سیاسی تحریک کے بیج بوئے۔ اُن کی ہدایت کی روشنی میں مسلمانوں نے انگریز کی عدالتوں اور سرکاری سکولوں کا بائیکاٹ کیا۔

شریعت اللہ کا مشن اُن کے بیٹے اور جانشین، معین الدین احمد المعروف دھادو میاں نے عروج تک پہنچا دیا۔ اُنھوں نے اپنے پیروکاروں کو ایک مربوط اور منظم تحریک کا روپ دیا جو خلافت کہلاتی ہے۔ مشرقی بنگال کئی ایک حلقوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر حلقے میں ایک نمائندہ ہوتا تھا جو اراکین کو متحد رکھ کر تنظیمی ڈھانچہ مضبوط کرتا اور تبلیغ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھاتا۔ اُنھوں نے غیر قانونی ٹیکسز کے نفاذ کی مخالفت کی۔ ان اقدامات کے ذریعے وہ ریاست کے اندر ریاست قائم کرنے کا ارادہ رکھتے

تھے۔ اُنھوں نے 1841ء اور 1842ء میں ہندو جاگیرداروں کے خلاف کامیاب کارروائیاں کیں۔ اُنہیں 1847ء میں 63 ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے سزائے موت سنائی گئی لیکن کلکتہ کی اعلیٰ عدالت نے اُنہیں رہا کر دیا۔ اُنہیں 1857ء میں دوبارہ گرفتار کیا گیا، لیکن دو سال بعد 1859ء میں رہائی مل گئی۔ تاہم رہائی پر اُنہیں فرید پور کی حدود میں محبوس کر دیا گیا۔

فرائضی تحریک کے پیروکار سید احمد بریلوی کے مجاہدین سے کہیں زیادہ انقلابی تھے۔ کم از کم وہ مبہم اعلانات کے پیچھے اپنے اصل ارادے نہیں چھپاتے تھے۔ اُنھوں نے برطانوی حکومت میں برطانوی فورسز کے خلاف کھل کر لڑائی کی، نہ کہ دیگر غیر مسلم قومیتوں، جیسا کہ سکھوں کے خلاف۔

بنگال کے جنگجوؤں میں آخری بڑا نام تیتو میر کا تھا جنھوں نے کسانوں اور نچلے طبقے کے افراد کے حق کے لیے جدوجہد کی۔ وہ انیس نومبر 1831ء کو برطانوی فورسز کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ ان رہنماؤں کا بنیادی ہدف ہندوستان کے دیگر مسلمانوں کی سیاسی یا اخلاقی مدد کے بغیر بنگال کی تقسیم تھا۔ 1911ء میں بنگال کی تقسیم کی منسوخی کی صورت میں اُنہیں اکیلے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنہیں دیگر مسلمانوں کی طرف سے عملی بلکہ زبانی حمایت بھی نہ ملی۔ 1916ء کے لکھنؤ پیکٹ نے بنگالیوں کو صوبائی دستور ساز اسمبلی میں اکثریتی نشستوں کے اپنے فطری حق سے محروم کر دیا، اور اُن کے احتجاج کا کوئی اثر نہ ہوا۔ 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو واحد قابلِ عزت نتائج بنگال سے ملے تھے۔ اُن انتخابات میں مسلم لیگ سندھ اور این ڈبلیو ایف پی میں سے ایک بھی امیدوار نہ کھڑا کر سکی، جبکہ پنجاب میں اُس نے صرف دو نشستیں جیتی تھیں (اُن میں سے بھی ایک پر اُسے جلدی یونینسٹ کے امیدوار نے شکست دے دی)۔ 1945-46ء کے انتخابات میں بھی بنگال نے مسلم لیگ کا ہندوستان کے کسی بھی مسلم اکثریتی صوبے سے زیادہ ساتھ دیا۔ 1945ء اور 1947ء کے درمیان بنگال واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کے پاس مسلسل وزارت رہی تھی۔

مسلم بنگال باصلاحیت قیادت میں کسی اور علاقے سے کم نہ تھا۔ اس کے ہیروز کی طویل فہرست میں نواب عبدالغنی میاں (وفات 1889)، مولوی کریم (1863-1943)، سر عبدالرحیم (1867-1947)، مولوی عبدالقاسم (وفات 1936)، سید نواب علی چوہدری (1863-1929)، اے کے فضل حق (1873-1962)، سر اے کے غزنوی

(1030-1872)، سرا ے ایچ غزنوی (1876-1953)، نورالامین (1897-1974)، نواب سر سید شمس الحدیٰ (1862-1922)، مولوی تمیز الدین خان (1889-1963) کے علاوہ نواب آف ڈھاکہ اور سہروردی بھی شامل ہیں۔

یوپی کی علی گڑھ تحریک اور دہلی کا سیاسی اور فکری کلچر پنجاب کی غیر مشروط حمایت کے ذریعے انیسویں صدی کے دوسرے نصف اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شمالی انڈیا کی عقل ودانش کی اجارہ داری قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے خود کو مسلم نشاۃ ثانیہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے اردو زبان کا تحفہ دیا۔ یہ درست ہے کہ برصغیر کے شمالی علاقوں میں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی تھی (جیسا کہ اردو ہندی تنازع کے دوران کہا گیا)، لیکن شمالی ہند کے مسلمان دانشوروں کا اردو ادب کو ہندوستان کے مسلمانوں کا ادب قرار دینا سچائی سے قدرے فاصلے پر تھا۔ اردو کے گن گاتے، اور اسے ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد زبان قرار دیتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریتی زبان، بنگالی، کو سیاسی اور ادبی تاریخ سے خارج کر دیا گیا۔

علی گڑھ اور دہلی نے شمالی انڈیا کے مسلمانوں کے ذہن پر اس طرح کا جادو طاری کیا کہ بنگالی اور جنوبی انڈیا کا مسلم ادب اُن کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ شمالی ہند کے تعلیم یافتہ طبقات، بلکہ ادیب اور دانشور بھی بنگالی زبان میں تخلیق کردہ ادب سے ناواقف تھے۔ اس ادب میں بنگالی مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ بنگالی ایک ہندو زبان ہے جس کی جڑیں ہندو کلچر میں پیوست ہیں؛ اور یہ غیر اسلامی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے پاس بنگالی ادب اور زبان کو مسترد کردینے کے لیے یہی نام نہاد دلیل کافی تھی۔ جان بوجھ کر پروان چڑھایا گیا یہ تاثر نہ صرف حقیقت کے برعکس تھا بلکہ اس کی وجہ سے آگے چل کر اسلامی اتحاد، قومیت اور پاکستان کی سالمیت کو شدید نقصان پہنچا۔ اس موضوع پر مزید بعد میں۔ اس وقت ایک نظر بنگالی مسلمانوں کے ادب پر ڈالتے ہیں۔

انیسویں صدی کے دوسرے وسط میں دو قدآور شخصیات، منشی مہر اللہ اور منشی ضمیر الدین نے بنگالی مسلم ادب میں اسلام کی روح پھونکی۔ اُنھوں نے بہت سے بنگالی مسلمان ادیبوں کو مسلم بنگالی زبان کو ترقی دینے اور اپنے عقیدے کے جذبات کی آمیزش سے ادب تخلیق کرنے کی تحریک دی۔

اُنھوں نے پہلا قدم تو بڑھا دیا لیکن اُنہیں اپنے تصورات کو منظم صورت میں ڈھال کر تحریک چلانے اور عوام میں مقبول بنانے کا وقت نہ ملا۔ تاہم اُس صدی کے اختتام پر اُن کے دوستوں اور حامیوں نے اس سوچ کو آگے بڑھایا۔

1889ء میں ان ادیبوں نے ایک ہفت روزہ ''سدھاکار'' نکالا۔ 1892ء میں شیخ عبدالرحیم نے ''مہر'' کے نام سے اپنا ہفت روزہ نکالا۔ کچھ دیر کے بعد دونوں رسالے باہم ادغام سے ''مہر و سدھاکار'' بن گئے۔ سدھاکار گروپ کے اہم اراکین میں مولوی معراج الدین احمد، ریاض الدین احمد مشہدی، منشی شیخ عبدالرحیم اور محمد ریاض الدین شامل تھے۔ ان ادیبوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر کام کرتے ہوئے خالصتاً بنگالی زبان میں اسلامی ادب تخلیق کیا اور بنگالی دانشوروں اور قارئین کو ایک بار پھر اسلام کی روح سے روشناس کیا۔

اس گروپ سے باہر، لیکن ان کے مقصد سے وابستگی رکھنے والے افراد، جیسا کہ سید اسماعیل حسین شیرازی، جو اسلامی احیا کی تحریک کا ایک بڑا نام ہیں؛ مزمل حق، شاعر، ناول نگار، سوانح نگار، فارسی کی کئی کتابوں کے مترجم اور ماہنامہ ''لہری'' اور مشہور ماہنامہ ''مسلم بھارت'' کے بانی؛ اور شیخ فضل کریم، جن کے ڈرامے، شاعری، فکشن اور غیر فکشن (تاریخ) کتابیں اسلامی ثقافت اور روایات پر مبنی ہیں۔

اس رجحان سے حوصلہ افزائی پاتے ہوئے کئی ایک رسالوں، جیسا کہ ''اسلام پرچارک''، ''کوہِ نور''، ''نابانور'' جاری ہوئے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی اور مستحکم مسلم کمیونٹی کے تمام ادب کو بیک جنبش قلم داخل دفتر کر دینا محض نسیان یا ہنگامی جذبات کا شاخسانہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بنگالی مسلمانوں کو ہندوستان کی مسلم تاریخ، ادب اور سیاست سے نکال باہر کرنے کی شعوری کوشش دکھائی دیتی ہے۔ علی گڑھ اور آل انڈیا مسلم لیگ کا بنگالی مسلمانوں سے سلوک اس تاثر کی تصدیق کرتا ہے۔

سر سید احمد خان نے انڈیا کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے، فکری انقلاب برپا کرنے اور اُنہیں مواقع فراہم کرنے کے لیے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی۔ سر سید نہ صرف اس کے بانی، بلکہ اس کی قوت محرکہ بھی تھے۔ وہ اپنی وفات تک اس کے فعال سیکرٹری رہے۔ لیکن اُن کی تمام تر توجہ کا ارتکاز شمال ہند کے مسلمانوں پر تھا۔ اگرچہ وہ عوامی سطح پر انڈیا کے تمام

مسلمانوں کی بات کرتے ، لیکن عملی طور پر اُن کی سرگرمیوں اس کے برعکس تھیں ۔ اُن کی آواز بنگال میں بمشکل ہی کبھی سنی گئی تھی ۔

1898ء سے پہلے کسی بنگالی مسلمان نے کانفرنس کی کارروائی میں کبھی شرکت نہیں کی تھی ۔ محمد صدیق اُس سال کانفرنس کے لاہور اجلاس میں شرکت کرنے والے پہلے بنگالی تھے ۔ کانفرنس کے رہنماؤں کو شاید کچھ شرمندگی تو محسوس ہوئی ہوگی جب کہا گیا کہ بنگال بھی مسلم انڈیا کا حصہ ہے ۔ سید امیر علی نے دسمبر 1898ء میں علی گڑھ میں ایک مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی حمایت کی ۔ احتجاج میں کچھ بنگالی آوازیں سنائی دیں ۔ اکتیس دسمبر 1898 کو ''مسلم کرانیکل'' نے اداریے میں شکایت کی ، ''علی گڑھ کی علمی تحریک کا بنگال کے تعلیم یافتہ افراد کو بھی علم نہیں ۔'' آخر کار جب کانفرنس نے دسمبر 1899ء میں اپنا پہلا اجلاس بنگال میں منعقد کیا تو اس کے پنجابی صدر جسٹس شاہ دین نے تسلیم کیا ، ''جہاں تک اس کانفرنس کا تعلق ہے تو یہ بمبئی ، مدراس پریزیڈنسی اور یو پی ، بہار اور بنگال میں بمشکل ہی کوئی اثر رکھتی ہے ۔''

تاہم یو پی سے تعلق رکھنے والے کانفرنس کے منتظمین نے ایسی ''بیرونی شکایات'' پر کان نہ دھرے ۔ 1903ء میں کانفرنس نے صوبائی اور علاقائی نمائندگی کی بنیاد پر مرکزی مجلس عاملہ کی ازسرِ نو تشکیل کی ۔ اس کے مطابق : بمبئی کی نمائندگی 10 ، سندھ 3 ، بہار 5 ، آسام 3 ، مدراس 10 ، میسور 2 ، تراون کور 2 ، یو پی 10 ، پنجاب 10 ، پشاور 3 ، کشمیر 3 ، بلوچستان 3 ، برما 10 ، حیدر آباد 10 اور بنگال 10 تھی ۔ اس کا مطلب ہے بنگال کے مسلمانوں کو اتنی ہی اہمیت دی گئی جتنی برما ، مدراس یا حیدر آباد کو ۔ اکیس نومبر 1903ء کو ''مسلم کرانیکل'' نے اس پر تنقید کی لیکن بے سود ۔

علی گڑھ کے بے لچک رویے سے مایوس ہوتے ہوئے بنگالی عوام نے دو اور تین اپریل 1904ء کو راج شاہی میں اپنی تعلیمی کانفرنس منظم کی ۔ مولانا سید شمس الھدیٰ نے اجلاس کی صدارت کی جس میں بنگال بھر سے 4,000 وفود نے شرکت کی ۔ تعلیمی معاملات کے علاوہ بھی سر سید احمد خان نے بنگالی جذبات کو کوئی احترام نہ دیا ۔ 1877ء میں امیر علی نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور سر سید احمد خان کو اپنے ساتھ تعاون پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود ۔ گیارہ سال بعد بھی ان کی رائے میں کوئی لچک نہ آئی ۔ سید احمد نے اپنے دوست کو لکھا ، ''امیر علی میرے پاس آئے اور

اصرار کیا کہ میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کرلوں، لیکن میرے خیال میں مسلمانوں کے لیے کسی سیاسی احتجاج میں شامل ہونا دانائی نہیں۔'' (غلام نیاز خان کے نام خط، دس دسمبر 1888)۔ اُس وقت تک انڈین نیشنل کانگرس کو قائم ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کراچی اور پنجاب کے کئی شہروں میں اپنی شاخیں قائم کر چکی تھی۔

جب یو پی کی مسلمان اشرافیہ نے اکتوبر 1906ء میں وائسرائے سے ملاقات کے لیے ایک مسلمان وفد تشکیل دیا تو ایک مرتبہ پھر اُنھوں بنگالیوں کو اُن کی اوقات یاد دلا دی۔ وفود میں شامل 35 رہنماؤں میں بنگال کے پانچ، اور مشرقی بنگال اور آسام سے صرف ایک ممبر تھا۔ بنگال کے پانچ اراکین میں سے صرف دو (نواب بہادر سید امیر حسین خان اور عبدالرحیم) کا تعلق اس صوبے سے تھا۔ باقی تین (شہزادہ بختیار شاہ، میسور، ناصر حسین خیال، کلکتہ اور خان بہادر شجاعت علی بیگ، کلکتہ) اردو بولنے والے غیر بنگالی تھے۔ مسلم اکثریتی صوبے، مشرقی بنگال اور آسام سے صرف ایک رکن، نواب علی چوہدری تھے۔

اس طرح مسترد کیے جانے کے باوجود بنگالیوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ خان کو اس کا شرف حاصل ہے۔ اس کے پہلے اجلاس میں شامل نصف سے زیادہ وفود (68 میں سے 38) کا تعلق مشرقی بنگال اور آسام سے تھا۔ یو پی سے صرف سولہ، پنجاب سے پانچ، بہار سے چار، مغربی بنگال سے تین، بمبئی سے ایک، اور دہلی سے ایک نمائندے نے شرکت کی۔ لیکن جب نئی پارٹی کی عارضی کمیٹی بنی تو اس میں مشرقی بنگال اور آسام کے صرف چار، جبکہ یو پی کے 23 اراکین تھے۔ مزید یہ کہ دونوں جائنٹ سیکرٹریز، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک، کا تعلق یو پی سے تھا۔

ابھی بنگالیوں کو اس سے بھی بڑھ کر بے قدری کا سامنا کرنا باقی تھا۔ شملہ وفد کے مصروف برسوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے منظر عام پر آنے کے بعد بنگالی مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا ایشو بنگال کی تقسیم تھی۔ یہ کسی بھی حوالے سے محض صوبائی معاملہ نہ تھا۔ ہندوؤں نے انڈین نیشنل کانگرس کی پشت پناہی سے بنگال کو تقسیم کرکے مسلم اکثریتی صوبہ بنانے کے خلاف پرزور احتجاج کیا تھا۔ اُنھوں نے اس معاملے کو ہندوستان کی سطح پر اٹھا کر اتنے شدید جذبات پیدا کر دیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے

درمیان فسادات ہونے لگے۔

بنگالی مسلمان قدرتی طور پر توقع کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی نئی جماعت اس معاملے کو اٹھائے گی اور اسے اپنی بھرپور اخلاقی اور سیاسی حمایت دے گی۔ بنگالی مسلمان حق پر تھا لیکن مسلم لیگ نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ شمالی ہند کے رہنما شملہ وفد کی تشکیل کے ساتھ ہی اپنے ہاتھ دکھا چکے تھے۔ نواب سلیم اللہ اور سید نواب علی چوہدری نے اصرار کیا کہ وفد کو وائسرائے سے کم از کم یہ یقین دہانی لینی چاہیے کہ ہندوؤں کے احتجاج کے باوجود صوبے کی منقسم حیثیت برقرار رہے گی۔ لیکن وفد میں شامل کچھ غیر بنگالی ممبران کے اعتراض کی وجہ سے یہ مطالبات شملہ میں وائسرائے کے سامنے نہ رکھے گئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے آغاز سے ہی بنگالیوں سے تقسیم کے ایشو پر بے اعتنائی ظاہر کر دی تھی۔ اپنے صدارتی خطاب میں نواب وقارالملک نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ پارٹی کے مستقل صدر، آغا خان نے اعلان کیا کہ وہ تقسیم کے خلاف ہیں۔ یہ موقف اختیار کرتے ہوئے انھوں نے ہندوؤں اور کانگرس کے احتجاج کو تقویت دی۔ 1906ء سے لے کر 1911ء کے درمیان آل انڈیا مسلم لیگ نے 46 قراردادیں منظور کیں (ان میں پارٹی کے تنظیمی معاملات پر قراردادیں شامل ہیں)۔ ان میں سے صرف دو تقسیم بنگال کی حمایت میں تھیں، جن میں سے ایک ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے افتتاحی اجلاس میں 1906ء میں، اور دوسری 1908ء میں امرتسر میں ہونے والے اجلاس میں منظور کی گئی۔ دوسری قرارداد پہلے تو ایجنڈے سے نکال دی گئی تھی لیکن نواب علی چوہدری کے پرزور اصرار پر شامل کر لی گئی۔ نواب علی چوہدری نے ہی اسے پیش کیا تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر مشرقی بنگال اور آسام کے رہنما صوبائی مسلم لیگ اور اس کی سرگرمیوں سے مایوس ہو گئے۔ مندرجہ بالا معروضات کو سامنے رکھتے ہوئے اُن پر اس رویے کا الزام عائد کرنا درست نہ ہوگا۔ 1911ء میں تقسیم بنگال منسوخ ہونے اور بنگال کے ایک صوبے کی صورت جڑنے کے بعد صوبائی مسلم لیگ وجود میں آئی۔ اس نے 1912ء کے بعد سے اصل مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا، یہاں تک کہ اسے 1916ء میں لکھنؤ پیکٹ کی صورت ایک کاری ضرب برداشت کرنا پڑی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے سوچ سمجھ کر اس پیکٹ پر دستخط کیے جبکہ اس دوران بنگالی رہنما غیر حاضر تھے۔ اس غداری پر بنگالی ششدر رہ گئے۔ اپریل 1917ء میں اپنے تیسرے سالانہ اجلاس میں بنگال مسلم

لیگ نے آل انڈیا مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ صوبائی دوستور ساز اسمبلی میں نمائندگی کے وقت بنگالی مسلمانوں کے مفادات کا خیال رکھے۔ اس درخواست پر بھی کوئی ردعمل نہ آیا۔ مقامی طور پر پھیلنے والی مایوسی کی وجہ سے بہت سے اراکین نے صوبائی پارٹی چھوڑنا شروع کر دی۔ ستمبر 1917ء میں باغیوں نے ''مسلمانوں کے مفادات کے موثر تحفظ'' کے لیے اپنی الگ سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ سید نواب علی چوہدری اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس نئی پارٹی کے لیے چنا گیا نام امیر علی کی 1877ء کی بغاوت کی یاد دلاتا ہے جب انھوں نے سر سید احمد خان کے مقابلے پر قدم اٹھایا تھا۔ یہ بات واضح نہیں کہ کیا یہ اختیار کیا گیا نام چالیس سال پہلے پیش آنے والے واقعات کی یاد میں تھا یا محض اتفاق۔

سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی تشکیل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صوبائی لیگ تشکیل دینے والے سابق مسلم لیگی لکھنو کی غلطی کو تسلیم کر چکے، یا بھول چکے تھے۔ تیس جنوری 1920ء کو بنگال مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ بنگال میں مسلم نمائندگی پچاس فیصد تک بڑھانے کا مطالبہ کرے۔ مسلم لیگ نے اس مطالبے پر کوئی دھیان نہ دیا۔ لکھنو پیکٹ پر چھے سال قبل کی گئی لاحاصل کوششوں سے مایوس ہوتے ہوئے بنگالی مسلمانوں نے اب ہندوؤں کی طرف رجوع کر لیا۔ اس کے نتیجے میں چترانجن داس اور عبدالرحیم کے درمیان معاہدہ ہوا، جو بنگال پیکٹ کہلاتا ہے۔ اس صورتِ حال کا اعادہ 1971ء میں دیکھنے میں آیا جب حکومت پاکستان کے رویے سے تنگ آ کر بنگالیوں نے انڈیا کی طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

بنگالیوں کی بے چینی آل انڈیا مسلم لیگ کو متاثر نہ کر سکی۔ مسلم لیگی رہنما پیکٹ کا مسلسل دفاع کرتے ہوئے بنگالیوں کو ذہنی اذیت پہنچاتے رہے۔ دسمبر 1924ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے بمبئی اجلاس سے اپنے صدارتی خطبے میں لکھنو پیکٹ میں شریک، سر رضا علی کا کہنا تھا کہ ''میں، اور دوسرا فریق (ہندو) اس معاہدے کی شرائط پر پوری طرح کاربند ہیں۔ اگرچہ پنجاب اور بنگال کی شکایات کافی حد تک معقول ہیں، لیکن میں ان کی شرائط پر نظر ثانی نہیں کرنے جا رہا۔'' 1926ء میں محمد علی جناح نے لکھنو پیکٹ کو ''مشکل کا بہترین عارضی حل'' قرار دیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ یو پی کے سیاست دانوں کی رہنمائی اور کنٹرول میں آل انڈیا مسلم لیگ لکھنو

پیکٹ میں طے کیے گئے سوالات اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ نمائندگی کے تناسب پر کوئی بھی نظر ثانی مسلم اقلیتی صوبوں میں اُنہیں حاصل بہت زیادہ نمائندگی کو کم کر سکتی تھی۔ 1927ء میں دہلی مسلم کانفرنس کے دوران مخلوط انتخابی حلقوں میں بلحاظ آبادی نشستیں مختص کرنے کی قائدِ اعظم کی پیش کش بنگالی ناراضی کے پس منظر میں نہیں تھی۔ اس کی بجائے یہ ایک ایسی ڈیل تھی جس کے تحت ہندو اصلاحات کے مقابلے میں شمالی ہند کے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا گیا تھا۔ اس میں لکھنو پیکٹ میں مسلم اکثریتی صوبوں کو دیے گئے خصوصی استحقاق کو برقرار رکھا گیا تھا۔

بنگالی پھر بھی آل انڈیا مسلم لیگ کی توجہ مبذول کرانے کے لیے شکایات کرتے رہے، لیکن لیگ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ 9 جولائی 1930ء کو اے کے فضل حق، عبدالقاسم اور بنگالی مسلم لیگ کے کئی ایک رہنماؤں نے ایک مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے لکھنو پیکٹ پر نظر ثانی پر ضرورت پر زور دیا۔ اُنھوں نے اس پیکٹ کو ''مستقل حاشیہ نشینی'' قرار دیتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ اس معاہدے کی پابندی نہیں کریں گے۔ اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے صوبائی مسلم لیگ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے 1930ء کے الہ آباد کے اجلاس میں اپنا وفد نہ بھیجا۔ نہ ہی کمیونل ایوارڈ 1932ء میں انتخابی حلقوں پر سوچ بچار اور بحث کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل میں شرکت کی۔ اُسی سال مئی میں بنگال لیگ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے بنگالی ممبران کے چناؤ میں ''غیر آئینی طریق کار'' اپنانے کا الزام لگایا۔ دس دسمبر 1932ء کو ''دی مسلمان'' نے اس الزام کا اعادہ کیا۔ بنگالیوں کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا تھا۔

اکتوبر 1933ء آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک دھڑے مغربی بنگال کے شہر حورہ میں اپنا سالانہ اجلاس بلایا۔ بنگال لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا کیونکہ دیگر معاملات کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ نے صوبے میں اجلاس بلانے کے لیے بھی اس سے مشاورت کی زحمت نہیں کی تھی۔

قائدِاعظم کی انگلستان سے واپسی کے بعد لیگ کی بحالی سے بھی اس کے بنگالی لیگ سے تعلقات میں بہتری نہ آئی۔ لیکن اب بنگالیوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک اہم اور خطرناک حکمت عملی پر پیش رفت دیکھنے میں آئی۔ اُنہیں نظر انداز کرنے کی بجائے اُن سے صوبائی لیگ کے پلیٹ فورم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن التزام یہ دیکھنے میں آیا کہ اس تنظیم کو پہلے اردو بولنے والے

ایک غیر بنگالی کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔

مستقبل کی بنگلہ دیش کی ریاست کی بنیاد کھودی جا رہی تھی؛ گو یہ واقعہ ابھی پچیس سال بعد پیش آنا تھا۔

بنگال مسلم لیگ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے 1936ء کے بمبئی اجلاس میں شرکت نہ کی۔ اس بائیکاٹ کا خطرناک پیغام تھا کیونکہ اس میں مسلم لیگ نے نئے آئین کے تحت صوبائی انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک ماہ بعد، اکیس مئی کو محمد علی جناح نے ایک 54 رکنی مرکزی پارلیمانی بورڈ تشکیل دیا۔ اس میں بنگال کو آٹھ نشستیں دی گئیں، لیکن بنگال مسلم لیگ کے صدر یا سیکرٹری کو نامزد نہ کیا گیا۔ اس میں نامزد ہونے والوں کے نام اس طرح ہیں: خواجہ حبیب اللہ، اکرم خان، ایچ ایس سہروردی، اے کے فضل حق، عبدالمومن، عبدالرحمان صدیقی، ایم اے ایچ اصفہانی اور مجیب الرحمان۔ ان آٹھ میں سے چار غیر بنگالی تھے۔ آٹھ جون کو مسٹر جناح نے لاہور میں بورڈ کا اجلاس بلایا۔ بنگال سے صرف دو ممبران نے اس میں شرکت کی: صدیقی، اور اصفہانی؛ اور وہ دونوں غیر بنگالی تھے۔ چند دن بعد ایک مزید خطرناک اقدام دیکھنے میں آیا جب قائدِ اعظم نے ان دو غیر بنگالی ممبران کو بنگال مسلم لیگ کا منتظم مقرر کر دیا۔

اگست میں جناح صاحب نے ایک 33 رکنی بنگال پارلیمان بورڈ نامزد کیا۔ اس کی رکنیت مختلف جماعتوں میں تقسیم کی گئی، جیسا کہ: یونائیٹڈ مسلم پارٹی کے پندرہ، نیو مسلم مہاجر کے سات، بنگال مسلم لیگ کے سات، اور چار اُن کے اپنے نامزد کردہ اراکین۔ بعد میں فضل حق کی کرشک پرجا پارٹی نے بھی پندرہ ممبران کے ساتھ بورڈ میں شمولیت اختیار کر لی۔ تاہم محمد علی جناح نے زمینداری کو معطل کرنے کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔ اُن کے نامزد کردہ تمام اراکین غیر بنگالی تھے: آدم جی حاجی داؤد، فضل اللہ گنجی، عبدالعزیز انصاری اور احمد اصفہانی۔

ستمبر میں کرشک پرجا پارٹی نے اپنا چھبیس رکنی پارلیمانی بورڈ تشکیل دیا جس میں صوبائی مسلم لیگ کے چھ سے پندرہ تک عہدیدار شامل تھے (صدر، سیکرٹری، تین نائب صدر اور ایک اسسٹنٹ سیکرٹری)۔ اس دوران بنگال مسلم لیگ کونسل نے خود کو مسٹر جناح کے پارلیمانی بورڈ سے الگ کر لیا۔ اس نے بنگال مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ کی بجائے کرشک پرجا پارٹی کا اتحادی بنا دیا۔ اب یہ اپنا

الگ پارلیمانی بورڈ تشکیل دینے جارہی تھی جس کے صدر نواب حبیب اللہ آف ڈھاکہ، سہروردی اور اصفہانی جائنٹ سیکرٹریز اور آدمی جی حاجی داؤ خزانچی تھے۔ یہ تمام عہدیدار اردو بولنے والے، غیر بنگالی، کلکتہ کے تاجر تھے۔

1937ء کے انتخابات میں بنگال مسلم لیگ نے 39 نشستوں پر کامیابی حاصل کی جن میں چھ شہری اور انتیس دیہی علاقوں کی نشستیں شامل تھیں۔ دوسری طرف کرشیکا پروجا پارٹی نے 36 نشستیں جیتیں جو تمام کی تمام دیہی تھیں۔ آزاد اراکین کی تعداد 43 تھی۔ ان میں دو شہری اور اکتیس دیہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

26 اکتوبر 1937ء کو محمد علی جناح نے بنگال مسلم لیگ کی تشکیل نو کے لیے ایک بیس رکنی تنظیمی کمیٹی نامزد کی۔ ان میں سے چھ غیر بنگالی کاروباری افراد تھے (حسن اصفہانی، احمد اصفہانی، اے آر صدیقی، عبدالعزیز انصاری، محسن خان اور جان محمد)۔ مزید چار اراکین کا تعلق ڈھاکہ کی اردو بولنے والی نواب فیملی سے تھا (حبیب اللہ، ناظم الدین، شہاب الدین اور نورالدین)۔ فضل حق کو اس کا صدر، اور سہروردی کو اس کا سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ تاہم بیس دسمبر کو قائداعظم نے بنگال مسلم لیگ کی دس رکنی مجلس عاملہ نامزد کی جس کے انتظامات چلانے کے لیے اکرم خان کو چیئرمین بنایا گیا۔ اس میں دو غیر بنگالی بزنس مین (اصفہانی اور محسن خان)، ڈھاکہ کے دو نواب (شہاب الدین اور نورالدین) شامل تھے۔ مجلس عاملہ کے لیے نہ تو سہروردی اور نہ ہی تنظیمی کمیٹی میں شامل کسی وزیر کو نامزد کیا گیا۔

بنگال کی لیگ کی مرکزی تنظیم میں نمائندگی اہمیت اور ضرورت سے کہیں کم تھی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے: لیگ کے تین مستقل صدر تھے: آغا خان، 1913-1908، مہاراجہ آف محمود آباد، 1919-1915، اور محمد علی جناح، 1930-1919۔ ان میں سے کوئی بھی بنگالی نہیں تھا۔

1906ء اور 1947ء کے دوران لیگ کے 38 سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ ہر اجلاس نے اپنے صدر کا انتخاب کیا۔ صوبوں کے لحاظ سے صدور کے اعداد و شمار اس طرح ہیں: بہار سے دو، بمبئی سے بارہ (دس مرتبہ جناح اور دو مزید افراد)، مدراس ایک، این ڈبلیو ایف پی ایک، پنجاب چھ، سندھ ایک اور یوپی بارہ۔ اس طرح مسلم اکثریتی صوبوں سے بارہ، جبکہ مسلم اقلیتی صوبوں سے ستائیس

صدر آئے۔ اس دوران بنگال سے صرف تین صدور تھے: سلیم اللہ 1912ء، فضل حق 1918ء، عبدالرحیم 1925ء۔ جہاں تک اجلاس کے مقامات کا تعلق ہے تو ان میں سے صرف پانچ کا انعقاد بنگال میں ہوا۔ ان میں سے ایک منقسم اجلاس بھی تھا جب لیگ ''جناح لیگ'' اور ''شفیع لیگ'' میں تقسیم ہو گئی۔ جناح لیگ کا 1927ء کا اجلاس کلکتہ، جبکہ شفیع لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ چنانچہ بنگال میں درحقیقت صرف چار اجلاس ہوئے۔

ایک مثال کو چھوڑ کر آل انڈیا مسلم لیگ کے تمام سیکرٹری، اعزازی سیکرٹری اور جائنٹ سیکرٹری یو پی سے آئے تھے۔ واحد مثال ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے جو 1928ء سے لے کر 1934ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

1938-40ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے تیئیس اراکین میں سے چودہ کا تعلق مسلم اقلیتی صوبوں سے تھا۔ اُس وقت ان صوبوں کی مسلم آبادی ان صوبوں کی کل آبادی کا 29.87 فیصد تھی، لیکن انہیں لیگ کونسل کی منتخب رکنیت کی 465 میں سے 225 نشستیں دی گئیں۔ یہ تناسب 48.39 فیصد بنتا ہے۔ دوسری طرف مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم آبادی کا تناسب 70.13 فیصد تھا، لیکن انہیں 240 نشستیں دی گئیں۔ یہ نشستوں کی کل تعداد کا 51.61 فیصد تھی۔

ڈاکٹر ہارون الرشید کا کہنا ہے: ''بنگال کو آل انڈیا مسلم لیگ کے معاملات میں پورا کردار کبھی نہیں دیا گیا۔ مسلم لیگ کی تحریک اپنی منزل کی جانب جتنی بڑھتی گئی، بنگال کا کردار اتنا ہی محدود ہوتا رہا۔'' نظر انداز کرنے کی اسی کہانی کا اعادہ سالانہ اجلاس، عہدیداران کے چناؤ اور انتخابی نامزدگیوں سے ہوتا ہے جب بنگال تحریک پاکستان کے ہراول دستے کا کردار ادا کر رہا تھا۔

1936ء سے 1943ء کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ نے آٹھ سالانہ اجلاس بلائے، لیکن ان میں سے کسی کا بھی انعقاد بنگال میں نہ ہوا۔ 1938ء میں کلکتہ میں ہونے والا ایک خصوصی اجلاس تھا جسے سالانہ اجلاس نہیں کہا جا سکتا۔ 1943ء سے لے کر 1947ء کے درمیان کوئی سالانہ اجلاس نہ ہوا۔

بنگال کی متعدد درخواستوں کے باوجود 1936ء اور 1947ء کے درمیان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا کوئی اجلاس بنگال میں نہ ہوا۔ مرکزی جماعت کے عہدیداران میں صوبے کی نمائندگی نہ

ہونے کے برابر تھی۔ خان بہادر عبدالمومن 1941ء صرف ایک سال کے لیے جائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔ 1937ء سے لے کر 1947ء تک محمد علی جناح بمبئی کے، لیاقت علی خان یو پی کے جنرل سیکرٹری، راجہ آف محمود آباد یو پی کے خزانچی تھے۔ ہر سالانہ اجلاس میں وہ بار بار منتخب ہو جاتے تھے۔ بیس رکنی مجلس عاملہ (جو پارٹی کی فیصلہ سازی کرتی تھی) میں صرف تین بنگالی تھے۔ 1938ء کے بعد اس کے تمام اراکین اردو بولنے والے تھے: خواجہ ناظم الدین (1938-47)، اکرم خان (1940-47)، اور حسن اصفہانی (1941-47)۔ حتیٰ کہ جب سہروردی برصغیر کے واحد مسلمان وزیراعلیٰ تھے تو بھی اُنہیں مجلس عاملہ میں شامل نہ کیا گیا۔ اگرچہ خواجہ ناظم الدین کو 1945-46ء میں سیاسی تنہائی کا سامنا تھا لیکن وہ پھر بھی مجلس عاملہ میں شامل رہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی نامزد کردہ تمام کمیٹیوں اور کمشنریوں سے بنگالیوں کو نکال دیا گیا۔ 27 دسمبر 1943ء کو مسٹر جناح نے تنظیمی معاملات سرانجام دینے، اور صوبائی شاخوں کو ہدایات دینے اور کنٹرول کرنے کے لیے ایک ایکشن کمیٹی قائم کی۔ اسے کسی بھی صوبائی لیگ کو معطل کرنے، تحلیل کرنے یا اس کا مرکزی مسلم لیگ سے الحاق ختم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ نیز وہ لیگ کے کسی عہدیدار کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کا بھی اختیار رکھتی تھی۔ یہ بااختیار اور طاقتور کمیٹی نواب محمد اسماعیل خان (یو پی) (چیئرمین)، لیاقت علی خان (یو پی)، جی ایم سید (سندھ)، ستار عاشق سیٹھ (مدراس)، نواب افتخار حسین ممدوٹ (پنجاب)، اور قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان) پر مشتمل تھی۔ اس میں ایک بھی بنگالی شامل نہ تھا۔ اس دوران ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اعلان کیا گیا۔ اس کے دائرۂ اختیار میں صوبوں میں لیگ کی پارلیمانی پارٹیوں کو کنٹرول کرنا شامل تھا، نیز انتخابات اور ضمنی انتخابات کے معاملات نمٹانے کے لیے کورٹ آف اپیل کے حتمی اختیارات بھی اسی کے پاس تھے۔ اس میں لیاقت علی خان (یو پی)، چوہدری خلیق الزماں (یو پی) اور حسین امام (بہار) شامل تھے۔

اگست 1944ء کو محمد علی جناح نے پاکستان میں شامل ہونے والے حصوں اور اُن کی زرعی، صنعتی اور کمرشل ترقی کے لیے منصوبہ بندی کرنے کے لیے ایک پلاننگ کمیٹی کا اعلان کیا جس کے تیئس ممبران میں سے صرف دو بنگالی تھے: احمد اصفہانی اور خواجہ شہاب الدین؛ لیکن یہ دونوں اردو بولنے والے تھے۔ اصفہانی بنگالی نہیں تھے؛ جبکہ شہاب الدین کو معاشیات کی کوئی سمجھ نہیں تھی۔

اپریل 1946ء کو مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی کے دہلی میں ہونے والی اجلاس میں ایک قرارداد کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے ممبران نواب اسماعیل خان (یوپی) (چیئرمین)، حسن اصفہانی (بنگال)، عبدالمتین چوہدری (آسام)، آئی آئی چندریگر (بمبئی)، اور چوہدری خلیق الزماں (یوپی) تھے۔ اس میں بنگال کی نمائندگی صرف کلکتہ کے ایک اردو بولنے والے بزنس مین کر رہے تھے۔

اکتوبر 1946ء کو لیگ نے نام نہاد وسط مدتی حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے پارٹی کے نامزد کردہ اراکین لیاقت علی خان (یوپی)، سردار عبدالرب نشتر (این ڈبلیو ایف پی)، راجہ غضنفر علی (پنجاب)، آئی آئی چندریگر (بمبئی) اور جے این منڈل (بنگال) سے تھے۔ اس طرح بنگال کے مسلمانوں کی نمائندگی شیڈولڈ ذات کے ہندو، مسٹر منڈل کر رہے تھے۔ اپنے قیام کی اکتالیس سالہ تاریخ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا بنگالیوں کے روا رکھا جانے والا یہ سب سے توہین آمیز اقدام تھا۔

بنگالیوں کو سیاسی میدان میں دیوار کے ساتھ لگانے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے شمالی ہندوستان کے اردو بولنے والے مسلمانوں نے ثقافتی افق پر غالب رہنے کے لیے کئی ایک کوششیں کیں۔ 1926 میں اردو بولنے والے بنگالیوں اور شمالی ہند میں رہنے والے بنگالی مسلمانوں نے مل کر ''آل بنگال اردو سپیکنگ ایسوسی ایشن'' تشکیل دی۔ اس کا دفتر کلکتہ میں تھا۔ اس نے جولائی 1933ء میں اپنی پہلی صوبائی کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں صوبے کے سکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کو اردو زبان پڑھانے کا مطالبہ کیا۔ کانفرنس میں بنگالی کو ''ہندی اور سنسکرت جیسی زبان'' قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف ایک زبان سیکھیں، جو اردو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ کہا گیا کہ ''اردو کے بغیر بنگالی مسلمانوں کی ثقافتی نشاۃ ثانیہ ناممکن ہے''۔ ایسوسی ایشن کے بانی سیکرٹری، ایم تو حید نے دعویٰ کیا کہ ''مسلمانوں کے لیے بنگالی زبان اتنی ہی اجنبی ہے جتنی کوئی بھی دوسری غیر ملکی زبان''۔ 1933ء اور بعد کے برسوں میں ''سٹار آف انڈیا'' میں قارئین کے کئی خطوط شائع ہوتے رہے۔ ان خطوط میں بنگالی مسلمانوں، اُن کی زبان اور ثقافت کی توہین کی شدید مذمت کی گئی۔

بنگالی مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اُن کے ساتھ معیشت کے شعبے میں بھی دھوکہ ہوا ہے۔ سیاسی

شور رکھنے والے نوجوان بنگالی مسلم چیمبر آف کامرس، کلکتہ کو غیر بنگالی ادارہ سمجھتے تھے۔ اس کا ریکارڈ بنگالی زبان کی بجائے شمالی ہندوستان کی دیگر کئی ایک زبانوں میں رکھا جاتا۔ اس کے ممبران کی فیکٹریوں میں غیر بنگالیوں کو ترجیحی بنیادوں پر ملازمت دی جاتی۔ چیمبر کے خلاف پہلی آواز 1933ء کے اوائل میں سنائی دی، اور شکایات کا سلسلہ 1947ء تک جاری رہا۔

بنگالی مسلمانوں کی جدید تاریخ کا یہ اجمالی جائزہ مندرجہ کتابوں، خاص طور پر آل انڈیا مسلم پیپرز، میں درج حقائق سے کشید کیا گیا ہے۔ اگر قارئین کو شک گزرے، یا انہیں مزید تفصیل درکار ہو تو ان سے رجوع کیا جاسکتا ہے: ای حق، مسلم بنگالی ادب، کراچی، 1957؛ ایم این اسلام، بنگالی مسلم پبلک اوپینین، بنگالی پریس، 1901-1930، ڈھاکہ، 1977؛ صوفیہ احمد، مسلم کمیونٹی ان بنگال، 1884-1912، ڈھاکہ، 1974؛ ہارون الرشید، دی فورشیڈونگ آف بنگلہ دیش: بنگال مسلم لیگ اور مسلم سیاست، 47-1936، ڈھاکہ، 1987؛ حمیرہ مومن، بنگال کی مسلم سیاست: کرشیکا پروجا پارٹی اور 1937 کے انتخابات، ڈھاکہ، 1972؛ ایم اے رحیم، مسلم سوسائٹی اور بنگال کی سیاست، 1857-1947، ڈھاکہ، 1978؛ شیلا سین، بنگال کی مسلم سیاست، 47-1937، نئی دہلی، 1978؛ معین الدین احمد خان، فرائضی تحریک، کراچی، 1965؛ اے آر مالک، برٹش پالیسی اور بنگال کے مسلمان، 1757-1856، ڈھاکہ 1961؛ اور بنوئے گوپال رائے، جدید بنگال کی مذہبی تحریکیں، ویشوابھارتیہ، 1965۔

درسی کتابیں لکھنے والے ہمارے مصنفین اس تمام مواد سے اغماض برتنا پسند کرتے ہیں۔ گنتی کی چند ایک کتابوں میں نواب سلیم اللہ خان کے بارے میں ایک یا دو جملے ہوتے ہیں۔ کچھ ذکر ہوتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد بنگال میں رکھی گئی تھی۔ شاید کسی کو یاد ہو کہ سید امیر علی کا شمار بھی اہم مسلمان رہنماؤں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ ذکر بمشکل دو یا تین کتابوں میں ملے گا۔ اے کے فضل حق کا ذکر صرف اُس وقت کیا جاتا ہے جب وہ قرارداد لاہور پیش کرتے ہیں۔ چند ایک کتابوں میں فرائضی تحریک کا بھی ذکر ملتا ہے۔ برصغیر میں سب سے بڑے مسلم صوبے بنگال، جو 1947ء کے وقت ملک کا سب سے گنجان آباد حصہ تھا، کے بارے میں ہم صرف یہی کچھ سنتے ہیں۔ یہ تجاہل عارفانہ ان معیاری سوچ کا نتیجہ ہے کہ علی گڑھ ہی مسلم انڈیا ثقافت کا مرکز تھا (اور بعد میں یہ مرکزیت پاکستان

کو حاصل ہوگئی)، اور یوپی سے ہی آل انڈیا مسلم سیاست کی توانائی کا چشمہ پھوٹا۔ درسی کتب اسی سوچ کی عکاسی کرتی ہیں۔ بنگالی تاریخ کے حقائق اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں۔

بنگالی سیاست کے مندرجہ ذیل معروضات پر غور کریں:

1۔ یوپی یا پنجابی مسلمان کی نسبت بنگالی مسلمان انگریز حکومت کا زیادہ وفادار نہیں تھا۔

2۔ اُس نے کسی بیرونی مدد کے بغیر برطانیہ سے تین جنگیں لڑیں، جبکہ اُس دوران اودھ کے نواب عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور دہلی حکمران یا تو مرہٹوں اور روہیلوں کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے یا پنشن کی رقم بڑھانے کے لیے انگریز سرکار کو خوش کرنے کی پالیسی پر گامزن تھے۔

3۔ ڈھاکہ یا کلکتہ میں رہنے والی محدود اشرافیہ کو چھوڑ کر بنگالی مسلمان کے پاس انگریز حکومت کے سامنے اپنی بات کرنے اور اپنے لیے حقوق اور فوائد حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اُس کی صفوں میں کوئی ''تعلق دار'' اور نواب اور سر کا خطاب پانے والے زعما نہ تھے کہ وہ اُن کا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے خود کو ہندو جاگیرداروں اور بزنس مین کے جبر اور استحصال سے بچاتا۔

4۔ وہ پنجابی یا یوپی کے مسلمان کی نسبت غریب، لیکن کہیں زیادہ جمہوریت پسند تھا۔ وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے تیار تھا۔ برطانوی انتظامیہ اور ہندو زمینداروں کے جبر کے خلاف اُس کی جنگیں اس کے کردار کو ثابت کرتی ہیں۔ اس حقیقت کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ دیگر صوبوں کی نسبت زیادہ تر بنگالی رہنماؤں کا تعلق درمیانی طبقے سے تھا۔ جمہوری ترقی پسندی نے اس کی غربت اور تعلیم سے جنم لیا تھا۔ کلکتہ مدرسہ کا قیام 1781ء میں عمل میں آیا۔ اس مدرسے نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کیا۔

5۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی مسلمان سیاست میں پہلے داخل ہوا۔ ہندوستان کی سب سے پہلی مسلم پارٹی، محمڈن ایسوسی ایشن تھی، جو کلکتہ میں بنگالی مسلمانوں نے چھ مئی 1855ء میں قائم کی تھی۔ یہ وہ سال تھا جب سرسید احمد خان کی بجنور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک معمولی عدالتی اہل کار، صدر امین' کے طور پر تعیناتی ہوئی تھی۔ اس کے بعد مزید پارٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید احمد خان سے کہیں زیادہ وسیع النظر رہنما، سید امیر علی سندھ اور پنجاب میں اپنی تنظیم کی شاخیں کھول رہے تھے۔

6۔ تعلیم یافتہ بنگالی اسلام پر امیر علی کی تصنیفات سے واقف ہونے کی وجہ سے مذہبی اور

فکری اعتبار سے بہتر پوزیشن رکھتا تھا۔ امیر علی کی مذہب کی تشریحات سرسید کی فکر جیسی بے عقل عقلیت پسندی سے آراستہ نہ تھیں، اور پھر وہ محض لفاظی نہیں تھیں۔ امیر علی نے لفاظی پر دلائل کو ترجیح دی ہے۔ انگریزی میں لکھتے ہوئے امیر علی علی گڑھ تحریک سے کہیں بڑھ کر برطانیہ اور یورپ کی سوچ کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ بعد میں اُنھوں نے لندن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس پلیٹ فورم، اور اپنے ذاتی اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے وہ برطانوی حکومت کو 1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات کے تحت جداگانہ انتخابات کا مطالبہ تسلیم کرنے پر رضامند کرنے میں کامیاب رہے۔ اُنھوں نے نہ صرف یہ کارنامہ تن تنہا سرانجام دیا بلکہ اس ضمن میں اُنہیں آل انڈیا مسلم لیگ کی یوپی کی قیادت کی رکاوٹوں اور سازشوں کا بھی سامنا رہا۔ چند سال بعد، مسلم لیگ کے یوپی سے تعلق رکھنے والے نوجوان شعلہ بیان کارکنوں، مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن نے اس عمر رسیدہ عظیم انسان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا اور لندن مسلم لیگ تباہ کر دی۔

7۔ بنگالی مسلم قیادت نے 1906ء میں مسلم لیگ کے قیام، اور تحریک کے آخری برسوں میں اہم کردار ادا کیا تھا، لیکن آل انڈیا مسلم لیگ اُن کے کردار کا اعتراف کرنے میں ناکام رہی اور اہم بنگالی رہنماؤں کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ قیامِ پاکستان کے وقت اردو بولنے والے غیر بنگالی رہنماؤں نے اُنہیں سائیڈ لائن کر دیا۔ 47-1946 کی وسط مدتی حکومت کے لیے لیگ کے نامزد کردہ پانچ اراکین میں ایک بھی بنگالی مسلمان شامل نہیں تھا۔ کیا بنگال میں آئی آئی چندریگر، سردار عبدالرب نشتر اور راجہ غضنفر علی کے مقابلے کا کوئی رہنما نہیں تھا؟

اس صوبے کی اہمیت بتانے اور اس کے ساتھ شمالی ہند کی مسلمان قیادت کے روا رکھے جانے والے سلوک کی وضاحت کرنے کے لیے بنگالی تاریخ کے کئی ایک دیگر خدوخال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جگہ کی تنگی کے پیشِ نظر میں چند ایک معروضات پر ہی اکتفا کروں گا۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی ہند میں مسلم سیاست، جیسا کہ درسی کتب بتاتی ہیں، صرف شمالی ہند تک ہی محدود نہیں تھی۔

درسی کتب میں بنگالی مسلمانوں کے کردار کو حذف کرنے، یا کم تر درجہ کا بتانے کے نتائج کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

1۔ پاک بھارت تاریخ کے ایک اہم حصے کو جان بوجھ کر منظم طریقے سے مسخ کرتے ہوئے

طلبا کو ہمارے ماضی کے بارے میں گمراہ کیا گیا ہے۔

2۔ 1971ء سے پہلے ملک کی ایک بڑی اکثریت کو اس طرح نظر انداز کرنا مجرمانہ حرکت کے زمرے میں آتا ہے۔ بلکہ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ اس سے طلبا کو یہ تاثر ملتا ہے کہ جس ملک (پاکستان) کی وہ تاریخ پڑھ رہے ہیں، اس کا مشرقی بازو کبھی تھا ہی نہیں۔

3۔ نصاب میں نظر انداز کردیے جانے کی وجہ سے بہت سے بنگالی پاکستان سے بددل ہوگئے۔ اگر بنگال ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ثقافتی احیا کا حصہ نہیں تھا، اور نہ ہی اس نے تحریک پاکستان میں کوئی قابل ذکر کردار ادا کیا تھا، اور اسے ملک کا ایک غیر اہم حصہ سمجھا جارہا تھا تو اس سے یہی تاثر جاتا تھا کہ ان کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ تاثر درسی کتب نے تخلیق کیا اور پھیلایا۔ اس کی وجہ سے پہلے تناؤ پیدا ہوا جو کشمکش اور خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گیا، اور آخرکار 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنا۔

4۔ طالب علم کے ذہن کو بہت محنت سے تیار کیا جارہا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو قبول کرلے۔ اس سے دو طرح کا ردعمل پیدا ہوسکتا ہے: مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو ایک بہتر پیش رفت سمجھ کر قبول کرلے (میں جانتا ہوں کہ مشرقی پاکستان غدار اور پریشان کن تھا، چنانچہ اسے ساتھ رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا)؛ یا اسے کوئی قابل ذکر واقعہ نہ سمجھے (مجھے نہیں پتہ مشرقی پاکستان کیا تھا، اور نہ ہی مجھے اس کی علیحدگی میں کوئی دلچسپی ہے)۔ بالفاظ دیگر، طلبا کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ 1971ء سے پہلے کی ملکی تاریخ میں کوئی دلچسپی نہ لیں مبادا 1971ء سے پہلے قائم ہونے والی حکومتوں کی خراب نیت اور مذموم ارادے ظاہر ہوجائیں۔ مغربی پاکستان کے مصنفین، دانشور اور اساتذہ بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

5۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے قیام پاکستان کی بنیاد بننے والے دوقومی نظریے کو تباہ کردیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس نظریے کی بنیاد پر حاصل کردہ ملک دولخت ہوگیا۔ دوسری یہ کہ اپنی راہیں الگ کرنے والے حصے نے علیحدگی کی جنگ میں انڈیا سے مدد طلب کی۔ اور انڈیا نے 1947ء سے پہلے اور بعد میں، اس نظریے کو ہمیشہ مسترد کیا۔ 1971ء کے سانحے کا یہی پہلو طلبا کی نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔

6۔ اس سقوط نے ہمارے رہنماؤں اور علما کے اس دعوے کی قلعی کھول دی کہ اسلام تحریک پاکستان کی روح رواں تھا، اور اسی پر پاکستانی قومیت کی بنیاد ہے۔ جب طلبا، حتیٰ کہ سینئر طلبا کو بھی اس واقعے کی حقیقت، اور اس کے مضمرات سے آگاہ نہیں کیا جاتا تو وہ شک میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا واقعی اسلام تحریک پاکستان کی روح رواں تھا؟ اس باوجود ہر درسی کتاب اس پر اصرار کرتی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کی اصل بنیاد اسلام ہی تھا، اور یہ کہ اسلام ہندومت کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ انڈیا سے الگ ہو جائیں۔ گویا قیام پاکستان لازمی تھا۔ سکولوں میں طلبا یہ دلیل بہت سنتے ہیں، لیکن اُنھیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ 1971ء میں اس کا کیا بنا۔ یہاں صرف ابہام ہی طالب علم کا منتظر ہوتا ہے۔

تاریخ کا تقاضا

تاریخ پڑھانے یا درسی کتاب لکھنے کے خواہشمند افراد کی توجہ کے لیے میں یہاں مختصراً کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ موضوعات بوجوہ، جن کا میں ذکر کر چکا ہوں، نصاب میں شامل نہیں کیے جاتے، لیکن ان کے بارے میں جاننا از حد ضروری ہے:

1۔ انڈین نیشنل کانگرس: ہماری مشترکہ تاریخ کا حصہ ہے۔ کئی ایک اہم مسلمان رہنماؤں نے اس میں اہم کردار ادا کیا؛ محمد علی جناح بھی کئی برسوں تک اس کے کارکن رہے؛ اور پھر مسلم لیگ نے اس کے ساتھ ایک معاہدہ (لکھنو پیکٹ) بھی کیا۔ ٹھیک ہے کہ اسے دشمن پارٹی سمجھا جاتا ہے، لیکن عام فہم کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے دشمن کے بارے میں تو جانتے ہوں۔

2۔ خدائی خدمتگار تحریک: یہ ایک اہم مسلمان پارٹی تھی۔ اس نے این ڈبلیو ایف پی میں بیداری پیدا کی۔ اُنھوں نے صوبائی خودمختاری ملنے کے بعد دس میں سے آٹھ سال تک صوبے میں حکومت کی۔

3۔ پنجاب یونینسٹ پارٹی: یہ پنجاب (جو 1971ء کے بعد ملک کا سب سے بڑا صوبہ تھا) پر حکومت کرنے والی اہم جماعت تھی؛ اور اس نے سکندر جناح پیکٹ کے تحت ہندوستان بھر میں پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ مسلم لیگ نے بہت کوششوں کے بعد اس سے معاہدہ طے کیا تھا؛

اور بہت سے مسلم لیگی رہنما سابق یونینسٹ ہی تھے۔

4۔ خاکسار تحریک: پنجابی مڈل کلاس کے ایک حصے میں مقبول یہ تنظیم کچھ بنیادی خوبیاں، جیسا کہ سادگی، انکساری، نظم وضبط رکھتی تھی، اور پھر اس کے رہنما، عنایت اللہ خان مشرقی ایک قدآور مفکر تھے (گو بہت سوں کو یہ بات معلوم نہیں)۔

5۔ احرار: یہ مذہبی جذبات رکھنے والے طبقے کی مضبوط ترجمان تھی۔ پنجاب میں اپنا وجود رکھنے والی اس جماعت کو درمیانی اور نچلے طبقے کے کچھ دھڑوں کی حمایت حاصل تھی۔

6۔ قوم پرست، یا کانگرس نواز مسلمان رہنما: ان قوم پرست مسلمان رہنماؤں نے کانگرس پر زور دیا کہ وہ لیگ کا مطالبہ مسترد کر دے۔ اُن کے دباؤ کی وجہ سے ہندو مسلم معاہدہ ناممکن ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان اُس عہد کے کچھ قابل ترین افراد موجود تھے۔

7۔ انڈیا، یا کم از مسلم انڈیا کی تاریخ نویسی: مختلف ادوار کے تاریخ نویسوں کے کام کے مطالعے سے خطے کی تاریخ جاننے میں مدد ملے گی۔

8۔ تاریخ کا تصور اور فلسفہ: (تیرویں اور چودویں کے طلبا کے لیے) اسے جانے بغیر تاریخ کے معانی اور اہمیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

9۔ معاشی، سماجی، فکری اور ادبی تاریخ: ان گوشوں پر بات کیے بغیر سیاسی تاریخ کا ذکر ادھورا ہو گا۔ لیکن اس میں احتیاط ضروری ہے کہ طلبا کی عمر کے مطابق اُنہیں تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا جائے۔

10۔ جدید اسلامی فکر: (شاہ ولی اللہ سے لے کر موجود دور تک) جدید اسلامی فکر سے آگاہی ضروری ہے کیونکہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، حاجی شریعت اللہ، دودو میاں، سید احمد بریلوی، تیتو میر، کرامت علی جونپوری، سرسید احمد خان، امیر علی، ڈاکٹر اقبال، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی، غلام احمد پرویز اور دیگر کے نظریات اور افکار نے گزشتہ چند ایک نسلوں کی سیاسی اور ثقافتی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ چنانچہ طلبا کو وجوہ بتائے بغیر نتائج سے آگاہ کرنا، اور اٹھنے والے بنیادی سوالوں کا جواب نہ دینا اُن کے ذہن میں نیم پختہ علم اتارنے کا باعث بنتا ہے۔ مواد سے آشنا کرتے وقت طلبا کی عمر کو مدِنظر رکھا جائے۔

نوٹ: میں نے یہ نیا لفظ، مہاجر، ''فرائیڈے ٹائمز، لاہور'' کے کالموں سے مستعار لیا ہے۔ میں اسے دلی، یوپی، بہار اور حیدرآباد سے آنے والے افراد، جن کی مادری زبان اردو ہے، کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ پاکستان کے مقامی کلچر کو دیکھ کر ان کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے۔ ان کی مشرقی پنجاب، کشمیر، راجستھان، بمبئی، گجرات اور انڈیا کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں سے کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔
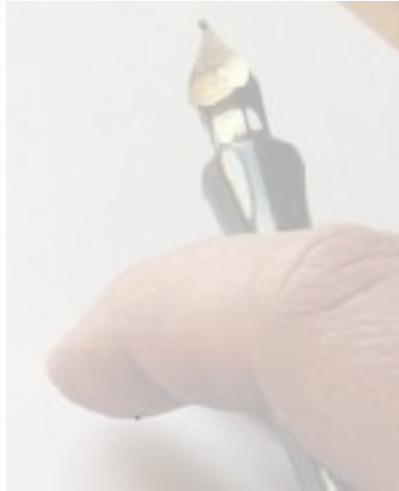
4

ذمہ داری کا بوجھ

گزشتہ تین ابواب میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے عقلی سقم، متعصبانہ بیانات، گمراہ کن نتائج، خود پارسائی پر مبنی منافقانہ دلائل اور فاش غلطیوں پر بات کی گئی۔ حکومت کی شائع شدہ درسی کتب میں سنی سنائی حکایات پر مبنی مشکوک اسناد اور تیسرے درجے کی مبہم رپورٹس کو جگہ دے کر مستند حقیقت بنا دیا گیا۔

ان کتابوں میں ہر جگہ فاش غلطیوں کی موجودگی ایک سوال اٹھاتی ہے: پیش کیے گئے مواد کے معیار کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

مقتدرہ

ان غلطیوں کی ذمہ داری بالترتیب سرکاری مقتدرہ، مصنفین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ سرکاری مشینری تمام سطح پر سرگرم عمل ہوتی ہے۔ یہ تعلیمی پالیسی بنانے کے علاوہ ٹیکسٹ بک بورڈ قائم کرتی، چلاتی اور اس کا اسٹاف بھرتی کرتی ہے۔ یہ کتابیں تحریر کرنے کے لیے مصنفین کا چناؤ کرتی ہے؛ گائیڈ لائن دیتی ہے؛ اس کا بورڈ کتابوں پر نظر ثانی اور غلطیوں کی اصلاح کرتے ہوئے حتمی مسودے کی منظوری دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ کتابیں شائع اور فروخت کرتی ہے۔ یہ طویل اور مہنگی سرگرمی وزارت تعلیم ۔۔۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن، قومی جائزہ کمیٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور قائدِاعظم یونیورسٹی کے زیرنگرانی انجام پاتی ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں بھی مشترکہ طور پر ملک کی تمام جامعات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ انہی جامعات کے اساتذہ درسی کتب تحریر کرتے ہیں۔ مختلف ٹیکسٹ بک بورڈ کو صوبائی حکومتیں کنٹرول کرتی ہیں؛ لیکن درسی کتب کے ضمن میں وہ اسلام آباد سے ہدایات وصول کرتی، اور ہر

مسودے کو درستی، اصلاح اور منظوری کے لیے دارالحکومت میں جائزہ کمیٹی کے پاس بھیجتی ہیں۔ زیادہ تر مصنفین کا تعلق گورنمنٹ کالجز سے ہوتا ہے؛ اور یہ کالجز صوبائی محکمہ تعلیم کی شاخیں ہیں۔ ان کے اساتذہ لفظی اور حقیقی، ہر دو معنوں میں سرکاری ملازمین ہیں۔

جس تسلسل، تعداد اور تعدد سے غلطیاں نمودار ہوتی ہیں، اور جس طرح نصاب تعصب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، اس سے تاثر ملتا ہے کہ مسودے کی تیاری کسی ایک شخص، یا چھوٹی سی ٹیم کا کام ہے۔ نیز تمام مصنفین کو اس کے مواد کے مطابق کتاب لکھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہر جماعت کی ضروریات کے مطابق زبان، تفصیل، موضوع اور مضامین کی کانٹ چھانٹ کر کے کتاب شائع کر دی جاتی ہے۔ بے شک اس حقیقت سے تقویت پاتا ہے کہ مبالغہ آرائی اور تحریف کے پیچھے سرکاری ذہنیت کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

مصنفین اور اساتذہ

ہوسکتا ہے کہ مصنفین کے پاس دو بہانے موجود ہوں: وہ سرکاری ملازمین ہونے کے ناتے آزادی نہیں رکھتے، نیز وہ اپنے تحریر کردہ مواد سے اتفاق کرتے ہیں۔ پہلا بہانہ ناقابل قبول ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی خدمات خود پیش کی تھیں، اور یہ ''کام'' حاصل کرنے کے لیے پیہم درخواستیں دینے کے علاوہ اثر و رسوخ بھی استعمال کیا ہوگا۔ دوسرا جواز تو ایک طرح کا اعترافِ جرم ہے۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تحریر کردہ مواد سے متفق ہیں۔ گویا وہ جھوٹ اور دروغ گوئی کے ذریعے ملک کی نوجوان نسل کو گمراہ کرنے کی ذمہ داری قبول کر رہے ہیں۔

دونوں صورتوں میں اُنھوں نے سچ کو موقع پرستی کا مطیع بنا دیا ہے۔ وہ تاریخ کی نگاہ میں مضحکہ خیز دکھائی دینے سے نہیں، اپنے حکام بالا سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ اُنھوں نے علم کی کھیتی میں زہرناک بیج بوتے ہوئے تعلیم اور استاد کے مقدس پیشے کی توہین کی ہے۔ اُنھوں نے اُس اعتماد کو چکنا چور کر دیا جو نئی نسل اپنے اساتذہ پر رکھتی ہے۔

اساتذہ کو تین حوالوں سے قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ پہلا، تمام مصنفین کا تعلق اسی شعبے سے ہے۔ دوسرا، برس ہا برس سے تدریس کے شعبے میں ہونے کی وجہ سے وہ صحیح اور غلط جانتے ہیں۔ گویا اُن

میں شخصی دیانت کا فقدان تھا۔ تیسرا، اُنھوں نے اپنے آپ کو خود اس گھاٹی میں گرایا ہے۔ اگر وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ پڑھا رہے ہیں، وہ درست نہیں تو پھر نا قابل بیان فکری جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس مواد کو درست مانتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقت سے لاعلم ہیں۔ گویا اُنھوں نے کبھی حقیقت جاننے کی کوشش کی ہی نہیں۔

مصنفین اور اساتذہ کے کردار پر بحث مزید تضادات کی طرف لے جاتی ہے۔

مصنفین خود کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: ریٹائرڈ یا حاضر سروس اساتذہ، اور ماہرین تعلیم۔ پہلا گروہ اس اہم ترین پیشے کی نمائندگی کرتا ہے جنھوں نے مرضی یا مجبوری سے نئی نسل کی ذہن سازی کی اہم ترین ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی۔ اُنھوں نے نوجوانوں کو علم کی دولت سے فیضیاب کرنا تھا۔ ان افراد کا تعلق ملک کی اہم ترین جامعات (پنجاب، پشاور، قائدِاعظم، علامہ اقبال اوپن)، اور ملک کے بہترین کالجز سے ہے۔ کچھ مصنفین سید و شریف، کوہاٹ، منڈی بہاؤالدین اور قصور جیسے چھوٹے شہروں کے نسبتاً گمنام کالجوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مغربی جامعات سے پی ایچ ڈی، یا دیگر ڈگریاں رکھنے والے افراد بھی ہیں اور پاکستانی جامعات کے فارغ التحصیل بھی۔ ان کے پاس بسا اوقات ایک سے زیادہ مضامین میں ایم اے کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ کچھ نے اپنے نام کو ''گولڈ میڈلسٹ'' کے جھومر سے بھی آراستہ کیا ہوتا ہے۔ ان میں جامعات کے پروفیسرز بھی ہوتے ہیں اور کالجوں کے لیکچرارز بھی۔ کچھ اپنے شعبوں کے بھی صدر ہوتے ہیں۔ اسی طرف دوسرے گروہ میں وائس چانسلرز، رجسٹرارز، سرکاری افسران سے لے کر ٹیکسٹ بک بورڈ کے ملازمین تک شامل ہیں۔

روایتی طور پر دونوں گروہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے پاس مقامی یا بیرونی جامعات کی سندان ڈگریاں ہیں؛ تدریس کا طویل تجربہ رکھتے ہیں؛ ادارے چلانے سے لے کر تحقیق کرنے تک کی ان کے پاس ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ کالجوں کے مکمل پروفیسرز ہوتے ہیں، گو اُنھوں نے کبھی تحقیق سے اپنے ہاتھوں کو زحمت نہیں دی۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دنیا کی بہترین جامعات سے ڈگری حاصل کر کے پروفیسر، ڈین اور وائس چانسلر کے عہدوں پر فائز ان ''ماہرین تعلیم'' کا اپنا تھیسز بھی شائع نہیں ہوا ہوتا۔ یہی لوگ ٹیکسٹ بک بورڈ میں ڈائریکٹر، مشیر، مدیر، ماہر مضمون، سینئر ماہر مضمون اور نگران

کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ان درسی کتب کی تیاری میں شامل افراد ایمانداری کے سوا دیگر تمام خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ اُن کے پاس علم ہوتا ہے، ورنہ غیر ملکی جامعات اُنہیں کامیاب قرار نہ دیتیں۔ وہ اس پیشے میں نام رکھتے ہیں، ورنہ اُنہیں اتنے اہم عہدوں پر تعینات نہ کیا جاتا۔ اُن کی ساکھ ہوتی ہے، ورنہ حکومت اُنہیں درسی کتابیں لکھنے جیسا اہم کام نہ سونپتی۔ یہ لوگ نہ تو لاعلم ہیں اور نہ ہی بے خبر۔

ان کے پاس کردار کے سوا سب کچھ ہے۔ میں یہ الزام دو بنیادوں پر لگا رہا ہوں۔ پہلی یہ کہ وہ جانتے تھے کہ وہ جو کچھ کتابوں میں لکھ رہے ہیں، وہ غلط ہے۔ درسی کتابیں لکھنے والی نوجوان نسل (خاص طور پر وہ جو غیر ملکی تعلیم حاصل نہ کر سکے) کے پاس شاید یہ بہانہ ہو کہ وہ 1960ء کے بعد شائع ہونے والی یہی کتابیں پڑھ کر جوان اور فیضاب ہوئے ہیں، اور وہ ان سے باہر کچھ نہیں جانتے۔ لیکن یہ بھی افسوس ناک صورتِ حال ہے؛ شعبہ تعلیم سے وابستہ افراد کے پاس لاعلمی کا جواز نہیں ہوتا۔ لائبریریوں میں غیر ملکی اور پاکستانی دانشوروں کی تحریر کردہ سینکڑوں کتابیں موجود ہیں جو درست معلومات رکھتی ہیں۔ نوجوان لکھاریوں اور اُن کے مدیروں کو مطالعہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اُنھوں نے اس کی زحمت نہ کی۔ لکھاریوں کی سینئر نسل (خاص طور پر جن کے پاس تاریخ اور دیگر علوم پر غیر ملکی ڈگریاں ہیں) کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ وہ حقائق سے واقف ہیں؛ اُنہیں حقائق کا کھوج لگانے کی تربیت دی گئی تھی؛ اُنہیں صحیح اور غلط معلومات میں امتیاز کرنا سکھایا گیا تھا؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول چکے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اُن کے پاس تدریس کا اہم شعبہ اپنانے کا کوئی حق نہیں۔ یا پھر ایسا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ درست تاریخ کیا ہے، لیکن اُنھوں نے درسی کتب میں کچھ اور لکھا ہے۔ تو پھر اُن کے پاس لکھاری بننے کا حق نہیں۔ یہ میرا پہلا الزام ہے: اُنھوں نے طلبہ کے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

دوسرا الزام کہیں زیادہ سنگین ہے (بلکہ اسے محض دروغ گوئی کہنا بھی درست نہیں، یہ اس سے کہیں زیادہ قابلِ نفرت ہے)۔ درسی کتابیں لکھنے پر رضامند ہوتے ہوئے (جس کے لیے درخواست گزاری سے لے کر کئی ایک ذرائع استعمال کیے گئے ہوں گے) اُنھوں نے سکول ٹیچرز کا حق ہوتا ہے۔

دنیا بھر میں سکول کی کتابیں سکولوں میں پڑھانے والے استاد ہی لکھتے ہیں۔ یہ اُن کا شعبہ ہے۔ وہ طلبا کے ذہنی رجحان کو جانتے ہیں؛ اُن کی نفسیات کو سمجھتے ہیں؛ اُن کی صلاحیت سے واقف ہوتے ہیں؛ اُن کی علمی ضروریات کا پتہ ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک حقائق ہضم کر سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک خراب کتاب طلبا کی شخصیت کو کتنا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ ذہن کی فطری نشوونما سے واقف ہوتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ طلبا کو اس سال کیا پڑھانا چاہیے، اور اگلے سال اس میں کیا اضافہ کیا جاتا ہے۔ تدریسی مواد کی بتدریج ترتیب اُن کا شعبہ ہے۔

سکول ماسٹرز کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ وہ بچوں کی تعلیمی ضروریات کو اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح ایک چرواہا جانتا ہے کہ اُس کی بھیڑ بکریوں کو کیسی خوراک چاہیے۔ وہ اپنی کلاس سے رابطے میں رہتے ہیں؛ اسے بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ایک کتاب کیا کہنا چاہتی ہے؛ وہ عبارت کا جوہر نکال کر پیش کرتے ہیں۔ تحریر کردہ حروف کے ساتھ اپنی آواز ملاتے ہیں۔ وہ اپنا علم طلبا کے ذہن میں اتارتے ہیں؛ اُن کے سوالات کا جواب دیتے ہیں؛ اُن کی فکری مشکلات کو حل بتاتے ہیں؛ سوال نامے طے کرتے ہیں؛ طلبا کے لکھے ہوئے مواد کی جانچ کرتے اور اُن کے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے پچیس سے چالیس سال اُن کے درمیان گزارتے ہیں۔ یہی کام اُن کی زندگی، اُن کا شوق، اُن کا جذبہ اور اُن کا عزم، بلکہ اُن کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ طلبا اُن کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، وہ ان کی فلاح کو ہر کام پر مقدم رکھتے ہیں۔ لیکن اس تمام کاوش کے عوض انہیں جو تنخواہ ملتی ہے، وہ گھر میں کام کرنے والی ملازمائیں بھی شاید قبول نہ کریں۔

لیکن اس سکول ٹیچر کا درسی کتاب کی تیاری میں کوئی کردار نہیں ہوتا، حالانکہ وہی یہ کتاب روزانہ پڑھاتا ہے۔ اس نے یہ کتاب نہیں لکھی ہوتی، اور نہ ہی وہ اسے تبدیل، یا اس کے مواد کو درست کر سکتا ہے۔ وہ کوئی متبادل درسی کتاب استعمال بھی نہیں کر سکتا۔ کتاب کی تیاری میں اُس سے مشاورت تک نہیں کی جاتی؛ وہ اس میں کوئی تبدیلیاں تجویز نہیں کر سکتا؛ اور اُس کی تجویز کوئی سنتا بھی نہیں۔ اس کی رائے میں کسی کو دلچسپی نہیں۔ چنانچہ اُس کی حالت طلبا سے بھی بدتر ہے۔ طلبا کتاب پڑھنے سے انکار کر سکتے ہیں؛ امتحان میں ناکام ہو سکتے ہیں؛ سکول چھوڑ سکتے ہیں۔ ٹیچر کے پاس ایسا کوئی آپشن نہیں ہوتا۔ کتاب پڑھانے سے انکار پر وہ مالی سنگین مالی مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ

اُس کے علم اور ذوق سے متصادم، غلطیوں سے لبریز یہ کتاب اُس کی شخصیت کو چکنا چور کر دیتی ہے۔

عقل پر حاوی اس ہمہ گیر، عبقری کتاب کی پلاننگ اور ایڈیٹنگ کون کرتا ہے؟ جامعہ پنجاب میں تاریخ کے پروفیسر یا گورنمنٹ کالج کے شعبہ پولیٹکل سائنس کے صدر، یا قائدِ اعظم یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے کوئی ایسوسی ایٹ پروفیسر، یا گورنمنٹ کالج کے سپورٹس کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، یا قائدِ اعظم اکادمی کے ڈائریکٹر، یا پاکستان تحقیقاتی ادارے کے ڈائریکٹر، یا ٹیکسٹ بک بورڈ کے کوئی ماہر مضمون، یا کسی کالج کے کوئی پرنسپل؟

ان فاضل لکھاریوں میں سے کسی نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد سکول کو اندر سے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ اور قیاس ہے کہ اس واقعے کو چالیس برس بیت چکے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی سکول ٹیچر سے بات تک نہیں کی۔ پیشہ وارانہ طور پر اُن میں کوئی ''قدر مشترک'' نہیں؛ سماجی طور پر کم درجہ رکھنے والے سے ملنا توہین سمجھتے ہوں گے۔ وہ اپنے سکول کے دنوں کو بھول چکے ہیں؛ اور نہ ہی اُنہیں وہ کتابیں یاد ہیں جو اُنھوں نے پڑھی تھیں۔ اُن کی تدریس میں دلچسپی اُس تنخواہ تک محدود ہے جو وہ وصول کرتے ہیں، وہ ترقی جو اُنہیں بلا کدو کاوش مل جاتی ہے؛ اور اس پر مستزاد، اُنہیں اضافی دولت کمانے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لیے وہ کچھ پرانے نوٹسز کی مدد لیتے ہیں۔ پروفیسرز بنتے ہی کتابوں سے دوری ''فرض'' ہو جاتی ہے، جسے وہ خوب نبھاتے ہیں۔ مطالعہ کی عادت نہیں، اور کتاب محض مالی فائدے کے لیے لکھنی ہے۔ اگر وہ مطالعہ کا شوق رکھتے ہوں اور اپنا نام شائع دیکھا چاہتے ہوں تو وہ کسی اخبار کے لیے لکھتے ہیں، گو ایسے پروفیسرز خال خال ہیں۔ اگر وہ ''محنتی'' ہوں تو وہ گائیڈ بک، نوٹس، آسان رہنما، گیس پیپرز، حل شدہ سابقہ پرچے وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ یہ تمام محنت اُنہیں مالی فائدہ دیتی ہے۔ اگر وہ پہنچ رکھتے ہوں، یا ''پہنچ'' کی ادائیگی کر سکتے ہوں تو وہ آگے بڑھ کر درسی کتب لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک سکول ٹیچر کو کتاب لکھنے کی ذمہ داری کیوں نہیں سونپی جاتی؟ اس سوال کے دو جوابات ہیں، اور دونوں اُس معاشرے کی وضاحت کرتے ہیں جس میں وہ زندہ ہے۔

1۔ ایک سکول ٹیچر کو سول سروس کے انتہائی کم درجے پر رکھا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ مالیوں اور ڈرائیوروں کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی واپڈا کے قاصد کے برابر ہوتی ہے۔

حتیٰ کہ میونسپل کا عملہ بھی اپنی بات کرنے کی ایک سکول ٹیچر کی نسبت کہیں زیادہ آزادی رکھتا ہے، اور اپنے حلقے میں اُس کی زیادہ عزت ہوتی ہے۔ سکول ٹیچر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بس ''بچے بچیوں'' کو پڑھانا ہے۔ گویا وہ مزید کسی کام کا اہل نہیں۔ اُس سے کتاب تحریر کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

2۔ درسی کتب تحریر کرنا ایک پرکشش ''کام'' ہے۔ جب ایک کتاب کی سال میں لاکھوں کا پیاں فروخت ہوں تو اسے لکھنے کا کنٹریکٹ حاصل کرنے کے لیے کڑی مسابقت ہوگی۔ بعض اوقات ایک سے زیادہ لکھاریوں کی مشترکہ کاوش شامل ہوتی ہے۔ اسے تحریر کرنے میں ایک مہینہ لگتا ہے۔ جب اس پر لگنے والے وقت اور محنت کو حاصل ہونے والی رقم کے حساب سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غیر ملکی اسناد رکھنے والے پروفیسرز، سینئر لیکچرار، پرنسپل اور ماہرین تعلیم انہیں لکھنے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کیوں کرتے ہیں۔ اس کے لیے اثر ورسوخ استعمال کیا جاتا ہے؛ سفارش کرائی جاتی ہے؛ دوستوں کا کندھا استعمال کیا جاتا ہے؛ ''خیال رکھنے'' کا وعدہ ہوتا ہے؛ رشوت کی پیش کش کی جاتی ہے؛ ضرورت پڑے تو دھمکی سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ مقابلہ سخت، اور انعام بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس دوڑ میں سکول ٹیچر کی کہاں سمائی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ بہترین تعلیم یافتہ شخص بھی اس میدان میں نہیں اتر سکتا۔ اُسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ کسی آکسفورڈ سے ڈی فل، واشنگٹن سے پی ایچ ڈی، یا لندن سے ایم ایس سی کی ڈگری رکھنے والے کی تحریر کردہ بے بنیاد، فضول اور عقل سے بعید باتیں پڑھائے۔

یہاں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اس سے ہمارے ہاں سکول کی تعلیم کے گھٹیا معیار کی وضاحت ہوتی ہے۔ پہلے سے ہی کام، مایوسی، ناکامی، غربت، احساس کمتری اور پسپائی اور محرومی کے بوجھ تلے دبے سکول ماسٹرز کو اُس کتاب کی تیاری کے عمل سے دور رکھا جاتا ہے جو اُس نے پڑھانی ہے اور جو اُس کے طلبا کا واحد ذریعہ علم ہے۔

یہاں یہ بات بھی کہنی ضروری ہے کہ میٹرک کر کے اعلیٰ کلاسوں میں داخلہ لینے والے طلبا کے ناقص معیار کی شکایت کرنے والے کالج اور جامعات کے پروفیسرز کا گلہ بالکل بلا جواز ہے۔ وہ ''جاہل نسل'' کو جامعات میں بھیجنے پر سکول ٹیچر کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ان لاعلم بچوں کو انہی کی لکھی گئی کتابیں پڑھائی گئی ہیں؛ اور انھوں نے وہ کتابیں علم کے فروغ کے لیے

نہیں، پیسہ کمانے کے لیے لکھی تھیں۔ لیکن پروفیسرز اور سکول ٹیچرز، دونوں اس نظام کی انتہا پر ہیں؛ ایک دولت سمیٹتا ہے، دوسرا تنقید کا نشانہ بنتا ہے۔ دونوں اس "وصولی" کے مستحق نہ تھے۔ پروفیسر کو ملنے والی تنخواہ اس کے معیار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ نیز وہ درسی کتب، نوٹس، گائیڈ بکس، امدادی مواد، امتحانی مراکز کی نگرانی (جس میں "وقت بڑی دولت ہے" کا عملی مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے) اور ٹیوشن پڑھا کر بھاری دولت کماتا ہے۔ دوسری طرف سکول ٹیچر کو بہت کم تنخواہ ملتی ہے؛ افسران اُس سے ناروا سلوک کرتے ہیں؛ اُسے طویل دورانیے تک تدریسی فرائض سرانجام دینا پڑتے ہیں؛ لیکن وہ اپنے خاندان کے لیے ڈھنگ کی زندگی، کھانا، کپڑے اور دیگر ضروریات فراہم نہیں کرسکتا۔

یہ ایک عجیب دنیا ہے جس میں پہلے سے ہی سیر شکم پروفیسر مزید دولت سے دست کش ہونے کی بجائے پہلے سے ہی غریب پروفیسر کی حق تلفی کرتا ہے۔ نیز یہ اندھی طمع تعلیمی نظام کو تباہ کردیتی ہے۔ اس معروضے کی تصدیق کے لیے میرے پاس بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

میری خواہش ہے کہ مجھے تمام درسی کتب تحریر کرنے والوں کا انٹرویو کرنے کا موقع ملتا تو میں اُن سے ایک دوٹوک اور مشکل سوال ضرور پوچھتا: آپ نے یہ کچھ کیوں لکھا ہے؟ مجھے خوشی ہے کہ کم ازکم ان میں سے ایک جواب میرے ریکارڈ پر ہے۔ مس عالیہ انعام کی گئی اس انکوائری کے جواب میں چھٹی، ساتویں، نویں، دسویں اور انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کے مصنف اور شریک مصنف ڈاکٹر حسن عسکری رضوی نے بہت بے تکلفی اور خوشگوار لہجے میں جواب دیا، "اگر میں نے یہ کتابیں نہ لکھیں تو کوئی اور لکھ دے گا۔ پھر میرا خیال تھا کہ میں بہت سے نام نہاد ماہرین کی نسبت یہ کام بہتر طریقے سے کرسکتا ہوں۔" پروفیسر صاحب کا کہنا تھا کہ وہ دی گئی ہدایات کے مطابق ہی "کام" کرتے ہیں (یہ ہدایات کون دیتا ہے؟)۔ "ہمیں بتایا جاتا ہے کہ کس بات پر زور دینا، اور کسے نظرانداز کرنا ہوگا۔ اوراس کے بعد ایک وفاقی کمیٹی میرے ڈرافٹ کی نظرثانی کرتے ہوئے وہ تمام اور سطور بھی نکال دیتی ہے جو اُنہیں پسند نہیں۔" (فرائڈے ٹائمز، 25-19 مارچ 1992)۔ اس کے بعد بھی پروفیسر رضوی کتاب کو اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ اُس جواز پر ایک قاری نے آپے سے باہر ہوتے اسے بددیانتی اور جعل سازی قرار دیا۔ اُن کا کہنا تھا، "جس شخص نے معصوم اور نوخیز ذہن رکھنے والے بچوں کو اس طرح دھوکے میں رکھا ہے، وہ خدا کو بھی دھوکا دینے کی

کوشش کرے گا۔'' (بیرسٹر باچا، پشاور، خط، فرائیڈے ٹائمز، اپریل 1992)۔

افسوس، ہمارے بیشتر اعلیٰ اساتذہ کو ضمیر نامی کوئی چیز چھو کر بھی نہیں گزری۔

اُنہیں یہ بھی علم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پروفیسر مہدی رضا بیگ پانچ جولائی 1992ء کو اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اُنھوں نے ایک طویل عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں پولیٹکل سائنس کا مضمون پڑھایا تھا۔ مدت تمام ہونے سے تین دن پہلے اُنھوں نے دنیا کو اپنے فکری نچوڑ سے فیض یاب کیا: ''معلمی ایک قابل عزت پیشہ نہیں ہے۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ترقی کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اُنہیں اپنے پینتیس سالہ دور میں صرف دو مرتبہ ملازمت ملی۔ وہ اپنے نصاب کے ساتھ بھی خوش نہیں تھے کیونکہ وہ مسخ شدہ حقائق پر مبنی ہے۔ وہ معیارِ تعلیم کے بھی ناقد تھے۔ اُن کا کہنا تھا، ''ہم اپنے بچوں کو غلط چیزیں پڑھا رہے ہیں۔ میں نے شعبوں کے سربراہان سے بات کی ہے۔ وہ اس صورتِ حال کے ذمے دار ہیں، لیکن اُنہیں معیارِ تعلیم بہتر بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اُن کی توجہ کا ارتکاز غیر نصابی سرگرمیوں، جیسا کہ پکنک اور تقریبات اور سالگرہ وغیرہ منانے پر ہے۔''

اس تمام صورتِ حال کے باوجود پروفیسر بیگ انتہائی رجائیت پسند تھے۔ اُن کا کہنا تھا، ''نظام میں کوئی خرابی نہیں؛ نظام درست ہے۔ اس نظام نے بہت سے عظیم انسان پیدا کیے ہیں۔ تقسیم سے بھی پہلے بھی یہی نظام تھا، اور ہندوستان کے زیادہ تر دانشور اور رہنما اسی نظام کی پیداوار ہیں۔ ہمارے موجودہ دانشور بھی اسی سے نکلے ہیں۔'' (انٹرویو، ایم اے زیدی، نیشن، لاہور، فرائیڈے میگزین، تین جولائی 1992)۔ اس انٹرویو کے نصف میں پروفیسر صاحب کی رنگین تصویر ہے۔ یقیناً معلمی ایک قابل عزت پیشہ نہیں ہے۔

اشرافیہ کا تعلیمی معیار

اب ہم متوازی لیکن مختلف نظام تعلیم اور اس کے اساتذہ کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ کیا رقم خرچ کر کے تاریخ کا بہتر علم حاصل کیا جا سکتا ہے؟

نجی شعبے میں چلنے والے انگلش میڈیم سکولوں کی دو اقسام ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر اپنے معیار، سہولت، تدریس اور تدریسی سٹاف کے لحاظ سے سرکاری سکولوں جیسے ہی ہیں۔ ہر صوبے میں ان

کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ صرف لاہور میں ہی ان کی تعداد کوئی دو ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اُن کی تعلیم سرکاری سکولوں سے مختلف نہیں؛ صرف ذریعہ تعلیم کا فرق ہے۔ وہ انگریزی میں تعلیم دیتے ہیں، لیکن اُن کی انگریزی کا معیار انتہائی ناقص ہے۔ اُن کے وجود اور تعداد میں بے تحاشا اضافے کی وجہ درمیانی طبقے کی بالائی طبقے کے ساتھ ہم قدم ہونے کی خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ طبقہ دس گنا زیادہ فیس اور فنڈ زادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اشرافیہ کے ممتاز سکول ہیں۔ بڑے شہروں میں واقع یہ سکول اپنی وسیع وعریض عمارت، یورپی نام، بھاری بھر کم فیس اور مہنگے اساتذہ کے ساتھ خوشحال خاندانوں کو تعلیمی سروسز فراہم کرتے ہیں۔ پاکستانی معیار کے اعتبار سے ان کی فیس اور اساتذہ کے مشاہرے ہوشربا ہوتے ہیں۔ چونکہ اشرافیہ کے پاس بے پناہ دولت ہے، اس لیے یہ سکول بھی طلبا سے بھرے ہوتے ہیں۔ انہیں چلانے والے بھاری دولت کماتے ہیں۔ عام ٹیچر کو سرکاری سکول کی نسبت تین سے چھ گنا زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا تدریسی معیار بہتر ہے۔ یہاں ٹیچر کے تعلیم اور قابلیت سے زیادہ اُس کے روابط کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کی اسناد بہرحال اُس کی قابلیت سے بہتر ہوتی ہیں۔ وہ بھی اسی نظام تعلیم کی پیداوار ہے، اور اس کی ڈگری بھی کسی مقامی جامعہ کی ہوگی۔

اشرافیہ کے یہ سکول طلبا کو برٹش جنرل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن کی تیاری کراتے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ یونیورسٹی آف کیمبرج کا مقامی ایگزیمینیشن سنڈیکیٹ جاری کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سکول کون سی خاص کتابیں استعمال کرتے ہیں، لیکن چیف ایگزیمنز کی رپورٹس ان سکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں اور تدریسی عملے کے ناقص معیار کا پتہ دیتی ہیں۔ اس سے میری کتابوں پر تنقید کی تصدیق ہوتی ہے۔

1988-90ء میں چیف ایگزیمنز کی مطالعہ پاکستان کے بارے میں ایک رپورٹ کے مطابق امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبا پاکستانی تاریخ اور ثقافت کا زیادہ فہم نہیں رکھتے۔ بہت سے امیدواروں نے اٹھارویں صدی کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے جواب میں انیسویں صدی میں پیش آنے والے واقعات کا حوالہ دیا۔ کچھ کو علاقائی اور قومی زبانوں کے بارے میں فرق واضح نہیں تھا۔ اسی طرح وہ ''نظریے'' اور ''تاریخ'' کے درمیان فرق کرنے سے قاصر تھے۔ وہ محمد بن

قاسم اور محمود غزنوی کی زندگیوں کے بارے میں درست معلومات نہیں رکھتے تھے۔ کچھ کو سید احمد بریلوی اور سر سید احمد خان کے درمیان فرق کرنے میں دقت کا سامنا تھا۔ چوہدری رحمت علی پر پوچھے گئے سوالات کے جوابات ''غیر متوقع حد تک'' کمزور، ناقص اور غلط تھے۔ اس سے رٹا لگانے کے خطرے کا پتہ چلتا ہے۔ لیے گئے تمام امتحانوں میں امیدواروں کو 1947ء میں بنگال کے فیصلے، یا بنگلہ دیش کی تخلیق کے حقیقی عوامل کا علم نہ تھا۔ ممتحن بھی حیران تھے کہ زیادہ تر طلبا قائدِ اعظم کی زندگی اور سیاسی کیریئر کے مختلف مراحل سے بے خبر تھے۔ بہت سوں کو قراردادِ لاہور اور قراردادِ مقاصد کے درمیان فرق معلوم نہیں تھا۔ پاکستان میں تعلیم کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے جواب میں طلبا ''مقدار'' اور ''معیار'' کے درمیان فرق کرنے سے قاصر تھے۔

یہ مخصوص نکات اٹھانے کے بعد چیف ایگزیمنر عمومی رائے دیتا ہے، جس کا یہاں حوالہ دیا جانا چاہیے: ''استاد کو اپنے طلبا کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وہ قیامِ پاکستان کا باعث بننے والے واقعات کا تنقیدی جائزہ لیں، اور 1947ء سے لے کر آج تک ملک کے ارتقائی عمل کو سمجھیں۔ موجودہ اور ماضی میں امتحان دینے والے امیدوار جنوبی ایشیا میں اسلامی حکومت اور اداروں کے بارے میں ابہام کا شکار رہے ہیں۔ ثقافت کے موضوع پر طلبا رسم و رواج کے بارے میں نصاب میں شامل روایتی بیانیے پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ قومی، علاقائی اور مقامی حوالوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔۔۔ طلبا کو چاہیے کہ وہ نصاب سے ہٹ کر بھی دیگر معیاری کتب اور انسائیکلوپیڈیا سے حوالہ جات تلاش کریں اور نفسِ مضمون کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ انہیں تاریخ پر پوچھے گئے سوالات کا جواب تحریر کرتے وقت تیز و تند تنقید یا یک طرفہ دفاعی لہجہ اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ یقیناً وہ نصاب میں شامل کچھ مضامین پر دو ٹوک تصورات رکھتے ہوں گے، لیکن ممتحن جذباتیت کی بجائے مدلل پیرائے میں دیے گئے جواب کو پسند کرتے ہیں۔ تعلیمی نظام کی ناقص کارکردگی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ طلبا موقف کو تقویت دینے کے لیے معاون دلیل فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔'' (اسلامیات، مطالعہ پاکستان، سکول سرٹیفکیٹ، جی سی ای، او لیول۔ چیف ایگزیمنر کی رپورٹ، نومبر 1989 امتحان۔ لوکل امتحانات سنڈیکیٹ، یونیورسٹی آف کیمبرج)۔

ہمارے چوٹی کے درجہ اول کے سکولوں کے تیار کردہ امیدواروں کی کارکردگی پر یہ تبصرہ ثابت کرتا ہے کہ وہ بہت مہنگی قیمت پر کیسی تعلیم فروخت کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود اس مارکیٹ کی

شرح نمو بہت زیادہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو ایسے سکولوں میں کیوں بھیجتے ہیں؟ پہلی بات یہ ہے کہ اُن کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اس کا کیا کریں؟ بچے کی تعلیم پر سرمایہ کاری کرنا ہی غالباً رقم کا بہترین استعمال ہے۔ دوسری، وہ انتہائی مغرب زدہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقے میں روانی سے انگریزی بولنا علمی مواد سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تیسری، جی سی ای سرٹیفکیٹ بہترین مقامی کالج میں داخلے کی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اگر بچہ باصلاحیت ہو تو وہ اے لیول، اور ممکنہ طور پر کسی برطانوی یونیورسٹی میں جا سکتا ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ والدین نہیں سمجھ سکتے کہ یہ مہنگے ادارے ''اچھی تعلیم'' فراہم تو کرتے ہیں، لیکن اس کا معیار کیا ہے؟ آخری، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان اداروں میں بچوں کو تعلیم دلانا ایک سٹیٹس سمبل بھی ہے۔ وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کا اشرافیہ سے تعلق ہے۔ لیکن ان میں سے کتنے والدین نے چیف ایگزیمنر کی رپورٹ پڑھی ہوگی؟

بظاہر اس سکول سسٹم کے کئی ایک فوائد ہیں۔ طلبا میں اعتماد پیدا ہوتا ہے؛ وہ انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں (اگرچہ اُن کی تحریر کردہ انگریزی کا معیار انتہائی پست ہوتا ہے، جیسا کہ چیف ایگزیمنر نے کچھ پیراگرافس کو بطور پر حوالہ رپورٹ میں شامل کیا۔ لیکن ہمارے معاشرے میں بولا گیا لفظ ہی انسان کی شناخت ہوتا ہے۔ تقریر، نہ کہ تحریر، سے انسان کی صلاحیت کا تعین کیا جاتا ہے)۔ اُسے علمی زندگی میں اس تعلیمی پس منظر کا فائدہ ملتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس قسم کے سکول میں گیا تھا۔ اور پھر اس معاشرے میں سب سے اہم اور قابلِ قدر اثاثہ دولت ہے، چاہے کسی بھی طریقے سے حاصل کی گئی ہو۔ چنانچہ یہ سکول ترقی کر رہے ہیں۔ دیگر امیدواروں کے مقابلے میں ملازمت کے لیے انٹرویو دیتے ہوئے اُس کی کارکردگی یقیناً بہتر ہوتی ہے۔ خاندانی روابط، تعلیمی پس منظر اور جی سی ای کسی بھی سلیکشن بورڈ کی جانچ کا ترازو اس کی حمایت میں جھکانے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ جاہ طلب والدین کے لیے ان سکولوں کی کشش قابلِ فہم ہے۔

اس کے باوجود درجہ اوّل کے یہ سکول معیاری تعلیم فراہم کرنے کی حتمی جانچ پر پورے نہیں اترتے۔ ان سے فارغ التحصیل طلبا عام انگلش میڈیم اور سرکاری سکولوں میں پڑھے ہوئے طلبا سے کس طرح مختلف ہیں؟ صرف سماجی مرتبے کے حوالے سے فرق ہوتا ہے، لیکن یہ مرتبہ تو طالبِ علم کا خاندان اُسے سکول میں داخل ہونے سے پہلے دے چکا ہوتا ہے۔ دوسرا فرق انگریزی بولنے کا ہے۔ عام

سکولوں کے بہت کم طلبا انگریزی میں اظہارِ خیال پر قادر ہوتے ہیں۔ ان دو ''خوبیوں'' کو نکال دیں تو ان تمام طلبا کی ذہنی اور فکری صلاحیت یکساں ہوں گی۔ کم از کم مطالعہ پاکستان جیسے لازمی مضمون کی حد تک سب کی معلومات ناقص اور یک طرفہ ہوتی ہیں۔ بنیادی حقائق پر اُس کی گرفت کمزور، سوال کی تفہیم مشکوک، اندھا دھند رٹا لگانے پر انحصار، گھسے پٹے جملے اور مواد ازبر کرنے پر زور، سچائی پر نظریے کو ترجیح، اور اس پر قہر یہ کہ اُس کی تحریر کردہ انگریزی عبارت نہایت عامیانہ ہوتی ہے۔ چیف ایگزیمنز نے رپورٹ میں جا بجا ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایک مرتبہ پھر تمام قصور درسی کتاب کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ برطانوی تاریخ، فزکس یا ریاضی کے لیے جی سی ای کا طالب علم غیر ملکی کتابیں استعمال کرتا ہوگا، لیکن مطالعہ پاکستان (تاریخ اور ثقافت) کے لیے وہ مقامی کتابیں ہی پڑھے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑھتا کہ سکول کیا فیس وصول کرتا ہے؛ یا ٹیچر کتنی روانی سے لیکچر دیتے ہیں؛ یا اُسے کتنی عمدہ اور معیار لائبریری کی سہولت حاصل ہے۔ جب تک طالب علم پاکستانی درسی کتابوں سے استفادہ کرتا ہے (چیف ایگزیمنز کو شکایت ہے کہ وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتا)؛ اُس کا تاریخ کا علم تیسرے درجے کے کسی طالب علم سے بہتر نہیں ہوگا۔ درسی کتاب کی وجہ سے اُس کی تعلیم پر کی گئی تمام تر بھاری بھرکم سرمایہ کاری ضائع ہو جاتی ہے۔

بلا اعتراض قبولیت

اگر درسی کتابیں اتنی ہی خراب ہیں جتنی میں نے ثابت کی ہیں تو پاکستانی ان کے خلاف آواز کیوں بلند نہیں کرتے؟ اس سوال کا ضمنی جواب تو میں نے گزشتہ صفحات میں دے دیا ہے، لیکن آیئے اس پر مزید غور کرتے ہیں۔

آواز کون بلند کرے گا اور کیوں؟ عام طور پر احتجاج ضرورت، صلاحیت یا حوصلے، یا تینوں کے ادغام سے جنم لیتا ہے۔ کیا یہ تینوں عوامل ہمارے معاشرے یا نظام میں موجود ہیں؟ ضرورت احتیاج اور آگاہی سے جنم لیتی ہے۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی کا احساس ہمیں تاؤ دلا کر احتجاج پر اکساتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ میں پھر بھی احتجاج نہ کروں کیونکہ مجھے اس کی پروا نہیں، یا مجھے پتہ ہے کہ اختلاف کرنے کا فائدہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ مجھے اختلاف کی ضرورت کا بھی احساس ہو، اور میرے اندر اس کی صلاحیت

ہی ہو، لیکن خوف یا ردعمل کے ڈر کی وجہ سے میں زبان بند رکھوں گا۔

مجرد بیانیے سے آگے بڑھ کر سنگلاخ حقائق کی دنیا میں قدم رکھنا آسان نہیں۔ یہ جسارت کون کرے گا؟ درسی کتب کی اصل خالق، محکمہ تعلیم کی افسر شاہی سے اس کی توقع عبث ہے۔ مورخین اور سماجی علوم کے ماہرین بھی نہیں، کیونکہ انھوں نے ہی تو یہ کتابیں ''تخلیق'' کی ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھانے والا ٹیچر بھی نہیں، اور اس کی وجوہ پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔

چنانچہ والدین ہی پیچھے رہ جاتے ہیں جن کے بچوں کے ذہنوں کو منظم اور بے رحم طریقے سے ہمیشہ کے لیے مسخ کیا جا رہا ہے۔ لیکن والدین کون ہیں؟ وہ سرکاری ملازمین، فوجی افسران، کاروباری حضرات، تاجر، ڈاکٹر، اساتذہ، انجینئر اور دیگر پیشہ ور افراد ہیں۔ سب اسی تعلیم نظام سے، انھی درسی کتب کو رٹا لگا کر امتحان پاس کر کے آئے ہیں۔ اُنھیں شکایت نہیں کیونکہ وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یا وہ عام دکاندار، فیکٹری مزدور، ڈرائیور، کسان یا محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ اُنھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے سکولوں میں بھیجتے ہیں تاکہ وہ والدین کی نسبت بہتر زندگی بسر کریں۔ یہ لوگ آرزومند، پرجوش، مخلص اور کسی قدر متفکر ہیں۔ لیکن وہ کچھ نہیں جانتے کہ اُن کے بچوں کو کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ وہ احتجاج نہیں کرتے کیونکہ اُن کے پاس اس کی صلاحیت ہی نہیں۔ جہاں تک سماجی علوم کے ماہرین کے اساطیری بیانیے ''عام آدمی، عوام الناس'' کا تعلق ہے تو تجرید کی یہ موشگافی حقائق کی دنیا میں کسی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ کا غذائی پیراہن کی اور بات ہے، حقیقی زندگی میں یہ طبقہ اپنا وجود نہیں رکھتا۔ اگر رکھتا بھی ہے تو اس کے ذہن کو ریڈیو، ٹیلی وژن اور اردو اخبارات نے اتنا متاثر کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھائے جانے مواد کو درست سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی احتجاج نہیں کرتا، اور اسے اس کی پروا بھی نہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ بچے کو تعلیم دینے کا کھیل انتہائی لاپرواہی سے کھیلا جا رہا ہے۔ چونکہ کھلاڑی، امپائر، تماشائی اور شائقین کو اس میں بہتری لانے میں کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ اُنھیں پتہ ہی نہیں کہ اس میں خرابی کیا ہے، اس لیے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر کسی کو علم ہے تو زبان کھولنے کا حوصلہ نہیں۔ تباہی کی طرف گامزن لیکن صدائے احتجاج سے محروم قوم کی اور بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے۔

خطرناک نتائج

بالغ افراد کی لاتعلقی مایوس کن تو ہے ہی، ان کتب کا طلبا کے ذہن، اور وقت گزرنے کے ساتھ شہریوں کے کردار پر اثر بہت تکلیف دہ ہے۔ ممکن ہے کہ بے خبر افراد کو اس میں مبالغہ آرائی دکھائی دے، لیکن بطور ایک استاد اور مورخ مجھے یقین ہے کہ ماضی اور حال میں جن مسائل کا سامنا رہا ہے، اُن کی جڑیں انہی درسی کتب میں پیوست ہیں۔ جمہوریت کی ناکامی، فوجی آمریت کے طویل ادوار، بدعنوانی، اخلاقی گراوٹ، سماجی اور اخلاقی اقدار کا زوال، غیر ذمہ داری، دہشت گردی، فرقہ واریت، نااہلی، قنوطیت اور مستقبل کے تقاضے بھانپنے میں ناکامی جیسی تمام خرابیاں اسی زہریلے بیج کا پھل ہے جو نوجوان ذہنوں میں ان کتابوں کے ذریعے کاشت کیا گیا تھا۔ یہاں میں مختصر الفاظ میں طلبہ کے ذہن پر پڑنے والے خطرناک اثرات کا جائزہ لینا چاہوں گا۔ درسی کتب طلبا کو جہالت، تعصب اور غلط استدلال سکھاتی ہیں۔ جہالت اور تعصب باہم پروان چڑھتے ہوئے ایک دوسرے کی نمو کرتے ہیں۔ درسی کتب کے ذریعے مسلط کردہ جامد اقدار طلبا کی شخصیت میں راسخ ہوتی جاتی ہیں۔ مخصوص تعصبات، جھوٹ اور مسخ شدہ تصورات جچے تلے الفاظ میں طلبا کے ذہن میں اتارے جاتے ہیں۔ مصنفین کا اندازِ تحریر ایک کلہاڑے کی طرح سوچ میں شگاف پیدا کر کے یک طرفہ نظریات بھرتا جاتا ہے۔ ان کتابوں میں طلبا کے سامنے ہمیشہ شاندار ماضی، طمانیت بخش حال اور سنہرے مستقبل کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ حقائق پر قومی مفاد کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔

جہاں تک دلیل کے ساتھ بات کرنے یا حقائق کا سامنا کرنے کا تعلق ہے تو ان کتابوں کے مصنفین تحقیق اور عرق ریزی تو ایک طرف، پہلے سے معلوم چیزیں کو پرکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔ دراصل اُن کے پاس وقت ہی نہیں ہے کیونکہ وہ معقولیت پر حملہ آور ہونے، اور اس کا خون کرنے میں مصروف ہی اس قدر ہیں۔ اُن کا اندازِ بیان سوال کی زحمت سے محفوظ ہے۔ یہ پڑھنے والے کو بھی سوچنے اور سوال کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ کیا اُنھوں نے کبھی اپنی ذہانت کی جانچ کی ہے؟

ایسے مصنفین طلبا کے ذہن پر ہمیشہ رہنے والا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا مواد پڑھ کر پروان چڑھنے والی نسل زندگی بھر کے لیے جانچ اور پرکھ کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ مصنف کا ابہام طلبا میں منتقل ہو جاتا ہے، اور یہ سلسلہ چلتا اور آگے بڑھتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر درسی کتب ''قومی

نظریے'' کو تقویت دینے کے لیے سرکاری ہدایات کی روشنی میں یہ بات دہراتی رہتی ہیں کہ'' پاکستان اسلام کا قلعہ'' ہے۔ سکول جانے والا طالب علم اپنے استاد کے پڑھائے گئے اس جملے کو امتحان پاس کرنے کے لیے یاد کر لیتا ہے۔ لیکن وہ اُسی استاد، اپنے والدین اور دیگر رشتے داروں سے ہر روز سنتا ہے کہ معاشرے میں بدعنوانی، چور بازاری، منافقانہ رویہ، پولیس گردی، لاقانونیت اور ریاستی جبر شہریوں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے ہے۔ اب وہ ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے پر منطبق نہیں کر سکتا۔ کتاب میں پڑھی ہوئی بات اور زندگی میں سنی ہوئی بات ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس کے نتیجے میں وہ ناقابل بیان ابہام اور ژولیدہ فکری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں اُس کے سامنے راستے ہوتے ہیں: وہ سوچنا چھوڑ کر تصورات کی دنیا میں رہنا شروع کر دے؛ مذہب اور معاشرے کی خرابیوں کو زندگی کے دریا کے دو کنارے سمجھ لے؛ منقسم شخصیت اپنا لے۔ اس طرح تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکول جانے والا صحت مند اور نوخیز ذہن کا مالک بچہ منقسم ذہنیت اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہو کر معاشرے کے پاس جائے گا۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالب علم درسی کتاب کو حتمی علم سمجھ کر تاریخی مغالطوں کو من وعن تسلیم کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرنا ہے تو وہ سب سے پہلے سوال کیے بغیر تسلیم کرنے کی عادت سیکھتا ہے۔ بعد میں وہ خود بھی تاریخی مغالطے اختراع کرتا اور دوسروں کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ گویا جو کچھ اُس نے سیکھا تھا، وہ اس کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ بن کر بہت سے دیگر افراد کو متاثر کرتا ہے۔ اس طرح درسی کتب کے جاہل مصنفین معصوم طلبا کو جنونی افراد میں ڈھال رہے ہیں۔

تیسرا یہ کہ طالب علم کو شہادت اور سچائی کے درمیان تعلق قائم کرنا نہیں سکھایا جاتا۔ اُس کے نزدیک سچ وہی ہے جو کتاب میں لکھا اور استاد نے پڑھایا ہے۔ اس کے لیے کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔ بیانیے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاتا؛ کوئی دلیل نہیں دی جاتی۔ مصنف ثبوت اور دلیل کو ابہام میں رکھنے، صرف نظر کرنے، اغماض برتنے اور آخر کار اس کی ضرورت سے بے نیاز ہو کر سچ مسلط کرنے کا خطرناک کھیل کھیلتا ہے۔ بے بنیاد تصور من گھڑت مثالوں سے اُس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے اتار دیا جاتا ہے۔ یہ طالب علم جوان ہو کر مفروضوں کی دنیا میں رہتا ہے، لیکن اُن کے درست یا غلط

ہونے کی تحقیق کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اُن میں سے جو (بدقسمتی سے) مورخین بن جاتے ہیں، وہ اُنہی درسی کتب سے حاصل کیے گئے فیض کو آگے تقسیم کرتے ہیں، اور اس میں اپنے ابہام کو علم کا نام دے کر شامل کرتے جاتے ہیں۔

چوتھا یہ کہ طالب علم کو اپنی زندگی میں اس وقت انتہائی کرب ناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ اُسے سکول اور کالج میں پڑھایا گیا تھا، وہ درست نہ تھا۔ ذرا تصور کریں اگر ہمارے کسی بہترین کالج کا گریجویٹ یورپ کی یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے میں داخلہ لے تو اُس کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ سنا گیا ہر لیکچر اور پڑھی گئی ہر کتاب اُسے غصے، اشتعال اور مایوسی کا شکار کردے گی۔ بہت سی سفاک حقیقتیں اُسے پر منکشف ہوں گی۔ پاکستان میں اُس کے تعلیمی ارتقا کی بنیاد جن حقائق، تشریحات اور نظریات پر رکھی گئی تھی، وہ محض سراب، التباس، اساطیر، فریب اور دیومالائی داستانیں ثابت ہوں گی۔

اس پر اُس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ اس کے کئی امکانات ہیں۔ وہ اپنے سابق اساتذہ کو کوستے ہوئے اپنے ملک میں سیکھی گئی تمام چیزوں کو مسترد کر کے اس نئے علم کو قبول کرلے گا۔ یا وہ پاکستانی اساتذہ کو دروغ گو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے شکوک وشبہات کا شکار ہوجائے گا۔ لیکن اس دوران اُس کے لیے حقائق اور ثبوت کے ساتھ پیش کیے گئے نئے علم کو مسترد کرنا بھی ناممکن ہوگا۔ یا اُسے احساس ہوگا کہ برین واشنگ کے طویل برسوں نے اُس کی تجزیاتی صلاحیتوں کو گھن کی طرح چاٹ لیا ہے، اُس کی ذہنی استعداد تباہ کردی ہے اور وہ آزاد سوچ کے ساتھ تنقیدی جائزہ لینے کے قابل نہیں رہا۔ وہ اسی بےیقینی کیفیت میں ایک سکالر بن جائے گا کیونکہ وہ دیارِ غیر سے ڈگری لیے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا۔ لیکن وہ ذہنی اذیت کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اس فکری الجھن میں اُس کا جو بھی ردِعمل ہو، اُس کا ذہن پریشان اور اُس کی سوچنے کی صلاحیت بے ربط رہتی ہے۔ تذبذب کی یہ کیفیت اُس کا زندگی بھر کا خاصا بن جاتی ہے۔۔۔ وہ نہ یقین کرتا ہے، نہ رد کرتا ہے؛ نہ اُسے سمجھ آتی ہے کہ صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے۔ وہ اعتماد، عزم، استدلال، ذہنی سکون سے محروم، زندگی کے یقینی معروضات کے بارے میں بھی گومگو کے عالم میں رہتا ہے۔ نہ اُس کی اپنی رائے ہوتی ہے؛ نہ وہ کسی کی مدلل رائے قبول کرتا ہے۔ درسی کتب نے اُسے ایک صحت مند توانا

دماغ والا انسان بنانے کی بجائے منتشر خیالی، فکری الجھن، مسخ شدہ ذہنیت اور اوہام کا شکار انسان بنا دیا ہے۔ اس کی ذہنی اور فکری تباہی مکمل ہو چکی ہوتی ہے؛ اب اس کا علاج یا ممکن نہیں۔ وہ ایک طوطے کی طرح ''میں نہیں جانتا'' کی زندگی بسر کرتا ہے۔

آخر میں، درسی کتب تعلیم دے نہیں رہیں، مسلط کر رہی ہیں۔ طلبا کے ذہن میں نظریات ٹھونسنے، ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنے اور اُن کی برین واشنگ کرنے کی بجائے اُن کے ذہن میں تجسس پیدا کیا جائے؛ انہیں ملک کے سیاسی جسم پر لگنے والے گھاؤ دکھائے جائیں اور بتایا کہ ان کا ذمہ دار کون ہے؛ اور طلبا کو آگاہی دی جائے، نہ کہ دیومالائی ترانوں سے بہلایا جائے تو اُن کا بھلا ہوگا۔ لیکن درسی کتابیں ایسی قوم تیار کر رہی ہیں جو بلا سوچے سمجھے حکم ماننے کی عادی ہو۔ یہ طرزِ تعلیم طلبا کو سوچ سمجھ رکھنے والے باشعور شہریوں کی بجائے محض انسانی مجسموں یا خودکار طریقے سے، تخیلات کے بغیر کام کرنے والے ربورٹس میں ڈھال رہی ہے۔ مستقبل میں ان کی تیار کردہ ایک ایسی نسل سامنے آ رہی ہے جسے دنیا کی پروا ہے، اور نہ دنیا کو اس کی پروا ہے۔

سفر کا اختتام

مجھے یقین ہے کہ میں نے تاریخ، مطالعہ پاکستان اور عمرانیات کا جائزہ لینے والے اس افسوس ناک سفر کے دوران جن خرابیوں کا پتہ چلایا وہ صرف انہی مضامین تک محدود نہیں۔ اگر کچھ ماہر سکالرز اسلامیات، پولیٹیکل سائنس اور انگریزی کی کتب کا منظم طریقے سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان مضامین میں بھی مصنفین نے ابہام کے ایسے ہی گڑھے کھود رکھے ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلے گا کہ کمرۂ جماعت میں کس قسم کے اسلام کی تبلیغ ہو رہی ہے؛ پولیٹیکل سائنس کے کون سے نظریات، تصورات اور اقدار پڑھائی جا رہی ہیں؛ اور ہمارے بچوں کو کس قسم کی انگریزی سکھائی جا رہی ہے۔ سائنسی کتب کا جائزہ بھی ایسے ہی لرزہ خیز حقائق منکشف کرے گا۔ کیا امید کی جا سکتی ہے کہ میری تحقیق کا دائرہ دیگر مضامین تک بھی پھیلے گا؟

میری تجویز قوم کے وسیع حصے کے ساتھ روا رکھے گئے فریب کا احاطہ کرتی ہے۔ آیئے اس کے حجم کا اندازہ کرتے ہیں۔ غیر حتمی اندازے کے مطابق پہلی جماعت سے لے کر چودویں تک کے

پچیس ملین طلبا تعلیمی اداروں میں داخل ہیں۔ان میں مندرجہ ذیل گروہوں کو بھی شامل کر لیں:

1۔ پرائیویٹ طلبا جو کسی سکول یا کالج میں داخلہ نہیں لیتے ،لیکن انہی کتابوں کو پڑھ کر امتحان دیتے ہیں۔ان کی تعداد دو سے تین لاکھ کے قریب ہوگی۔

2۔ قانون ، طب، سائنس، زراعت، انجینئرنگ اور فائن آرٹس کے طلبا جنہیں مطالعہ پاکستان پڑھنا پڑتا ہے،کی تعداد فرض کریں ایک لاکھ کے قریب ہے۔

3۔ پبلک سروس کمیشن کے وفاقی اور صوبائی سطح پر مقابلے کے امتحانات دینے والے طلبا۔ ان امتحانات میں سرکاری ملازمین کی بھرتی ہوتی ہے۔ابھی حال ہی میں بنکوں نے بھی مقابلے کے امتحانات کے ذریعے اپنے افسران کی بھرتی شروع کی ہے۔یہ امیدواران درسی کتب کو دوبارہ پڑھتے ہیں، یا شاید پہلی مرتبہ۔تاہم تمام امیدواروں کو مطالعہ پاکستان لازمی مضمون کے طور پر پڑھنا پڑتا ہے ۔ان کی تعداد بھی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

4۔ بیرونی ممالک میں پاکستانی سکولوں میں زیرتعلیم طلبا: ان کی تعداد نا معلوم ہے۔

5۔ ممکن ہے کہ کچھ گروہوں کو میں شامل کرنا بھول گیا ہوں۔

یہ تمام تعداد مجموعی طور پر پچیس ملین سے کہیں زیادہ بن جاتی ہے۔ یہ سوچ کر عقل ماؤف ہوجاتی ہے کہ ہفتے کے ہر ورکنگ ڈے میں اتنی بڑی تعداد میں نوخیز ذہنوں پر غلط تاریخ،مسخ شدہ حقائق اور تاریخی مغالطوں کی بمباری اور سرکاری پراپیگنڈے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

حملے کا یہ سلسلہ یہیں تک موقوف نہیں۔کم وبیش ایک لاکھ اساتذہ، پروفیسرز اور ٹیوٹرز ہر شام ان کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں تاکہ اگلی صبح کا لیکچر تیار کرسکیں۔ وہ انہیں اپنے طلبا سے زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے پڑھانا ہوتا ہے۔روزانہ کی یہ سرگرمی برین واشنگ کا ایک خوفناک ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔لیکن اس کا دائرہ صرف یہیں تک ہی محدود نہیں۔اس کا وار کچھ غیر متوقع مقامات تک بھی ہوتا ہے۔فرض کریں زوالوجی یا فزکس پڑھانے والے دیگر اساتذہ کو تاریخ یا موجودہ سیاست کے بارے میں جاننا ہوتو وہ اپنے ماہر مضامین ساتھیوں سے بات کریں گے۔گویا سٹاف روم میں کم وبیش پانچ لاکھ کے قریب مردوخواتین ان مسخ شدہ حقائق کا شکار ہوسکتے ہیں۔

فرض کریں ہر گھر سے تین طلبا آتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ کم وبیش آٹھ ملین گھروں میں

یہ کتابیں استعمال ہوتی ہیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ خود پڑھاتے ہیں، جبکہ کچھ محض یہ دیکھنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اُن کے بچوں کو کیا پڑھایا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ دیہات اور چھوٹے قصبوں یا شہروں میں رہنے والے ناخواندہ افراد بھی شام کے کھانے پر اپنے بچوں سے ان کتابوں کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ وہ آج کل کیا پڑھ رہے ہیں۔ آٹھ ملین گھروں میں اتنے ہی والدین، اور پھر دیگر اہلِ خانہ، جیسا کہ دادا، دادی، چچا، چچی، بڑے بھائی اور بہنوں کے کانوں میں بھی یہ باتیں پڑتی ہیں۔ اس طرح یہ کتابوں میں تحریر شدہ حماقت کم وبیش سولہ ملین افراد تک پہنچ جاتی ہے۔

پہنچنے والے نقصان کے اثرات کہیں گہرے ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر کچھ افراد صحافی، کالم نگار اور مدیر بن جاتے ہیں۔ ہر مصنف اپنے مطالعے کے مطابق ہی لکھتا ہے۔ کم وبیش پانچ لاکھ افراد ان اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح قلم کی طاقت سے جہالت کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ میرے بیان کردہ اعداد وشمار میں اعادہ ہو۔ والدین ڈائجسٹ بھی پڑھتے ہیں، اور ٹیچر بھی والدین ہوتے ہیں۔ بہرحال ان کتابوں سے متاثر ہونے والے افراد کی تعداد تیس ملین سے کم نہیں ہوگی۔ یہ لوگ نادانستگی میں وہ کچھ پڑھتے، سنتے جانتے ہیں جن سے اُنہیں آگاہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ ان افراد میں ملک کی اشرافیہ اور ممکنہ طور پر ملک کے حکمران بھی شامل ہیں تو ذہن میں مایوسی اور پریشانی کے سائے گہرے ہونے لگتے ہیں۔ ہم یقینی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

لیکن کیا کوئی سن رہا ہے؟

ضمیمہ: عوامی ردِ عمل

فرنٹیر پوسٹ میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط

مسز ایلس فیض: سات مئی 1992ء

میں نے بہت دلچسپی سے مسٹر خورشید کمال عزیز کے درسی کتب کے جائزے کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہاں اپنا ذاتی واقعہ بھی بیان کرنا چاہوں گی۔ چند سال پہلے فیض نے اپنے دوسرے نواسے کی درسی کتب کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ 1984ء کے اوائل کی بات ہے۔

نواسہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُنھوں نے روزانہ ملنے اور کتابوں کا پریشان کن اور اذیت ناک جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دوران برآمدے سے قہقہوں آوازیں بلند ہوتی رہتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میرا نواسہ باورچی خانے میں آیا اور کہا،

''لگتا ہے کہ میں ایک منافق بنوں گا''۔

''کیوں؟''

''نانا ابو کہتے ہیں کہ اگر تم امتحان میں کامیابی چاہتے ہو تو وہی کچھ لکھنا جو یہ کتاب کہتی ہے؛ تمہارے پاس اور کوئی چوائس نہیں۔ لیکن میں نے تمھیں متبادل حقیقت بھی بتا دی ہے۔۔۔ اسے ذہن میں رکھنا۔''

مجھے یاد ہے کہ نواسے نے ایک آہ بھری اور کہا، ''لیکن اُن کا کیا بنے گا جن کے پاس کوئی متبادل نہیں۔''

مسٹر عزیز کے مضامین پڑھتے ہوئے یہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہوگیا۔ اُن کا کیا بنے گا جو بلاسوچے سمجھے منافقانہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور پھر اُن کے بارے میں کیا خیال ہے جو اُنہیں ایسا بناتے ہیں؟

پروفیسر ایم آئی حق: گیارہ مئی 1992ء

سرکاری طور پر شائع اور تجویز کردہ درسی کتب، خاص طور پر لازمی مضمون، مطالعہ پاکستان اور تاریخ میں پائی جانے والی غلطیوں، غلط بیانیوں، منافقانہ مواد، غلط معلومات اور گھٹیا پراپیگنڈے کی نشاندہی کے لیے مسٹر خورشید کمال عزیز کے نہایت جانفشانی سے لکھے گئے چشم کشا مضامین (سترہ اپریل سے دو مئی تک) شائع کرنے پر تمام قوم آپ کے موقر جریدے کی بے حد مشکور ہے۔

شکر ہے کہ کسی نے سچ بولنے کی جرات کی اور والدین اور حکمران اشرافیہ کو خبردار کیا کہ مارشل لا حکومتوں کے مفاد، اُن کی وقتی پالیسیوں کی حمایت اور فروغ کے لیے بے ضمیر لکھاریوں کی تحریر کردہ کتابوں کے ذریعے نوجوان نسل کے ذہن میں تاریخی مغالطے، نیم پختہ سچائیاں، کھوکھلے نعرے اور من گھڑت بیانات راسخ کرنے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

مسٹر عزیز کے نکالے گئے نتیجے کے مطابق ان غیر معیاری درسی کتب کا مجموعی اثر دل دہلا دینے والا اور لرزہ خیز ہے۔ ملک کے تمام سکولوں اور کالجوں میں لازمی مضامین کے طور پر پڑھائی جانے والی یہ کتابیں خارجی دلائل کی بجائے داخلی جذبات کی تکرار سے بھرپور ہیں۔ یہ کتابیں قوم کو انتہا پسند، بنیاد پرست، منافق، موقعہ پرست، سازشی اور پڑھے لکھے جاہل افراد کی نسل کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتیں۔ کیا قوم مارشل لا دور کی تلون مزاجی، مصلحت پسندی اور تعصبات کے رنگ میں رنگی تعلیم مستقل بنیادوں پر جاری رکھ سکتی ہے؟

ہمارے اراکین پارلیمنٹ کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہے۔ اساتذہ مادیت پرستی کی دوڑ میں لگے ہیں۔ والدین کو کچھ پتہ نہیں کہ اُن کے بچوں کو کیا پڑھایا جارہا ہے۔ چنانچہ والدین کو جھنجھوڑ کر جگانے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی آگے آئے اور ان مضامین کو اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں پمفلٹ کی صورت شائع کرکے قومی سطح پر تقسیم کرے۔ اس کے بعد مسٹر عزیز کی سربراہی میں ایک قومی کمیٹی تشکیل دے کر اس معاملے کی فوری تحقیقات کرائی جائیں تاکہ اصلاحات کا عمل شروع کیا جاسکے۔

مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی بات دہرانے کی اجازت دیجیے کہ ان کتابوں کے خلاف گزشتہ ربع صدی سے لاوا پک رہا ہے، لیکن مسٹر عزیز کی طرح کسی نے کاری اور گہری ضرب نہیں لگائی۔ اُنھوں نے نشاندہی کا حق ادا کر دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مسٹر عزیز اُن بے شمار غلطیوں، غلط بیانیوں اور مغالطوں کو درست کر دیں جو اُنھوں نے بہت محنت سے مرتب کی ہیں کیونکہ درسی کتب کے مصنفین انہیں درست کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، اور مارشل لا کا بوجھ ہمارے ٹیکسٹ بک بورڈز اٹھاتے رہیں گے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کب تک۔ سائنس کا استاد ہونے کے ناتے میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سائنس کی کتابوں کو جدید بنانے کے نام پر کس قسم کی اندھی نقالی روا رکھی جاتی ہے۔ ہماری ایف ایس سی اور بی ایس سی تک کی زیادہ تر سائنس کی درسی کتب امریکہ اور برطانوی کتابوں کی کھلی نقل ہیں۔ گزشتہ بائیس سال اُن میں جو غلطیاں تھیں، وہ آج بھی موجود ہیں۔ شاید میں بھی کسی روز مسٹر عزیز کی دکھائی گئی راہ پر چلنے کی ہمت کروں، اور ریکارڈ کی درستی کے لیے درسی کتب کی غلطیوں کی نشاندہی کر سکوں۔

راہ نورد: ستائیس مئی 1992ء

میں نے قابل احترام ٹیچر اور مورخ، ڈاکٹر خورشید کمال عزیز کے نہایت محنت اور جانفشانی سے تحریر کردہ مضامین (جو سترہ اپریل سے چار مئی کے درمیان شائع ہوئے) کو پڑھا ہے۔ فاضل مورخ کی نشاندہی پر مجھے گزشتہ بارہ برسوں کے دوران شائع ہونے والی سکولوں اور کالجوں کی درسی کتب میں موجود غلطیوں اور ان کے سنگین نتائج کا احساس ہوا۔ اُنھوں نے نہایت مدلل انداز میں بتایا ہے کہ ان کتب کی وجہ سے قوم کس کوتاہ بینی اور تنگ نظری کا شکار ہو رہی ہے۔

تاہم میں ایک مقام پر ابہام پاتا ہوں، جو کہ 1857ء کی بغاوت تھی۔ یقیناً ڈاکٹر عزیز درست کہتے ہیں، لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں آرٹیکل دو سے آرٹیکل دس تک 1857ء کے واقعات کے بیان کو اس طرح سمجھا ہوں کہ 1857ء کے واقعات کو جنگِ آزادی قرار دینا غلطی ہے۔ آرٹیکل دس میں فاضل مورخ کہتے ہیں کہ 1857ء کی بغاوت کو جنگِ آزادی قرار دینا لاعلمی، تعصب اور ژولیدہ فکری کا اظہار ہے۔

اقوام کی تاریخ نویسی میں ''قوم کی شکست اور پسپائی'' ایک تکلیف دہ مشقت ہوتی ہے۔ قومی توہین کا احساس قومی نفسیات کو مسخ کر دیتا ہے۔ 1857ء کے واقعات پہلی جنگِ آزادی نہیں تھے ؛لیکن عالمی تاریخ کے تناظر میں وہ جنگ غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت ضرور تھی۔ یہ ہندوستانی عوام کی طرف سے تسلط کے خلاف بلند کیا گیا حرفِ انکار تھا۔ اس مزاحمت کا آغاز جنگِ پلاسی سے ہوا، اور پھر اس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے بھی شجاعت کی داستان رقم کی۔ 1947ء میں یہ مزاحمت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ مزاحمت کی یہ روایت آج بھی جاری ہے۔

ہندوستان میں برطانوی تسلط قومی حکومت نہیں، استعماری دور تھا۔ اس کے خلاف کسی بھی بغاوت کو ''جنگِ آزادی'' کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ تیمور کے وارث (جنہیں برطانوی مورخین نے غلطی سے مغل قرار دیا) انگریزوں کی طرح نہیں تھے۔ روزِ اوّل سے ہی انگریز کے ارادے ظاہر ہونے لگے تھے کہ وہ ہندوستان میں مستقل قیام کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ؛ جبکہ مغل مقامی ہندو آبادی میں گھل مل گئے اور اسے ایرانی رنگ میں رنگ لیا۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہندوستان میں جاگیرداری نظام تھا۔ یہاں مغربی طرز کی سیاسی جماعتوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس لیے بغاوت کی کامیابی مغل دربارِ دہلی کی بحالی کا باعث بن سکتی تھی۔ اُس وقت تک مسلمانوں یا ہندوؤں کو بیسویں صدی کی آزادی کی تحریکوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

یہاں میں مسٹر عزیز کی کتاب ''انگریز اور مسلم انڈیا'' میں سے ایک جملہ نقل کرنا چاہوں گا:

''اُنھوں (ہندوستانیوں) نے ''جنگِ آزادی'' کی شکست سے بوجھل مایوسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو استعمار میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ اس سوچ نے اُن کی مایوسی کی تہہ کو مزید دبیز کر دیا کہ انگریز یہاں ٹھہرنے کے لیے آئے ہیں'' (صفحہ 24)۔

شاید یہاں فاضل مصنف مقبول عام پیرائے میں واقعات بیان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اگر انگریز ہندوستان پر قبضہ نہ کرتے تو معاشرے کا ارتقا بالکل مختلف خطوط پر ہوتا۔ اُن واقعات کو ''بغاوت'' اور ''جنگِ آزادی'' قرار دیتے ہوئے ہماری تاریخ کی کتابیں ایک تضاد کی عکاسی کرتی ہیں۔ چنانچہ تاریخ کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے میں اس موضوع پر ڈاکٹر عزیز سے مزید رہنمائی کا متمنی ہوں۔

ایم اقبال ملک: اکیس جون 1992

مورخ خورشید کمال عزیز کے تصورات کی اشاعت (فرنٹیئر پوسٹ، اپریل سترہ سے انیس، اور بارہ اور چودہ جون) پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مسٹر عزیز کا دلیرانہ اظہارِ رائے قابلِ تعریف ہے۔

انھوں نے 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد کے بارے میں کچھ حقائق سے البتہ اغماض برتا۔ اگر انھیں شامل کرلیا جاتا تو قارئین مذکورہ خطبہ بآسانی سمجھ لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ 1930ء کا مسلم لیگ کا اجلاس بلانے کی غرض و غایت یکم جنوری 1929ء کو منظور ہونے والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں منظور ہونے والی قرارداد کی حمایت تھی۔

اپنے تاریخی خطاب میں علامہ اقبال نے کہا تھا: ''مجھے کوئی شک نہیں کہ یہ اجلاس اس قرارداد میں مسلمانوں کے مطالبے کی پرزور حمایت کرے گا۔ ذاتی طور پر میں اس میں شامل مطالبات سے ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ میں پنجاب، این ڈبلیو ایف پی، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کی صورت اکٹھا ہوتے دیکھ رہا ہوں... یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے رکھی گئی تو اس نے اس بنیاد پر اسے مسترد کردیا تھا کہ یہ ایک غیر مربوط ریاست ہوگی۔ جہاں تک اس خطے کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے... انبالہ اور غیر مسلم آبادی کی اکثریت رکھنے والے کچھ اضلاع کو اس سے خارج کرنے سے یہ ایک کم پھیلاؤ، اور زیادہ مسلمان آبادی والی ریاست بن جائے گی۔''

علامہ اقبال نے اپنی طرف سے صرف پنجاب کی تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ علامہ صاحب تجویز کو نہرو کمیٹی کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اس تجویز کو مولانا شوکت علی نے نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کیا (زندہ رود، صفحات 386-323)

جہاں تک نہرو کمیٹی کی طرف سے اس تجویز کو مسترد کیے جانے کا تعلق ہے تو رپورٹ کہتی ہے ... (یہاں اقبال پر ایک طویل بحث ہے جو دری کتب کے لیے موزوں نہیں۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہیں)۔

اقبال کا مذکورہ خط، جس کا بارہا حوالہ دیا گیا، سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کے لیے ان کی نگاہِ انتخاب قائدِ اعظم پر پڑی تھی۔ اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے: ''ایک بات اور،

علامہ اقبال تھے جنھوں نے قائداعظم پر زور دیا کہ وہ منزل کے حصول کے لیے مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ انھوں نے تمام مسلم رہنماؤں پر قائداعظم کو ترجیح دی۔''

اس کے بعد ڈائریکٹر علامہ اقبال کے اکیس جون کے خط کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں یہاں بہت ادب سے کہنا چاہوں گا کہ علامہ اقبال کو یہ خط اس لیے لکھنا پڑا کیونکہ قائداعظم اُن سے خط و کتابت میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ درحقیقت قائداعظم نے زندگی بھر علامہ کے صرف دو خطوط کا جواب دیا تھا۔

دوسری طرف درسی کتب یہ ثابت کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں کہ سیاسی طور پر قائد اعظم محض علامہ اقبال کی خواہش کی پیروی کررہے تھے۔ گویا علامہ اقبال نے ریاست کے قیام کا تمام منصوبہ بنایا، اور پھر اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلمانوں کی قیادت قائداعظم کو سونپ دی۔

قائداعظم کی زندگی پر درسی کتب میں موجود مضامین بھی علامہ اقبال کی تعریف سے بھرے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال نے خط لکھ کر قائداعظم کو انڈیا واپس آنے اور مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی تاکید کی، کیونکہ دیگر مسلم رہنما اس قابل نہ تھے۔ گویا تمام کریڈٹ علامہ اقبال کو دیا جاتا ہے، قائد نے تو محض اُن کے تصورات کو عملی جامہ پہنایا تھا۔

کسی سرکاری ایجنسی، حتیٰ کہ وفاقی محتسب نے بھی اس توہین آمیز مواد (قواعد انشا، اردو، جماعت پنجم) کا نوٹس نہیں لیا ہے۔ چوہدری عبدالمتین کے نام قائداعظم کے خطوط کو بوجوہ نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ اقبال اکیڈمی قائداعظم کا مرتبہ گھٹانے، اور علامہ اقبال کو انتہائی صاحبِ بصیرت سیاست دان ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی۔

گیارہ ستمبر اور پچیس دسمبر کو شائع ہونے والے مضامین میں بھی قائداعظم کو نہیں بخشا جاتا۔ ان میں سے ایک مضمون قائداعظم کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر پڑھ کر سنایا گیا۔

توہین آمیز مواد کو کون حذف کرے گا؛ یہ بات باور کرائے گا کہ تحریکِ پاکستان کسی بھی شخصیت سے زیادہ مقدس تھی۔ آیئے پاکستان کا تحفظ کرنے کے لیے قائداعظم کا تحفظ کریں۔

پاکستانی تاریخ کا قتل

پاکستان میں پڑھائی جانے والی درسی کتب کا تنقیدی جائزہ

پاکستانی سکولوں اور کالجوں میں قومی اساطیر کو تاریخ کا نام دے کر پڑھایا جارہا ہے۔ مطالعہ پاکستان (لازمی) اور عمرانیات جیسے مضامین یک طرفہ سیاسی بیانیہ ذہن نشیں کرانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہمارے بچے تاریخ نہیں پڑھتے۔ اُنہیں نصاب کے نام پر دروغ گوئی کا پلندہ پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ یہ پالیسی پاکستان کے سماجی ڈھانچے کو کس طرح نقصان پہنچارہی ہے؟ اس پر کبھی کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا؟

اس کتاب میں ایک ممتاز پاکستانی مورخ اور ماہر سیاسیات سکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جانے والے ان مضامین کی 66 کتابوں کا عمیق جائزہ لیتے ہوئے پہلی مرتبہ ان سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ وہ (1) حقائق اور تشریح کی غلطیوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں؛ (2) شامل نہ کیے گئے ضروری حقائق کو سامنے لاتے ہیں؛ (3) غلطیوں کی تصحیح کرتے ہیں؛ (4) پڑھائے جانے والے مسخ شدہ حقائق اور اُن کے تسلسل کی نشاندہی کرتے ہیں؛ (5) طلبا پر اُن کے خطرناک اثرات کا جائزہ لیتے ہیں؛ اور (6) قوم پر ان کے مجموعی اثرات کی جانچ کرتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ کام دستاویزی ثبوت، انتہائی احتیاط، گہرے تدبر، عمیق فکر اور انتہائی دلیری سے کیا ہے۔

یہ ان کتابوں کو تیار اور تقسیم کرنے والی حکومتوں، ان کی منظوری دینے والے دانشوروں اور ماہرین تعلیم، اُنہیں تصنیف کرنے والے پروفیسرز اور انہیں قبول کرنے والے والدین پر چبھتی ہوئی، لیکن برمحل تنقید ہے۔

اس کتاب کا مواد ہر قاری کو چونکا دے گا۔ اس کا مطالعہ والدین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گا۔